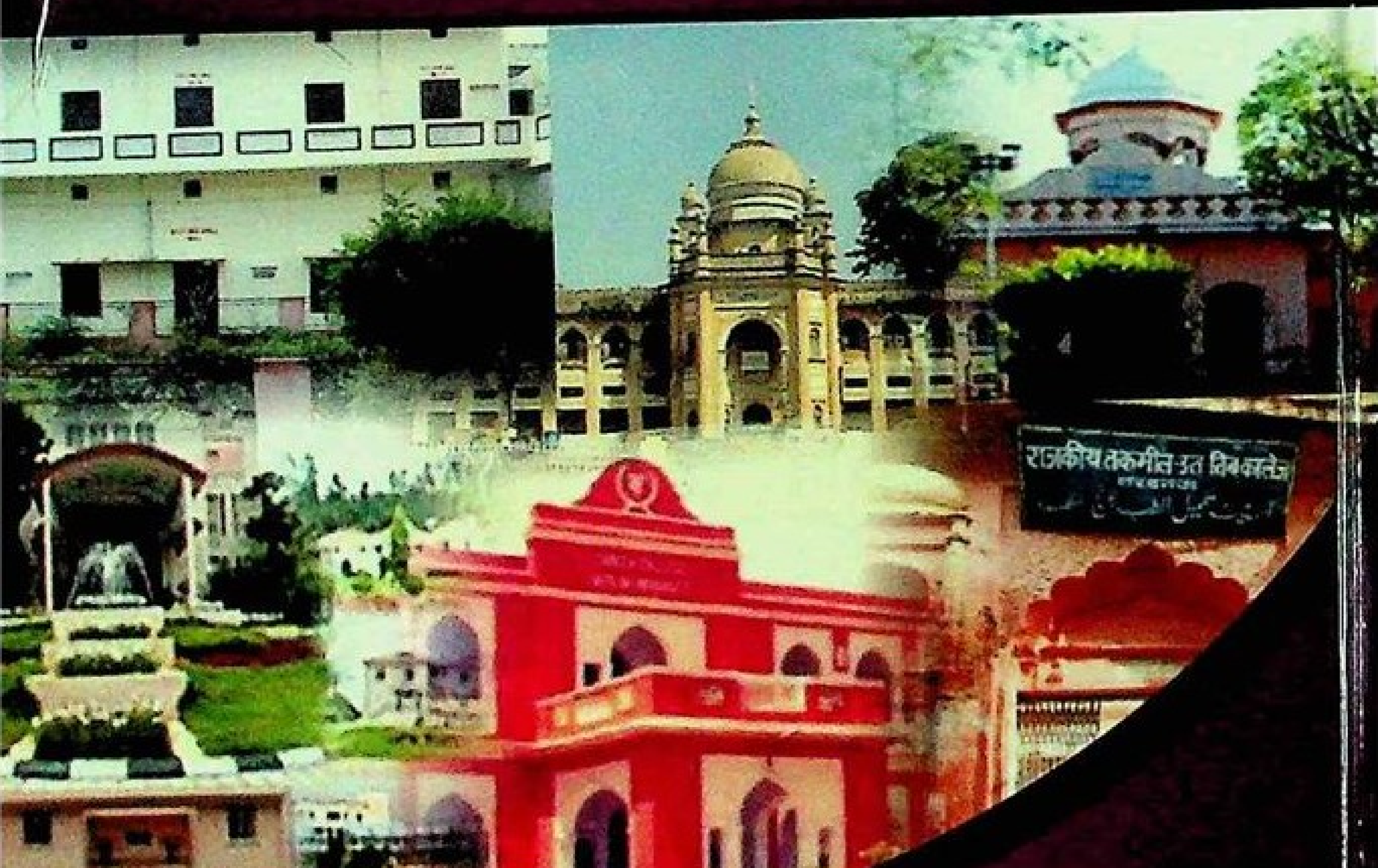
ہندوستان
کی
طبی درس گاہیں



حکیم فخر عالم

آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس

ہمدرد منزل، لال کنواں، دہلی-110006

2017

ہندوستان

کی

طبی درس گاہیں

حکیم فخر عالم

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس

ہمدرد منزل، لال کنواں، دہلی۔ 110006

ISBN:

کتاب : ہندوستان کی طبی درسگاہیں

مصنف : حکیم فخر عالم

سن اشاعت : 2016

تعداد : 600

قیمت : 350روپے

ناشر : آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس

ہمدرد منزل، لال کنواں، دہلی۔110006

طابع : مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ۔ 09897165496#

ISBN

مصنف سے رابطہ کا پتہ

Hakim Fakhre Alam

D-II Floor, Samreen Appartment
Shah Basheer Colony, Hadi Nagar
Doharra, Aligarh-202002 (U.P)
Mobile No. 09411653041 / 08744025981
Email: fakhrealamx7598@gmail.com

فہرست

نمبر شمار		صفحہ نمبر
	حرف آغاز	xi
	آندھرا پردیش	
1۔	گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج۔ حیدرآباد	1
2۔	ڈاکٹر عبدالحق یونانی میڈیکل کالج۔ کرنول	6
3۔	شبینہ طبیہ کالج۔ حیدرآباد	8
	اتر پردیش	
4۔	اسٹیٹ تکمیل الطب کالج۔ لکھنؤ	9
5۔	منبع الطب کالج۔ لکھنؤ	17
6۔	مدرسہ طبیہ وہاجیہ۔ لکھنؤ	21
7۔	اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج۔ الہ آباد	25
8۔	مدرسہ طبیہ۔ لکھنؤ	31
9۔	اجمل خاں طبیہ کالج۔ علی گڑھ	33
10۔	بھارت طبیہ کالج۔ سہارن پور	40
11۔	جامعہ طبیہ دارالعلوم۔ دیوبند	43
12۔	یونانی میڈیکل کالج۔ کانپور	48
13۔	الرشاد طبیہ کالج۔ اعظم گڑھ	50
14۔	سلفیہ طبیہ کالج۔ بنارس	52
15۔	ابن سینا طبیہ کالج، بیناپارہ۔ اعظم گڑھ	56

16۔ سہارن پور طبیہ کالج۔ سہارن پور 62

17۔ جامعہ طبیہ۔ دیوبند 64

18۔ دیوبند یونانی میڈیکل کالج، اسپتال اینڈ ریسرچ سینٹر۔ دیوبند 67

19۔ علامہ اقبال یونانی میڈیکل کالج۔ مظفرنگر 69

20۔ علی گڑھ یونانی اینڈ آیورویدک میڈیکل کالج۔ علی گڑھ 71

21۔ شمع غوثیہ مائنارٹی یونانی میڈیکل کالج۔ غازی پور 73

22۔ ارم یونانی میڈیکل کالج۔ لکھنؤ 75

23۔ ڈاکٹر عبدالعلی طبیہ کالج۔ لکھنؤ 77

24۔ حکیم رئیس یونانی میڈیکل کالج۔ سنبھل 78

بہار

25۔ مدرسہ طبیہ۔ گیا 79

26۔ درسگاہ طبیہ و شفاخانہ سنجری۔ گیا 80

27۔ مدرسہ طبیہ سوہ سرائے۔ پٹنہ 82

28۔ گورنمنٹ طبی کالج۔ پٹنہ 84

29۔ ذوالفقار حیدر یونانی میڈیکل کالج۔ سیوان 88

30۔ سلفیہ یونانی میڈیکل کالج۔ دربھنگہ 90

31۔ نظامیہ یونانی میڈیکل کالج۔ گیا 92

پنجاب

32۔ ویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج۔ امرتسر 96

33۔ بھوپندر طبیہ کالج۔ پٹیالہ 98

34۔ اجمل طبیہ کالج۔ امرتسر 105

35۔	مدرسہ طبیہ، ویسٹرن یونیورسٹی۔ کپورتھلہ	107
36۔	چھاچھی طبیہ کالج۔ ڈنگہ، گجرات	109
37۔	دارالعلوم طبیہ۔ بٹالہ	110
	تمل ناڈو	
38۔	قدوسیہ طبیہ کالج۔ مدراس	111
39۔	گورنمنٹ اسکول آف انڈین میڈیسن۔ کیلپاک، مدراس	114
40۔	گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج۔ چنئی	116
	جموں اینڈ کشمیر	
41۔	گورنمنٹ یونانی طبیہ کالج۔ سری نگر	118
42۔	یونانی میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل، انسٹی ٹیوٹ آف ایشین میڈیکل سائنسز۔ سری نگر	121
43۔	کشمیر طبیہ کالج، ہاسپٹل اینڈ ریسرچ سنٹر۔ سری نگر	123
	چھتیس گڑھ	
44۔	محسن ملت یونانی میڈیکل کالج۔ رائے پور	125
	دلّی	
45۔	مدرسہ طبیہ۔ دہلی	128
46۔	مدرسہ طبیہ زنانہ۔ دہلی	139
47۔	جامعہ طبیہ۔ دہلی	144
	راجستھان	
48۔	مدرسہ نظامیہ خلیلیہ۔ ٹونک	148
49۔	راجپوتانہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج۔ جے پور	150

50۔	زبیریہ طبیہ کالج۔ جودھپور	152
51۔	راجستھان یونانی میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل۔ جے پور	156

کرناٹک

52۔	گورنمنٹ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج۔ میسور	159
53۔	گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج۔ بنگلور	161
54۔	لقمان یونانی میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل۔ بیجاپور	165
55۔	ٹیپو سلطان یونانی میڈیکل کالج۔ گلبرگہ	167
56۔	ایچ ایم ایس یونانی میڈیکل کالج۔ تمکور	169
57۔	نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن۔ بنگلور	171

مدھیہ پردیش

58۔	مدرسہ آصفیہ طبیہ۔ بھوپال	175
59۔	سیفیہ حمیدیہ یونانی طبیہ کالج۔ برہان پور	185
60۔	الفاروق یونانی میڈیکل کالج۔ اندور	191
61۔	حکیم سید ضیاء الحسن گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج۔ بھوپال	195
62۔	حکیم عبدالحمید یونانی میڈیکل کالج۔ دیواس	200

مغربی بنگال

63۔	مدرسہ طبیہ۔ کلکتہ	202
64۔	کلکتہ یونانی میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل۔ کولکاتا	203

مہاراشٹر

65۔	اجمل طبیہ کالج۔ بمبئی	207

66۔ یونانی میڈیکل کالج وجناح ہسپتال ۔ بمبئی 210

67۔ انجمن اسلام ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا طبیہ یونانی میڈیکل کالج ۔ممبئی 212

68۔ محمدیہ طبیہ کالج ۔ مالیگاؤں 216

69۔ زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج ۔ پونہ 219

70۔ تاج طبیہ کالج ورشیدیہ ہاسپٹل ۔ ناگ پور 224

71۔ یونانی طبیہ کالج اینڈ ہاسپٹل ۔ ناندیڑ 226

72۔ احمد غریب یونانی میڈیکل کالج ۔ اکل کوا 228

73۔ اقرا یونانی میڈیکل کالج، ہاسپٹل اینڈ ریسرچ سینٹر ۔ جل گاؤں 230

74۔ یونس فضلانی یونانی میڈیکل کالج ۔ اورنگ آباد 233

غیر منقسم ہندوستان

75۔ طبیہ کلاسز لاہور/طبیہ کالج انجمن حمایت اسلام ۔ لاہور 235

76۔ طبیہ کالج حسین آگاہی ۔ ملتان 239

77۔ رائل طبیہ کالج ۔ ملتان 240

78۔ ایسٹرن اینڈ ویسٹرن میڈیکل کالج ۔ لاہور 241

79۔ دار العلوم طبیہ پنجاب ۔ لاہور 242

80۔ حبیبیہ طبیہ کالج ۔ ڈھاکہ 244

81۔ درسگاہ تعلیم الطب ۔ لاہور 247

82۔ سندھ ویدک اینڈ یونانی طبی کالج ۔ سندھ 248

83۔ یونانی طبیہ کالج ۔ سیالکوٹ 249

84۔ شعبہ طب، اسلامیہ کالج ۔ پشاور 250

85۔ ویدک اینڈ یونانی طبی کالج ۔ ٹنڈہ محمد خاں، سندھ 251

86۔ گورنمنٹ طبی کالج ۔ سلہٹ 252

حرفِ آغاز

1857 کے انقلاب کے بعد قومی اور ملّی تعمیر و ترقی کے نقطے سے کئی تحریکیں سامنے آئیں، یہ دراصل اُس بیداری کا نتیجہ تھیں جو برطانوی استیلا کے بعد سیاسی، ثقافتی، مذہبی، تہذیبی اور تعلیمی تحفظات کے لیے ہندوستانیوں میں پیدا ہوئی تھی۔ سیاسی تنظیم کے تعلق سے اِنڈین نیشنل کانگرس کے قیام کو اس ملک کی قومی بیداری کی بڑی علامت سمجھا جاتا ہے۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کی طرف سے ملّی امور کی پاسداری کے لیے جو تحریکی سرگرمیاں نظر آتی ہیں، وہ بھی انہی حالات کے دفاع کے لیے تھیں، جو انقلاب کے زیر اثر پیدا ہوئے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ، دارالعلوم دیو بند، انجمن اسلام بمبئی اور انجمن حمایت اسلام لاہور وغیرہ اس سلسلے کے چند اہم نام ہیں۔ یہ سارے ادارے اور تحریکیں مسلمانوں میں دینی اور عصری تعلیم کے فروغ کے لیے وجود میں آئے تھے۔ ان کی وجہ سے ہندوستان کے مختلف حصوں میں مقامی اور علاقائی سطح پر بہت سے اداروں اور تحریکوں نے جنم لیا تھا۔

اس عہد میں مدرسہ طبیہ دہلی کی شکل میں یونانی طب کے تعلیمی نظام کو مربوط اور منظم کرنے کی ایک کوشش سامنے آئی۔ اس کا مقصد تھا کہ طب کے روایتی طریقۂ تعلیم کو ایک نظام کے تحت جامعات کی صورت میں انجام دیا جائے۔ اس لیے کہ جزوی طور پر مدارس کے نصاب میں طبّی کتابوں کی شمولیت یا استاذی نظام کے تحت اطباء کے مطبوں کے ذریعہ فنی تربیت کا طریقہ نہ صرف ناکافی اور محدود تھا، بلکہ معاصر تقاضوں کی تکمیل سے بھی قاصر تھا اور اس سے جدید عہد کے تعلیمی

تقاضے پورے نہیں ہو پا رہے تھے۔ ان نقائص کی وجہ سے طبِ یونانی کو غیر مستند، غیر علمی اور غیر معتبر قرار دینے کی کوشش ہو رہی تھی، جس سے اس کا وجود اندیشوں کے گھیرے میں تھا۔ یہی معاملہ دوسری دیسی طبوں کا بھی تھا۔

1857 کے انقلاب کی ناکامی ہندوستانیوں کی محض ایک سیاسی شکست نہیں تھی، بلکہ تہذیبی، معاشرتی، سماجی اور علمی و فنی، تمام شعبوں پر اس کے اثرات تھے۔ اس لیے سیاسی تنظیم کے ساتھ دوسرے محاذوں پر بھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔ دیگر اُمور کی طرح ان نئے حالات میں مغربی طب کے سامنے ہندوستانی معالجاتی نظام مغلوب نظر آ رہے تھے۔ اس صورت میں ان کی تعلیمی تنظیم کے ساتھ، ان کے روایتی پیراہن کو بدلنا بھی اب ضروری ہو گیا تھا۔

دینی اور عصری علوم کے باب میں دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بڑے خوشگوار نتائج سامنے آئے، یہی کام طبّی تعلیم کے سلسلے میں مدرسہ طبیہ، دہلی کے ذریعہ انجام پایا، یہ مدرسہ ایک تحریک ثابت ہوا اور اس کے اثر سے ہندوستان کے طول و عرض میں متعدد طبّی درس گاہوں کا قیام عمل میں آیا۔ شمال تا جنوب اور مغرب تا مشرق بلا امتیاز ہر خطہ میں یونانی طب کی تعلیمی تنظیم کے ساتھ اسے معاصر تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اطباء اور بہی خواہانِ طب کی ان مساعی کا مطالعہ طبّی تاریخ کا ایک اہم عنوان ہے۔ اس موضوع کے مطالعہ سے اطباء اور حامیانِ طب کا ایک مستحسن کردار سامنے آتا ہے۔ اس وقت یونانی طب میں تعلیم و تحقیق کی جو سرگرمیاں نظر آ رہی ہیں، ان کی کڑیاں انہی مساعی سے مربوط ہیں، جو معاصر تقاضوں کے تحت ڈیڑھ سو برس پہلے شروع ہوئی تھیں۔

ان اداروں کے ذریعہ طب کے تحفظ کا جو کام انجام پایا ہے، اسے سمجھنے کے لیے ان کی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے، لیکن ہمارے پاس اس قسم کا کوئی لٹریچر نہیں ہے۔ تلاش بسیار کے بعد اس سلسلہ میں بمشکل چند مضامین ملتے ہیں۔ یہ تشنگی متقاضی تھی کہ اسے مستقل موضوع بنا کر کام کیا جائے، مگر اب تک یہ عنوان طبّی مورخین کی نظروں میں خاطر خواہ اہمیت نہیں پا سکا ہے۔

اس وقت ادارہ جاتی تاریخ کا شمار فنِ تاریخ کے نئے اُبھرتے موضوعات میں ہے۔ اس جدید عنوان پر یورپی مورخین کی خاص توجہ ہے اور ترقی یافتہ زبانوں میں اداروں کی تاریخ پر کام

کرنے کا فی رواج ہے۔ لیکن مشرقی السنہ میں اس قسم کا بہت کم مواد دستیاب ہے۔ خاص طور پر اردو زبان میں طبّی اداروں کی تاریخ سے متعلق جو کام ہوا ہے، اس کی مقدار اشکِ بلبل سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ جب کہ اردو سے طب کے گہرے رشتے کا تقاضا ہے کہ اس زبان میں طبّی اداروں کی تاریخ کی باضابطہ تدوین کی جائے، مگر ایسا نہیں ہو پایا۔ غالباً موضوع کی صعوبت اس عدمِ التفات کی اہم وجہ رہی۔ خود راقم کو ان اداروں پر کام کرتے وقت بڑی دشواریوں کا سامنا ہوا۔ طب کے قدیم تعلیمی اداروں سے واقفیت کا کسی قدر ذریعہ اس عہد کے رسائل و جرائد ہیں، جو زیادہ تر امتداد زمانہ کی نذر ہو گئے ہیں، جو بچے ہیں ان کی دستیابی مشکل ہے۔ تلاش و جستجو کے ذریعہ اگر اس زمانے کے کچھ رسائل مل بھی جاتے ہیں تو ان سے کسب مواد جوئے شیر لانے جیسا ہے۔ بعد کے اداروں سے واقفیت کا صرف ایک وسیلہ یہ تھا کہ وہاں پہنچ کر مطلوبہ معلومات حاصل کی جاتیں، مگر یہ کام بھی آسان نہیں تھا۔ لیکن احباب اور کرم فرماؤں کے تعاون نے اس مشکل کو سہل بنا دیا اور ان کی وجہ سے دور دراز میں واقع اداروں کی معلومات حاصل ہو سکیں۔

خدا کا شکر ہے کہ اس تالیف کے ذریعہ پہلی بار اردو زبان میں طبّی درس گاہوں کے بارے میں اتنا مواد سامنے آ رہا ہے۔ اس میں گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں قائم ہونے والے طب کے 86 تعلیمی اداروں کے قیام کے محرکات، ان کے بانیان، ان کے تعلیمی رجحانات اور طب کے فروغ اور نشر و اشاعت میں ان کے کردار کا جائزہ شامل ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ کے ذریعہ ان سیکڑوں اشخاص کا مختصر ہی سہی، ایک تذکرہ سامنے آ گیا ہے، جن کا کردار طب کی ترقی اور فروغ کے لحاظ سے بے حد اہمیت کا مستحق تھا۔ مگر مروجہ تذکروں میں انہیں خاطر خواہ جگہ نہیں مل پائی تھی۔ یہ اس مجموعہ کا بہت اہم پہلو ہے کہ طبّی تاریخ کے یہ نظر انداز چہرے اس تالیف کے ذریعہ روشنی میں آ سکے۔

اس مجموعہ میں حروف تہجی کے لحاظ سے صوبوں کی ترتیب قائم کر کے، وہاں کے اداروں کو زمانی قدامت کے لحاظ سے پیش کیا گیا ہے تاکہ ہندوستان کے ہر خطہ میں ہونے والے ادارہ سازی کے کام کی مجموعی تصویر سامنے آ جائے۔ وہ علاقے جو 1947 کے بعد ہندوستان سے الگ ہو گئے تھے، وہاں کے اداروں کو 'غیر منقسم ہندوستان' کے ذیل میں بیان

کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں مذکور بعض اداروں کا بیان بے حد مختصر ہے، دراصل ان کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہوسکا ہے۔ سردست ان کے تذکرے کا مقصد یہ ہے کہ کم از کم قاری کے سامنے ان کا نام آجائے۔ کچھ ادارے بہت محدود پیمانہ پر تھے، مگر ان سے صَرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ یہ اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں جب یونانی طب میں تعلیمی تنظیم کا کام ابتدائی مرحلہ میں تھا اور ابھی یہ نظام مکمل طور پر روایتی خول سے باہر نہیں آسکا تھا۔ لہٰذا یہ جس صورت میں تھے، اپنے عہد اور زمانے کے تناظر میں اہم تھے۔ ہندوستان میں ڈیڑھ سو برس کی مدت میں قائم ہونے والے ہر قسم کے طبّی اداروں کی تاریخ پر مشتمل یہ مجموعہ اپنے موضوع پر نقشِ اوّل ہے، لہٰذا اس میں بہت سے اضافوں کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

طبّی اداروں کے اس آئینۂ تاریخ میں ماضی کی تعلیم گاہوں کے خدوخال اُبھار کر، اُن کے صحیح نقوش سامنے لانے، گزشتہ عہد کے حوالہ سے ان کا کردار پیش کرنے اور عہد حاضر کے تعلیمی نظام پر ان کے اثرات بیان کرنے کے ساتھ، حال کی طبّی درس گاہوں کی جامع تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں ان کی وہ خوبیاں بھی نظر آتی ہیں جن کو بہ سے بہتر کرنے کی ضرورت ہے اور ان کے اندر پائی جانے والی وہ کمزوریاں بھی، جو اصلاح طلب ہیں۔

تاریخ طب، یونانی نصابِ تعلیم کا ایک حصہ ہے، اس کا ایک باب طبّی درس گاہوں سے متعلق ہے، انہیں کے تذکرہ پر یہ مجموعہ مشتمل ہے۔ اس میں تعلیمی اداروں کی جس قدر تفصیلات درج ہیں، وہ طلبہ کے لیے کافی ہیں۔ اساتذہ اور محققین ان سے خاطر خواہ استفادے کے علاوہ 'متعلقہ حوالہ جات' کی مدد سے ان کے بارے میں مزید آگہی حاصل کرسکتے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب نصابی اور حوالہ جاتی دونوں ضرورتوں کی تکمیل کرتی ہے۔

حکیم فخر عالم

۲۵/اکتوبر ۲۰۱۶ء

گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج۔ حیدرآباد

سلطان العلوم میر عثمان علی خاں آصف جاہ ہفتم کا زمانہ حکومت ترقیات علوم وفنون کے حوالہ سے نہایت یادگار ہے۔ دوسرے شعبہ ہائے علم کی طرح یونانی طب کو بھی ان کے عہد میں ترقی اور فروغ کے عمدہ مواقع ملے۔ مدرسہ طبیہ، جسے ان کے پیش رو نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم نے 1891 میں قائم کیا تھا، نہایت محدود پیمانہ پر تھا، میر عثمان علی خاں نے اسے وسعت اور ترقی دے کر کالج کا درجہ دینے کا منصوبہ بنایا۔ ان کا خیال تھا کہ یونانی طب ایک اہم عوامی ضرورت ہے اور اس ملک کے باشندوں سے بے حد مزاجی مناسبت رکھتی ہے۔ چنانچہ مفاد عامہ کے پیش نظر انھوں نے ریاست کے یونانی محکمہ کو فعال اور منظم بنانے، خصوصاً طبی تعلیم کی تنظیم جدید اور مدرسہ طبیہ کی مناسب اصلاح سے متعلق 1336 فصلی کو ایک فرمان جاری کیا کہ:

> ''حکماء کے فرائض کی تنقیح اور طریقہ سربراہی، ادویہ کی اصلاح اور مدرسہ طبیہ کے تعلیمی نصاب کی ترمیم وغیرہ سے متعلق مکمل اسکیم مرتب کر کے باب حکومت کی رائے کے ساتھ گزاری جائے۔'' [1]

اس اسکیم کو عملی شکل عطا کرنے کے لئے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی لاہور (1896-1974)، حکیم محمد احمد خاں دہلی (1885-1937)، شفاء الملک حکیم عبدالحمید لکھنؤ (1884-1940) اور ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ پرنسپل طبیہ کالج، علی گڑھ اس کمیٹی کے

اہم اراکین میں تھے۔ ایک تا تیرہ فروری 1936 کو کمیٹی کے منعقدہ اجلاس میں نظامیہ طبیہ کالج کے لئے جو نصاب تجویز ہوا وہ بہت حد تک طبیہ کالج دہلی اور طبیہ کالج علی گڑھ کے طرز پر تھا۔ شفاء الملک حکیم عبدالحمید نے اس مجوزہ نصاب پر اختلافی نوٹ تحریر کیا تھا۔[2]

27/ جمادی الثانی 1344ھ/ 1925 کو میر عثمان علی خاں نے ایک دوسرا حکم جاری فرمایا کہ افضل گنج کے عثمانیہ ہاسپٹل (ایلوپیتھی اسپتال) کے طرز پر صدر شفاخانہ نظامیہ (یونانی اسپتال) کی تعمیر کا بندوبست کیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں سررشتہ تعمیرات نے چارمینار اور مکہ مسجد سے متصل تقریباً تین لاکھ روپے کی لاگت سے زمین حاصل کر کے پانچ لاکھ کے صرفہ سے ایک عالی شان دو منزلہ عمارت تعمیر کی۔ اس کا سنگ بنیاد خود میر عثمان علی خاں آصف جاہ ہفتم نے 14/ ربیع الثانی 1345ھ/ 1926 کو نصب فرمایا اور 7/ شوال المکرم 1358ھ/ 1939 کو صدر نظامیہ شفاخانہ اور نظامیہ طبی کالج کا انھوں نے بدست خود افتتاح فرمایا تھا۔ اس موقع پر میر عثمان علی خاں آصف جاہ ہفتم نے حکماء کے ایڈریس کے جواب میں جو خطبہ عطا کیا تھا، وہ طب سے ان کے لگاؤ کا مظہر ہے، اس کی تاریخی اہمیت کے باعث اسے محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی مقصد سے اسے نقل کیا جا رہا ہے۔

"مجھے آج (7/ شوال 1358ھ/ 1939) صدر شفاخانہ نظامیہ کا افتتاح کر کے مسرت حاصل ہوئی، بالخصوص اس لئے کہ یہ ایک اقامتی شفاخانہ ہے جہاں غریب اور نادار مریضوں کے رہنے کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ ان کی تیمارداری اور علاج خاطر خواہ طریقہ پر لائق اطباء کی زیر نگرانی ہو سکے اور یہ اپنے امراض لاحقہ سے شفا پا سکیں۔ اس کے ساتھ ہی ایسے لوگوں کے لئے الگ کمرے مہیا کئے گئے ہیں جو مالی استطاعت رکھتے ہیں اور علاج کے مصارف برداشت کر سکتے ہیں۔ غرض ہر طبقہ کے لوگ خواہ وہ مفلس ہوں یا غنی اس شفاخانہ سے یکساں طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔

میری ایک عرصہ سے تمنا تھی کہ میرے پایۂ تخت میں ایک یونانی صدر شفاخانہ "عثمانیہ ہاسپٹل" کے مماثل قائم ہو جس میں غریب مرضا کی سکونت اور علاج و معالجہ کا معقول انتظام ہو اور اچھے طبیب اور خالص ادویہ ان کو میسر آ سکیں۔ الحمد للہ کہ یہ میری خواہش اس دواخانہ کے قیام کی

وجہ سے پوری ہوئی اور گو کہ فی الحال یہاں صرف پچاس مریضوں کے رہنے کا انتظام کیا گیا ہے تاہم مجھے امید ہے کہ یہاں آئندہ دو تین سو مریض سکونت کر سکیں گے۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ یونانی طب ایک قدیم اور شریف فن ہے جس کے قوانین کی تدوین مشاہیر گروہ اطباء یونان نے کی تھی جو سپہر طبابت کے درخشاں نجوم تصور کئے گئے تھے اور جن کا زریں اصول علاج ''علاج بالضد'' تھا، علاوہ اس کے زمانہ ماسبق میں یہاں ایسے حاذق اطباء گزرے ہیں، جنھوں نے کثرت سے لوگوں کو سخت اور شدید امراض سے تندرست کیا تھا، جو آجکل کے زمانہ میں تقریباً لاعلاج خیال کئے جاتے ہیں۔ پس ان وجوہ سے مجھے ہمیشہ اس فن سے فطری دلچسپی اور اس میں کامل شغف رہا ہے اور جو کچھ تھوڑی بہت دستگاہ اور ذاتی تجربہ مجھ کو خود اس میں حاصل ہے وہ گروہ اطباء سے مخفی نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے اپنے عہد حکومت میں منجملہ دوسرے علوم کی ترقی کے فن طب کے احیاء اور ارتقاء کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے، کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ موجودہ زمانہ کی غفلت اور ناقدری کے ہاتھوں اس پر زوال آنا شروع ہو گیا تھا اور اس کا وجود معرض خطر میں تھا تاہم اس ملک کی آب و ہوا اور یہاں کے لوگوں کے مزاج سے خاص مناسبت رکھنے کی وجہ سے اب بھی عام خلائق میں بہت مقبول ہے، جیسا کہ سرکاری دواخانوں کے کثیر مرجوعہ سے ثابت ہے، مگر لائق طبیبوں اور کثرت سے دواخانوں کا مہیا ہونا بھی لازم و ملزوم ہے، جس سے یہ مرجوعہ اور بھی زیادہ ہونے کی توقع ہم کو دلاتا ہے، نظر بر آں مجھ کو یقین ہے کہ نظامیہ طبیہ کالج رفتہ رفتہ حاذق حکیموں کو پیدا کر کے اس کمی کو پورا کرے گا اور اس طرح خود کو مزید ترقی کا اہل ثابت کرے گا.........'' 3

نظامیہ طبیہ کالج کے دستور العمل میں شائع تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم مقصود علی خاں اس کے پہلے صدر (پرنسپل) اور حکیم کبیر الدین نائب صدر (وائس پرنسپل) تھے۔ اساتذہ میں حکیم فضل الرحمان خاں (پروفیسر مرضیات، سریریات، منافع الاعضاء)، حکیم سید علی آشفتہ (پروفیسر معالجات، سریریات، ادویہ)، حکیم محمد ابراہیم (پروفیسر کلیات، مبادیات، منطق و فلسفہ)، حکیم سید حیدر حسینی (پروفیسر معالجات)، ڈاکٹر مرزا حمید اللہ بیگ ایم بی بی ایس (پروفیسر جراحیات، علم الجراثیم)، حکیم معین الدین احمد جھجری، فارغ طبیہ کالج دہلی (مددگار پروفیسر حفظ صحت قدیم و

جدید)، حکیم ھبتہ اللہ، فارغ طبیہ کالج دہلی (پروفیسر تشریح)، حکیم الیاسین خاں (مددگار پروفیسر منافع الاعضاء)، عبدالحیٰ ایم ایس سی عثمانیہ یونیورسٹی (پروفیسر کیمیا وطبعیات)، ڈاکٹر قاسم حسین صدیقی ایل آرسی پی لندن، ایم آرسی ایس لندن (لکچرر طب قانونی وعلم ولادت)، حکیم محمود رضا خاں (لکچرر ادویہ مفردہ ومرکبہ)، حکیم محمد اسمٰعیل ندوی (لکچرر عربی) کا تقرر ہوا تھا۔ یہ اساتذہ اپنے مضامین میں نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انہیں بھاری مشاہروں پر ہندوستان کے مختلف حصوں سے مدعو کیا گیا تھا۔

نظامیہ طبیہ کالج میں ''طبیب مستند'' اور ''ماہر طب'' تعلیم کے دو درجات تھے۔ طبیب مستند کی مدت تعلیم تین سال تھی۔ ماہر طب، تبحر کا درجہ تھا، اس کی مدت دو سال تھی۔ طبیب مستند کا ذریعہ تعلیم اردو تھا، ماہر طب کی تعلیم اردو اور عربی میں ہوتی تھی۔ یہ دونوں کورس سررشتۂ طبابت سرکار عالی سے تسلیم شدہ تھے۔

آصف جاہی حکومت کے زوال اور آندھرا پردیش کی تشکیل کے بعد صرف طبیب مستند کا کورس جاری رہا، مگر بورڈ آف انڈین میڈیسن نے اس میں قدرے ترمیم کرکے اسے (Graduation Course of Unani Medicine)GCUM کردیا۔ پھر ایک عرصہ بعد حکومت آندھرا پردیش نے اس کی جگہ BMUS کا کورس شروع کیا۔ اس کی مدت تعلیم چار برس تھی۔ اس کا تعلق بھی بورڈ آف انڈین میڈیسن سے تھا۔ 1970 سے سی سی آئی ایم کے مجوزہ نصاب کے مطابق BUMS کی تعلیم شروع ہوئی اور عثمانیہ یونیورسٹی سے کالج کا الحاق عمل میں آیا۔ NTR یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز وجے واڑہ کے قیام کے بعد یہ کالج اس یونیورسٹی سے ملحق ہے۔

کالج کے ہسپتال، نظامیہ صدر شفاخانہ میں موجودہ 180 بستروں کی تعداد میں صوبائی حکومت نے اضافہ کرکے 250 کردیا ہے۔ قیام کے وقت اس میں صرف پچاس مریضوں کی گنجائش تھی۔ اس ہسپتال کا ایک امتیاز یہ ہے کہ یہاں دلک، ریاضت اور حمام جیسے روایتی طریقے بڑی کامیابی سے برتے جارہے ہیں۔ حالانکہ اکثر طبی درسگاہوں میں ان کا چلن متروک ہے، یہ بات اس شفاخانہ کے لئے صرف باعث امتیاز ہی نہیں بلکہ اس کی شہرت کا سبب بھی ہے۔

صوبہ کے یونانی شفاخانوں اور مطبوں کے استعمال کے لئے ادویہ کی تیاری کی خاطر 1949 میں انڈین میڈیسن فارمیسی قائم کی گئی تھی۔ یہ اس مقصد کی تکمیل کے ساتھ کالج کے طلبہ کے لئے دوا سازی اور صیدلاتی امور سیکھنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ مفرد دواؤں کی شناخت کی تربیت کے لئے تین ایکڑ کے وسیع رقبہ پر پھیلا نباتی باغ ہے، جہاں مختلف انواع کے ڈھائی سو سے زیادہ پودے ہیں۔

اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ کے بعد نظامیہ طبیہ کالج دوسری طبی درسگاہ ہے جہاں ایم ڈی کی تعلیم شروع ہوئی۔ یہاں 1973 میں شعبۂ معالجات میں پوسٹ گریجویشن سطح کے سلسلہ کا آغاز ہوا تھا۔ 1983 میں امراض نسواں وقبالت، 1993 میں شعبۂ علم الادویہ اور 2008 میں شعبۂ کلیات اور شعبۂ تحفظی وسماجی طب میں ایم ڈی کی تعلیم شروع ہوئی۔ طبی تعلیم کی نشر واشاعت اور احیاء وفروغ کے سلسلہ میں جنوبی ہند کی طبی درسگاہوں میں اس کالج کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو شمالی ہندوستان میں مدرسہ طبیہ، دہلی (موجودہ آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج، قرول باغ) اور اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ کا ہے۔ طبی تحقیق اور اعلیٰ تعلیم کے میدان میں، اپنے بے حد اہم کردار کی وجہ سے یہ کالج طبی درسگاہوں کی تاریخ میں بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ دستور العمل نظامیہ طبیہ کالج سرکار عالی، مطبع وتاریخ اشاعت غیر مذکور، ص 2

2۔ تذکرۂ خاندان عزیزی مولفہ حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، اشاعت دوم 2009، ص 291-288

3۔ دستور العمل نظامیہ طبیہ کالج سرکار عالی، مطبع وتاریخِ اشاعت غیر مذکور، ص 8-6

ڈاکٹر عبدالحق یونانی میڈیکل کالج۔ کرنول

مولانا سلطان احمد (راولپنڈی) نے 1895 میں بمقام کرنول مدرسہ عربیہ کے نام سے ایک اسکول کی بنیاد ڈالی، 1923 میں اسے اسلامیہ عربک کالج، کرنول کے نام سے وسعت دے کر عربی، فارسی اور اردو کے کالج کی شکل دی۔ اس کالج کو یونیورسٹی آف مدراس سے منظوری حاصل تھی۔ 22 جولائی 1946 کو مولانا کی وفات کے بعد ان کے بیٹے ڈاکٹر عبدالحق نے اس کی ذمہ داری سنبھالی۔ انہی کے زمانہ میں یہاں طب کی تعلیم شروع ہوئی اور اس کا نام اسلامیہ عربک اینڈ طبی کالج پڑا۔ 1956 میں جب شری وینکٹیشور یونیورسٹی تروپتی قائم ہوئی تو اس سے اس کالج کا الحاق ہوا اور یہاں کے فارغین کو اس یونیورسٹی کے ذریعہ طبیب کامل کا ڈپلومہ سرٹیفکٹ دیا جانے لگا۔ سی سی آئی ایم، نئی دہلی کی ہدایت پر تعلیمی سال 78-1977 سے ڈپلومہ کی جگہ BUMS کی تعلیم شروع ہوئی۔ ڈپلومہ کورس کو صوبہ کے ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ سے ٹیچنگ گرانٹ ملتی تھی۔ جب سی سی آئی ایم کے نصاب کے ساتھ یہاں BUMS کورس کا اجراء ہوا تو یہ امداد بند کردی گئی[1]۔

12،11 فروری 1979 کو کرنول میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کا دوسری بار اجلاس ہوا تھا۔ اس میں دیگر معززین کے علاوہ صوبہ کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر چنا ریڈی بھی شریک تھے۔ ان کی حکومت سے درخواست کرتے ہوئے صدر کانفرنس حکیم عبدالحمید نے بند گرانٹ، دوبارہ جاری کرنے کی درخواست کی تھی۔ [2]

جب اسلامیہ طبی کالج اپنے موجودہ کیمپس میں منتقل ہوا تو بانی کالج کے نام سے منسوب ہوکر ڈاکٹر عبدالحق یونانی میڈیکل کالج، کرنول کے نام سے موسوم ہوا۔اس کالج کے نظم و نسق کی نگرانی انجمن اسلامیہ، کرنول کرتی ہے۔ اس کی تشکیل 1923 میں ہوئی تھی۔ یہ انجمن سوسائٹیز ایکٹ مجریہ 1860 کے تحت ایک رجسٹرڈ تنظیم ہے۔اس وقت یہ کالج ڈاکٹر این ٹی آر یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز وجے واڑہ سے ملحق ہے۔ اس کالج کو حکومت کی طرف سے ٹیچنگ گرانٹ ملتی ہے۔3

دستیاب اطلاع کے مطابق اب تک اس کالج میں قاضی اسداللہ حسینی، مولوی سید ظہور اللہ حسینی، مولوی سید فقیر اللہ باشا قادری، قاضی عبدالشکور، ڈاکٹر کے ایم اسماعیل حسین، قاضی سید شاہ عبدالحق، ڈاکٹر محمد غوث، حکیم عبدالوارث، حکیم عبدالسلام، حکیم سید جمال اللہ باشا، حکیم سید عبدالمقتدر بخاری، حکیم سید حبیب اللہ باشا بطور پرنسپل خدمت انجام دے چکے ہیں، جبکہ حکیم سید محبوب پاشا اس وقت بطور پرنسپل خدمت انجام دے رہے ہیں۔4

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر عبدالحق یونانی میڈیکل کالج، کرنول میگزین، 1985، مطبوعہ یونین پرنٹر فائن آرٹ لیتھوگرافر، کرنول، ص 4-2

2۔ خطبات حمید از حکیم عبدالحمید، مرتبہ ڈاکٹر خاور ہاشمی، خواجہ پریس دہلی، 1995، ص 254-253

3۔ ملاحظہ ہو حوالہ نمبر 1

4۔ متعلقہ تفصیل حکیم عظیم احمد سعید (متوطن ملور، استاذ نظامیہ طبی کالج۔ حیدرآباد، سابق طالب علم ڈاکٹر عبدالحق یونانی میڈیکل کالج۔ کرنول) کی اطلاع پر مبنی ہے۔

شبینہ طبیہ کالج۔ حیدرآباد

شبینہ طبیہ کالج حیدرآباد کا قیام یونانی طبی کانفرنس، آندھرا پردیش کے ذریعہ عمل میں آیا تھا۔ حکیم مولوی ھبۃ اللہ اس کے پرنسپل تھے۔ 23 ستمبر 1962 کو کالج میں تقسیم انعامات کا جلسہ منعقد ہوا، حکیم کبیر الدین اس کے صدر تھے۔ حکیم معین الدین جھجھری صدر یونانی طبی کانفرنس، آندھرا پردیش نے اس موقع پر خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے شبینہ طبیہ کالج کے قیام کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی تھی۔ کانفرنس کے جنرل سکریٹری حکیم محمد ابراہیم رضا اجملی نے کالج کی سہ سالہ رپورٹ پیش کی تھی۔ اس موقع پر حکیم کبیر الدین نے کالج کے پیتھالوجی لیب کا افتتاح کیا تھا۔1

حوالہ

1۔ مسیحا، بمبئی، پندرہ روزہ (مدیر حکیم محمد مختار اصلاحی)، جلد 5، شمارہ 20، 15 اکتوبر 1962، ص 9

اسٹیٹ تکمیل الطب کالج۔ لکھنؤ

لکھنؤ میں طبی درسگاہوں کے قیام سے بہت پہلے طب کی نظری اور عملی تعلیم کا سلسلہ قائم تھا اور غیر رسمی طور پر اطباء کے مطبوں سے شائقین طب استفادہ کر رہے تھے۔ مگر یہ نظام تعلیم معاصر تقاضوں کے لحاظ سے ناکافی تھا۔ لہٰذا اسے مربوط اور منظم کرنے کی ضرورت تھی۔ خصوصاً 1857 کے بعد جس طرح کے حالات سے یونانی طب کو دوچار ہونا پڑا، اس کے بعد تعلیمی نظام کی تنظیم اور اس کے روایتی انداز کو تبدیل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ خاندان شریفی نے ان تقاضوں کو پہلے ہی محسوس کر کے مدرسہ طبیہ دہلی کی شکل میں یہ کام شروع کر دیا تھا۔ اطبائے لکھنؤ ان داعیوں سے بے بہرہ نہیں تھے۔ اس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں یہاں تین طبی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ ان میں سب سے اہم تکمیل الطب ہے۔ اس کے بانی حکیم عبدالعزیز لکھنوی (1855-1911) ہیں۔ وہ ایک عرصہ سے اپنے خاندان میں جاری انفرادی تدریسی سلسلہ کو مربوط کر کے اسے باقاعدہ ایک مدرسہ کی شکل دینے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اسی دوران انھوں نے اپنے پیرومرشد مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کو خواب میں دیکھا کہ وہ اس مدرسہ کو شروع کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے مدرسہ کے قیام کا مصمم عزم کر لیا۔ اپنے چھوٹے بھائی حکیم عبدالحفیظ، صاجزادوں حکیم عبدالرشید و حکیم عبدالحمید، بھتیجوں حکیم عبدالمجید اور حکیم عبدالمعید کو جمع کیا اور خواب کے تذکرہ کے بعد فرمایا کہ اب میں طبی

درسگاہ سے متعلق اپنے منصوبہ کو عملی شکل دینا چاہتا ہوں۔ گھر اور خاندان کے اطباء سے مشورہ کے بعد 2/مارچ 1902 کو بغرض مشاورت ایک جلسہ کا اہتمام کیا جس میں لکھنؤ کے مشاہیر، معززین اور تعلقہ داران اودھ کو بلا کر، ان کے سامنے طبی درسگاہ سے متعلق اپنے عزائم کی تفصیل بیان کی۔ حاضرین نے انہیں تعاون کا یقین دلایا۔ مشاورتی سطح پر طے ہو جانے کے بعد جولائی 1902 میں جھوائی ٹولہ لکھنؤ میں تکمیل الطب کا قیام عمل میں آیا۔ چونکہ یہ مدرسہ فنی خدمت کے لئے قائم ہوا تھا اس لئے یہاں طلبہ سے فیس نہیں لی جاتی تھی بلکہ ایسے طلبہ جو ذاتی اخراجات کے متحمل نہیں ہوتے، ان کی اعانت کی جاتی۔ قیام کے وقت حکیم عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے اطباء بلا معاوضہ درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ حکیم عبدالعزیز کلیات قانون، حکیم عبدالحفیظ حمیاتِ قانون، حکیم عبدالرشید شرح اسباب جلد اول، حکیم عبدالمجید شرح اسباب جلد دوم، حکیم عبدالحمید نفیسی و کامل الصناعۃ (مقالہ ثانیہ و تاسعہ)، حکیم عبدالمعید قانونچہ، موجز و اقسرائی پڑھاتے تھے۔ سال اول سے سال آخر تک کے تمام طلبہ کے لئے مطب کی حاضری و نسخہ نویسی کی تعلیم ضروری تھی۔ ابتداً تکمیل الطب کا نصاب تین سال کا تھا۔ یہاں وہ طلبہ داخلہ کے اہل تھے جو کم از کم منطق میں ملاحسن، فلسفہ میں میبذی اور ہیئت میں تصریح پڑھ چکے ہوں، ان کے پاس کسی مدرسہ کی سند یا استاذ کا تصدیق نامہ ہو[1]۔ 30/اکتوبر 1904 کو تکمیل الطب کے فارغین کا پہلا بیچ نکلا۔ اس موقع پر ایک پروقار تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ تقسیم اسناد کے اس جلسہ میں شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کی تقریر پروگرام کا خاص جز تھی۔[2]

تعلیمی تنظیم کے ساتھ تشریح، سرجری اور کیمسٹری (علم دوا سازی) جیسے طب کے متروک شعبوں کا احیاء تکمیل الطب کے قیام کا اہم مقصد تھا۔ طب کے مروجہ نصاب میں ان مضامین کی عدم موجودگی کو حکیم عبدالعزیز ایک بڑا تعلیمی نقص تصور کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کرنل اینڈرسن جو لکھنؤ میں سول سرجن تھے، ان کے تعاون سے تکمیل الطب میں اعمال جراحی کی ترقی کا اہتمام کیا[3]۔ کرنل اینڈرسن نے حکیم عبدالعزیز کے صاحبزادوں حکیم عبدالرشید اور حکیم عبدالحمید کو تشریح اور جراحت کی تعلیم دے کر اس لائق بنا دیا کہ وہ تکمیل الطب میں اپنے والد کے منصوبہ کے مطابق سرجری کو رواج دے کر طب میں اس متروک مضمون کے احیاء کا سامان

کرسکیں۔ جن خطوط پر حکیم عبدالعزیز اس مدرسہ میں تعلیم کا اہتمام کرنا چاہ رہے تھے، ان تعلیمی نظریات کی مخالفتیں بھی ہوئیں لیکن انھوں نے بزور استدلال مخالفت کرنے والوں کو مسکت کن جواب دیا۔

1911 میں حکیم عبدالعزیز کے انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحبزادہ شفاء الملک حکیم عبدالرشید (1879-1920) نے مجلس منتظمہ کے آنریری سکریٹری کی حیثیت سے کالج کی ذمہ داری سنبھالی اور پدر محترم کے قائم کردہ خطوط پر اسے آگے بڑھایا۔ لیکن انہیں کالج کی تعمیر و ترقی میں حصہ ادا کرنے کا زیادہ وقت نہیں ملا۔ 1920 میں حکیم عبدالرشید کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی شفاء الملک حکیم عبدالحمید (1884-1940) آنریری سکریٹری مقرر ہوئے۔ منصب اہتمام پر فائز ہونے کے بعد انھوں نے کئی اصلاحی اقدام کئے۔ کلیات کی نظری تعلیم کے ساتھ اس کی عملی مشق، نبض اور قارورہ کے معائنہ و مشاہدہ اور نسخہ نویسی کی تربیت کو تعلیم کا ضروری حصہ قرار دیا اور علم کیمیا کی عملی تربیت کے لئے آلات کیمسٹری کا انتظام کیا۔ سابقہ نصاب تعلیم میں کسی قدر ترمیم اور اصلاح کے بعد یکم جنوری 1921 سے مندرجہ ذیل نصاب رائج کیا۔[4]

درجۂ ابتدائی : موجز، سدیدی، شرح اسباب جلد ثانی، رسالہ براکلوس، فہرست ادویہ

درجۂ دوم: نفیسی، شرح اسباب جلد اول، کامل الصناعۃ مقالہ ثانیہ و ثالثہ، افعال و خواص ادویہ

درجۂ اعلیٰ: حمیات قانون، معالجات قانون، کامل الصناعۃ مقالہ تاسعہ، نسخہ نویسی، کلیات قانون

حکیم عبدالحلیم درجۂ ابتدائی کے طلبہ کو مفردات سدیدی، شناخت ادویہ اور مفردات مروجۂ مطب پڑھاتے تھے۔ حکیم عبدالحمید (آنریری سکریٹری) درجۂ ابتدائی کے طلبہ کو شرح اسباب جلد دوم، درجۂ دوم کے طلبہ کو ادویہ مفردات مروجۂ مطب کے افعال و خواص اور درجہ اعلیٰ کے طلبہ کو کامل الصناعۃ مقالہ تاسعہ پڑھانے کے ساتھ آلات سرجری کی معلومات فراہم کرتے تھے۔ حکیم محمد عبدالحلیم درجۂ ابتدائی کے طلبہ کو موجز پڑھاتے تھے، حکیم محمد عبداللطیف علم کیمیا کے استاذ تھے، درجۂ ابتدائی کے طلبہ کو رسالۂ براکلوس پڑھانے کے ساتھ انہیں کیمیاوی آلات کا معائنہ کرواتے اور ان کے استعمال کے طریقے سمجھاتے تھے۔ حکیم منّے آغا آفتاب، درجۂ دوم کے طلبہ کو نفیسی پڑھاتے ساتھ ہی نبض اور قارورہ کے معائنہ کی مشق کرواتے اور درجۂ اعلیٰ کو کلیات قانون

پڑھاتے تھے۔ حکیم خواجہ شمس الدین درجۂ دوم کے طلبہ کو شرح اسباب جلد اول پڑھاتے تھے۔ حکیم سید عبدالعلی درجۂ دوم کے طلبہ کو کامل الصناعہ پڑھاتے تھے اور عظام کا معائنہ کرواتے تھے۔ حکیم حافظ محمد عبدالمجید درجۂ اعلیٰ کو حمیات قانون، معالجاتِ قانون اور نسخہ نویسی کی تعلیم دیتے تھے۔[5]

حکیم عبدالحمید نے اپنے دور اہتمام میں تکمیل الطب میں علم تشریح کے فروغ کے لئے ڈسکشن ہال تعمیر کروایا اور نعشوں کے حصول کا انتظام کیا۔ ان کا خیال تھا کہ تشریح میں مہارت کے بغیر جراحت کی تعلیم، جو تکمیل الطب کے نصب العین کا اہم حصہ ہے، ادھوری اور نامکمل ہے۔

حکیم عبدالحمید نے 1928 میں کالج کے لئے ایک نیا نصاب مرتب کیا جس میں تین سال کے مجوزہ نصاب کے علاوہ چوتھے اختیاری سال کا اضافہ کیا جو درجۂ تبحر کہلاتا تھا، دراصل یہ تخصص کا درجہ تھا، جس میں علم الجراثیم، سرجری، فرسٹ ایڈ، میڈیکل جیورس پروڈنس اور سائنس کے دیگر مضامین کی تعلیم ہوتی تھی[6]۔ نصابی اصلاح کی یہ کوشش اہلیان خاندان عزیزی کے نظریاتی بدلاؤ کا ایک بڑا اشارہ ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید مضامین کی تعلیم سے متعلق ان کا یہ قدم مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور ان کے کالج سے متاثر ہو کر اٹھایا گیا تھا۔ جدید مضامین کے سلسلہ میں خاندان عزیزی کے اراکین خصوصاً شفاء الملک حکیم عبدالحمید اور شفاء الملک حکیم عبداللطیف کا ہمیشہ یہ نظریہ رہا کہ ماڈرن پیتھالوجی اور علم الجراثیم جیسے مضامین ایلوپیتھی طریقۂ علاج کے لئے مخصوص ہیں۔ طبی اداروں میں ان کی تعلیم سے یونانی طب کے طلبہ کے ذہنوں میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر شاہ سلیمان کے زمانہ میں طبیہ کالج کے نصاب سے متعلق کمیٹی کے ایک رکن شفاء الملک حکیم عبدالحمید بھی تھے، انھوں نے یہاں کے نصاب میں جدید پیتھالوجی اور علم الجراثیم کی شمولیت کی اسی خیال کی بنا پر مخالفت کی تھی۔ اس کے علاوہ جب نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد کے لئے طبیہ کالج دہلی اور طبیہ کالج علی گڑھ کے خطوط پر نصاب تجویز کیا جارہا تھا تو انھوں نے اختلافی نوٹ میں لکھا تھا کہ طب جدید کی پیتھالوجی اور اس کا نظریۂ جراثیم یونانی طب کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہے اور ان سے طب کی فنی خصوصیات متاثر ہونگی۔ لہٰذا طبی نصاب سے انہیں خارج ہونا چاہئے[7]۔ اس شدید رخ کے باوجود انھوں نے تکمیل الطب کے اندر درجۂ تبحر کی شکل میں علم الجراثیم جیسے مضامین کی تعلیم کا خصوصی اہتمام کیا۔ یہاں قاری کے ذہن

میں اس سوال کا آنا فطری ہے کہ اگر دلی، علی گڑھ اور حیدرآباد کے طبیہ کالجوں میں اس کی تعلیم فنی مفاد کے خلاف تھی تو تکمیل الطب میں اس کے جواز کی کیا بنیاد تھی۔

تعلیم و تحریک اور مطب و معالجہ، ہر میدان میں عزیزی خاندان نے شریفی خاندان سے مختلف ایک الگ روش کا انتخاب کیا۔ اس کے پیچھے حد امتیاز قائم رکھنے کا جذبہ ایک اہم محرک معلوم ہوتا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کر کے حکیم اجمل خاں نے طبیہ کالج، دہلی میں اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دے کر اس کے فروغ کا اہتمام کیا۔ ان کی کوششوں کے مفید نتائج سامنے آئے اور دوسری طبی درسگاہوں میں اس کی تقلید کی گئی۔ اس کے برعکس عزیزی خاندان نے طب کی تعلیمی زبان کے طور پر عربی زبان کی وکالت کی۔ شفاء الملک حکیم عبدالحمید کے ایما پر حکیم عبدالحلیم نے ''طب کی تعلیمی زبان'' کے نام سے 1925 میں ایک رسالہ لکھ کر طب کو عربی زبان میں پڑھانے کی پُر زور وکالت کی تھی۔ حالانکہ اس زمانہ میں طب ہی کیا دوسرے سائنسی علوم کو بھی اردو میں پڑھائے جانے کی کوشش ہو رہی تھی۔ ایسے حالات میں طب کے لئے عربی زبان کی وکالت کا عصری اور فنی ضرورتوں سے کوئی واسطہ نظر نہیں آتا۔ اسی لئے خود تکمیل الطب کالج میں یہ کوشش ناکام ہوگئی۔ چنانچہ 1939 کے انجمن طبیہ لکھنؤ کے اجلاس میں شفاء الملک نے نصابی کمیٹی کے ذریعہ طب کی تعلیمی زبان عربی رکھے جانے کی تجویز تو منظور کروالی لیکن وہ عملی جامہ نہیں پہن سکی۔

حکیم عبدالمعید مختلف حیثیتوں سے تکمیل الطب سے وابستہ رہے۔ 1930 میں وہ اس کے پرنسپل اور جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ 1936 میں جب شفاء الملک حکیم عبدالحمید سفر حج پر گئے تو انھوں نے عبوری طور پر آنریری سکریٹری کی ذمہ داری سنبھالی۔ ان کی واپسی کے بعد بھی وہ بدستور اس عہدہ پر قائم رہے۔ 1930 سے 1946 تک بحیثیت پرنسپل کام کیا۔ 1946 میں حکیم عبدالحسیب کو آنریری جوائنٹ سکریٹری اور پرنسپل کی ذمہ داری تفویض کر کے صرف آنریری سکریٹری کا عہدہ اپنے پاس رکھا۔ 1962 تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے۔ ان کی کوششوں کی بدولت 2رفروری 1941 کو حکومت نے کالج کو تسلیم کیا اور بورڈ آف انڈین میڈیسن، یوپی سے اس کا الحاق ہوا اور کالج کی گرانٹ میں اضافہ ہوا۔

تکمیل الطب کی تعمیر و ترقی کے سلسلہ میں حکیم شکیل احمد شمسی اور حکیم مسیح الزماں ندوی کی مساعی بھی اہم ہیں۔ جب 1957 میں حکیم عبدالحسیب تکمیل الطب چھوڑ کر علی گڑھ چلے گئے تو ان کی جگہ حکیم شکیل احمد شمسی پرنسپل مقرر ہوئے۔ 1965 میں وہ اس عہدہ سے الگ ہو گئے تو حکیم مسیح الزماں ندوی ان کی جگہ پرنسپل مقرر ہوئے اور 1973 تک بحیثیت پرنسپل کالج سے وابستہ رہے۔ حکیم شکیل احمد شمسی 1969 میں کالج کے آنریری سکریٹری اور 1973 میں صدر مقرر ہوئے۔

ابتداً تکمیل الطب میں ڈی آئی ایم کے نام سے ڈپلومہ سرٹیفکٹ دیا جاتا تھا۔ پھر چار سالہ نصاب شروع کر کے بی آئی ایم ایس کی ڈگری دی جانے لگی۔ کچھ دنوں بعد اس ڈگری کا نام تبدیل کر کے ایف ایم بی ایس کر دیا گیا۔ 1971 میں جب گورنر کے آرڈی ننس کے ذریعہ کانپور یونیورسٹی (موجودہ نام چھترپتی شاہو جی مہاراج یونیورسٹی، کانپور) سے اس کا الحاق ہوا اور یہاں ساڑھے پانچ سالہ کورس جاری ہوا تب سے بی یو ایم ایس کی ڈگری دی جا رہی ہے[8]۔ 2010 تک صوبہ کی دوسری طبی درسگاہوں کی طرح کالج کا الحاق کانپور کی مذکورہ یونیورسٹی سے تھا۔ تعلیمی میقات 2011-2012 سے یہ کالج لکھنؤ یونیورسٹی سے ملحق ہے۔

1962 میں حکیم عبداللطیف فلسفی مجلس منتظمہ کے صدر اور ان کے سمدھی خان بہادر شیخ اقبال علی ایڈوکیٹ آنریری سکریٹری مقرر ہوئے۔ کالج کی تاریخ میں اس عہدہ پر فائز ہونے والے وہ پہلے غیر طبیب شخص تھے۔ اس وقت حکیم شکیل احمد شمسی جو کالج کے پرنسپل تھے، 22/اکتوبر 1964 کو حکیم مظہر سبحان عثمانی کے نام لکھے ایک خط میں اس مسئلہ پر اپنے اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''اصل موقف یہ ہے کہ طبقۂ اطباء جو ایک غیر حکیم کو کسی طبی ادارہ کا سربراہ دیکھنے کا متحمل نہیں ہے اور علی گڑھ اس سلسلہ میں عملی نمونہ ہے۔ وہ ایک دوسرے ادارہ پر بالکل غیر فنی اجارہ داری کیوں برداشت کرے۔''[9]

حکیم شکیل احمد شمسی نے اپنے مکتوب میں جو سوال اٹھایا ہے وہ بالکل درست ہے۔ کسی طبی ادارہ میں غیر طبیب کی سربراہی کی مخالفت سب سے زیادہ خاندان عزیزی کی طرف سے ہو رہی تھی، انھوں نے ہمیشہ اس سلسلہ میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے طرز عمل کو ہدف تنقید بنایا۔ پھر انہی

لوگوں کے ذریعہ ایک غیر طبیب کو آنریری سکریٹری جیسے اہم منصب پر بٹھانا، قول و فعل کا واضح تضاد ہے۔ حکیم شکیل احمد شمسی کے مکتوب سے آنریری سکریٹری اور پرنسپل کے درمیان جاری کشمکش کا پتہ چلتا ہے۔ یہ مکتوب 1964 کا تحریر کردہ ہے، 1965 میں حکیم شکیل احمد شمسی پرنسپلی کے عہدہ سے مستعفی ہوگئے تھے۔ استعفیٰ دے کر پرنسپلی سے الگ ہوجانے سے کشمکش کی بابت شبہ کو تقویت ملتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک نہیں چل رہا تھا۔ اس قسم کے حالات کسی بھی ادارہ کے لئے بے حد نقصان دہ ہوتے ہیں۔

انتظامی نقائص اور مالی بحران کسی ادارہ کے لئے بے حد سنگین مسئلہ سمجھے جاتے ہیں اور تکمیل الطب کالج ان سے دوچار ہو چکا تھا۔ ان مسائل سے اساتذہ، طلبہ اور ملازمین سب میں بے چینی تھی، جو اس قدر بڑھی کہ اس کی صدائے بازگشت ایوان حکومت تک پہنچ گئی۔ 1973 میں کالج کے پرنسپل حکیم مسیح الزماں ندوی نے صوبہ کے گورنر اکبر علی خاں سے مل کر انہیں حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا اور کالج کے تحفظ کے لئے حکومتی مداخلت کی درخواست کی۔ جب اس بابت کالج انتظامیہ سے استفسار کیا گیا تو کوئی جواب نہیں ملا، حکومت نے جون 1979 میں لکھنؤ کے ضلع مجسٹریٹ کو کنٹرولر مقرر کر کے کالج کی تمام املاک اپنی تحویل میں لے لی اور عبوری طور پر سرکاری ایجنسی کے ذریعہ انتظام و انصرام کا بندوبست کر دیا۔ 1982 میں صوبائی اسمبلی میں بل پاس کر کے کالج کو صوبائی حکومت کے ادارہ کی حیثیت عطا کر دی۔ پروونشیلائزیشن کے بعد یہ کالج اسٹیٹ تکمیل الطب کالج اینڈ ہاسپٹل، لکھنؤ کے نام سے موسوم ہوا۔[10]

صوبائی تحویل میں آنے کے بعد کالج کی بقا اور تحفظ کا مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن تعلیمی ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ دن بدن یہ ماحول مزید خراب ہی ہوتا گیا، ایک وقت ایسا آیا کہ تعلیم و تدریس کے لئے یہاں کوئی ماحول ہی نہیں رہا۔ نہ اساتذہ کو پڑھانے سے دلچسپی رہی اور نہ طلبہ کو پڑھنے سے اور حکومت کو اس سے صرف اس قدر غرض تھی کہ وہ مسلمانوں کا ایک ادارہ سمجھ کر صرف جمہوری مصلحتوں کے تحت اسے جاری رکھے ہوئے تھی۔ گزشتہ چند برسوں سے یہاں ایک خوشگوار تبدیلی کی آہٹ محسوس ہو رہی ہے۔ تعلیمی ماحول کے فقدان کی ایک اہم وجہ اساتذہ کی کمی تھی۔ نئی تقرریوں اور کچھ صوبائی محکمۂ صحت میں مامور پوسٹ گریجویٹ میڈیکل آفیسروں کی عبوری

خدمت حاصل کر کے وقتی طور پر اس کمی کو پورا کرلیا گیا ہے۔ دھیرے دھیرے یہاں تعلیمی ماحول قائم ہونے کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اب یہ کالج نئے کیمپس میں منتقل ہوگیا ہے۔ چار ایکڑ کے رقبہ پر پھیلا یہ کیمپس بجنور روڈ پر بی آر امبیڈکر یونیورسٹی کے پاس واقع ہے۔ اس کی تعمیر اگست 2001 میں شروع ہوگئی تھی۔ اب کالج کی قدیم عمارت جھوائی ٹولہ میں صرف ہاسپٹل رہ گیا ہے۔ کالج کے بقیہ تعلیمی اور انتظامی شعبے نئے کیمپس میں منتقل ہوگئے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ تذکرۂ خاندان عزیزی مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، اشاعت دوم 2009، ص 109-112

2۔ ایضاً، ص 120

3۔ ایضاً، ص 121,125,126

4۔ خادم الاطباء، جلد 2، شمارہ 1، جنوری 1921، طبی پریس لکھنؤ، ص 6-7

5۔ خادم الاطباء، جلد 2، شمارہ 2، فروری 1921، طبی پریس لکھنؤ، ص 8

6۔ تذکرۂ خاندان عزیزی مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، اشاعت دوم 2009، ص 274

7۔ ایضاً، ص 280,291

8۔ تکمیل الطب کالج میگزین، 84-1983 (بحوالہ تکمیل الطب کالج۔ اسٹیٹ تکمیل الطب کالج از ڈاکٹر عبدالرؤف خاں)، ص 19

9۔ حکیم شکیل احمد شمسی۔ شخصیت اور خدمات مرتبہ حکیم عبدالرزاق، ناشر آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس۔ دہلی، 1987، ص 144

10۔ تکمیل الطب کالج میگزین، 84-1983، ص 19-20

منبع الطب کالج۔ لکھنؤ

خاندان رضا لکھنؤ کا ایک معروف طبی خانوادہ ہے۔ اس کے بانی حکیم علی رضا ہیں۔ اس خانوادہ نے یونانی مطب و معالجہ، طبی تعلیم اور تحریک کے فروغ میں نمایاں طور پر حصہ لیا ہے۔ حکیم حسین رضا خاں بن حکیم محمد حسن رضا خاں لکھنوی اس خاندان کے اہم فرد ہیں۔ وہ تقریباً 1859 میں پیدا ہوئے۔ شمس العلماء مولانا عبدالحق خیر آبادی، مولانا عبدالعلی خاں رام پوری اور لکھنؤ کے دوسرے اساتذہ سے درسیات کی تکمیل کے بعد اپنے والد حکیم محمد حسن رضا خاں سے طب کی تعلیم حاصل کی اور مطب و معالجہ میں لیاقت بہم پہنچائی۔ ان کے اندر تدریسی صلاحیت بہت اچھی تھی اور طلبہ کو مطمئن کرنے کا ان میں بڑا ملکہ تھا۔ 25/اپریل 1881 کو بعہد نواب کلب علی خاں بہادر رامپور میں ملازم ہوئے۔ یہ سلسلہ تقریباً 22 برس تک قائم رہا۔[1]

1902 میں ریاست رام پور سے ترک تعلق کر کے حکیم محمد حسین رضا لکھنؤ آئے، اس زمانہ میں یونانی طب کی تعلیمی تنظیم کا مسئلہ زوروں پر تھا۔ گرچہ لکھنؤ میں خاندان عزیزی کے ذریعہ تکمیل الطب کالج قائم ہو چکا تھا۔ لیکن طب کی تعلیمی ضرورت صرف تکمیل الطب سے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ مزید برآں لکھنؤ میں خاندان رضا کا اپنا ایک تشخص تھا اور ایک خانوادہ کے بطور اس کی انفرادی حیثیت تھی۔ اس کا تقاضہ تھا کہ خاندان عزیزی کی طرح یہ لوگ بھی طب کے اس اہم مسئلہ میں اپنا کردار پیش کرتے۔ ان داعیوں نے حکیم محمد حسین رضا کو اپنے خاندان کے پلیٹ فارم سے

طبی تعلیم کے اہتمام پر مجبور کیا۔ جنوری 1904 میں انھوں نے کٹرہ ابوتراب لکھنؤ میں منبع الطب کے نام سے ایک طبی درسگاہ شروع کی۔[2] سن قیام کے بارے میں اس عام رائے سے اختلاف کرتے ہوئے حکیم سید محمد حسان نگرامی لکھتے ہیں:

"یہاں حکیم صاحب نے اپنے ذاتی مکان کے ایک حصہ میں ایک طبی درسگاہ 1902 میں قائم کی۔ اگرچہ بعض تذکرہ نگاروں نے منبع الطب کے قیام کا سال 1904 لکھا ہے لیکن راقم سطور کو حکیم صاحب کے خاندانی ذخیرہ میں ملی متعدد دستاویزوں میں 1902 کی بات ملی ہے۔ اس کے علاوہ منبع الطب کے فارغین کی ڈائرکٹری میں ایک طالب علم حکیم سید عبادت حسین ساکن بلیا کے نام کے سامنے 1902 درج ہے۔ اسی طرح حکیم سید مرتضیٰ حسین کی سند میں 1904 دیکھا گیا ہے۔ اس سے بہرحال یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ کالج کا قیام 1902 میں ہوا تھا، ورنہ 1904 میں سال سند کیسے تحریر کیا جاتا۔"[3] منبع الطب کے سن قیام 1902 کے بارے میں حسان نگرامی نے جو رائے پیش کی ہے اس کی تائید دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔[4]

منبع الطب کے قیام کے بعد حکیم محمد حسین رضا اس کی تعمیر و ترقی میں بہت زیادہ کردار ادا نہیں کر سکے اس لئے کہ لکھنؤ میں کچھ ہی عرصہ قیام کے بعد وہ دوبارہ رام پور چلے گئے اور وہیں یکم ربیع الاول 1327ھ مطابق 24 رمارچ 1909 میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے حکیم ہادی رضا نے یہ وراثت سنبھالی اور بڑی لائقی سے اپنی ذمہ داری پوری کی۔ اس ادارہ کی تعمیر و ترقی دراصل انہی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ وہ 1918 میں رام پور کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ آئے اور یکسوئی سے کالج کی طرف متوجہ ہوئے اور کالج کے پرنسپل اور سکریٹری دونوں کی ذمہ داریاں سنبھالی۔ جب حکیم عبدالحمید سے اختلاف کی وجہ سے حکیم عبدالحلیم وائس پرنسپل اور انچارج شفاخانہ کے عہدوں سے مستعفی ہو کر تکمیل الطب سے علاحدہ ہو گئے تو حکیم ہادی رضا نے انہیں منبع الطب سے وابستگی کی دعوت دی اور پرنسپل کا عہدہ جو اب تک انہی کے پاس تھا حکیم عبدالحلیم کو پیش کر کے بدستور سکریٹری کے عہدہ پر فائز رہے۔ زندگی کے آخری ایام تک وہ بطور سکریٹری منبع الطب کی خدمت کرتے رہے۔ حکیم ہادی رضا کی دعوت پر حکیم عبدالحلیم نے 12 ردسمبر 1929 کو کالج کی ذمہ داری سنبھالی۔[5]

حکیم ہادی رضا کی سکریٹری شپ کا زمانہ کئی لحاظ سے یادگار ہے۔ ان کی کوششوں سے 1924 میں منبع الطب کا سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹریشن ہوا۔ 11/ مارچ 1925 کو اس طبی درسگاہ نے ترقی کر کے مدرسہ سے کالج کا درجہ حاصل کیا۔[6] رسالہ 'الطبیب' کا اجراء بھی ان کی سکریٹری شپ کے زمانہ کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس رسالہ کی حیثیت کالج کے آرگن کی تھی۔ اس کی اشاعت کا آغاز جون 1933 میں ہوا تھا۔ ملک میں طبی بیداری، طبی تحقیقات کی اشاعت، طبی موضوعات پر مباحثے، طب اور اطباء کے لئے جدوجہد وغیرہ اس رسالہ کے اہم مقاصد تھے۔[7]

اس زمانہ کے رسائل و جرائد میں شائع اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ منبع الطب کے کالج کا درجہ حاصل کر لینے کے بعد یہاں تعلیمی نظام کی مزید بہتری کے لئے اہم اقدامات کیے گئے۔ اس زمانہ میں حکیم ہادی رضا کی طرف سے ایک اعلانیہ شائع ہوا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ "اگست 1927 سے جدید انتظامات، قابل پروفیسروں اور نئے کورس کے ساتھ، جس کو بورڈ آف انڈین میڈیسن نے منظور کیا ہے، شروع ہوگا، جس میں خصوصیت سے علم سائنس، علم تشریح، علم الادویہ اور جراحی کی مکمل اور اعلیٰ تعلیم عملاً دی جائے گی۔"[8] اس سے حکیم ہادی رضا کی اصلاح پسند کوششوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

20/ جون 1943 کو حکیم ہادی رضا کے انتقال کے بعد مجلس انتظامیہ نے ان کے بڑے صاحبزادے حکیم صابر رضا کو جوائنٹ سکریٹری منتخب کیا اور حکیم عبدالحلیم کو ایک بار پھر پرنسپل شپ کی دعوت دی۔ حکیم صابر رضا اور حکیم عبدالحلیم نے کالج کی ترقی اور نظم و نسق کے سلسلہ میں کئی اقدامات کیے۔ ان کی کوششوں سے بورڈ آف انڈین میڈیسن سے کالج کا الحاق ہوا۔ منبع الطب کی تاریخ کے حوالہ سے ایک اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ 1944 میں طبیہ وہاجیہ کالج منبع الطب میں ضم ہوا۔ انضمام کی یہ تفصیل طبیہ وہاجیہ کے ذیل میں آئے گی۔ 1946 میں ایک اہم تبدیلی کے نتیجہ میں حکیم صابر رضا پرنسپل اور حکیم عبدالحلیم سکریٹری مقرر ہوئے۔[9]

کالج کے متعلق 1945 میں شائع ایک اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ منبع الطب میں پرائیویٹ امتحان کا بھی نظم تھا اور یہاں عربی اور اردو کی دو جماعتیں تھیں۔ دونوں کے فارغین کو الگ الگ سندیں دی جاتی تھیں۔[10]

جولائی 1926 میں منبع الطب پریس قائم کیا گیا تھا، اس کی آمدنی کالج کے لئے وقف تھی۔اس پریس سے کافی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔پریس کے قیام کا مقصد اس کے منافع سے کالج کی مالی حالت کو بہتر کرنا تھا۔[11]

منبع الطب کا تعلیمی وتدریسی سفر نصف صدی پر محیط ہے، یہ کالج 1951 تک جاری رہا۔

حوالہ جات

1۔ تذکرۂ کاملان رام پور، مؤلفہ حافظ احمد علی خاں شوق، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، اشاعت 1985، ص 105-104

2۔ تذکرۂ اطباء اودھ، مرتبہ پروفیسر حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی، ادارۂ ادبیات دلی، 2008، ص 254

3۔ جہان طب (تکمیل الطب کالج نمبر)، جلد 4، شمارہ 1 تا 2، جولائی۔ دسمبر 2002، ص 316-315

4۔ ہندوستان کے مشہور اطباء مرتبہ حکیم حافظ سید حبیب الرحمان، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 2000، ص 185

5۔ تذکرۂ خاندان عزیزی، مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، اشاعت دوم 2009، ص 323-322 اور 390

6۔ جہان طب (تکمیل الطب کالج نمبر)، جلد 4، شمارہ 1 تا 2، جولائی۔ دسمبر 2002، ص 318

7۔ اردو طبی رسائل وجرائد۔ برصغیر ہندوپاک میں، مولفہ حکیم وسیم احمد اعظمی، مطبع بھارت آفسیٹ پریس، دہلی، اشاعت نومبر 2010، ص 42

8۔ الحکیم، جلد 12، شمارہ 11، ستمبر 1927، ص 36

9۔ تذکرۂ خاندان عزیزی، مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، اشاعت دوم 2009، ص 324-323 اور 425

10۔ حکیم دکن، جلد 9، شمارہ 3، اپریل 1945، ص 30

11۔ جہان طب (تکمیل الطب کالج نمبر)، جلد 4، شمارہ 1 تا 2، جولائی۔ دسمبر 2002، ص 318

مدرسہ طبیہ وہاجیہ۔ لکھنؤ

ہندوستان میں علماء فرنگی محل نے علم کی جو شمع روشن کی تھی اس کی ضیاء پاشیوں سے اس ملک کا ایک بڑا خطہ منور ہوا اور اس سے علم کی ہزاروں قندیلیں روشن ہوئیں۔ علوم اسلامیہ کی طرح اس خاندان کے کئی افراد نے طب و حکمت میں بھی امتیاز پیدا کیا تھا۔ مگر طبی خدمات کے حوالہ سے اس خاندان کا تذکرہ کم ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں لکھنؤ میں طبی تعلیم کی تنظیم کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس میں اس خانوادہ کا بھی اہم حصہ ہے۔ اس کے ایک فرزند حکیم وہاج الحق فرنگی محلی نے 1903 میں مدرسہ طبیہ وہاجیہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ جس سے سیکڑوں شائقین طب نے استفادہ کیا۔ اس کے ذریعہ طبی تعلیم اور مطب و معالجہ کی روایت کو جو فروغ حاصل ہوا وہ ہندوستان کی طبی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اس مدرسہ اور اس کے بانی کے بارے میں صاحب ''تذکرہ علماء فرنگی محل'' لکھتے ہیں:

''مولوی حکیم وہاج الحق بن ملا لمعان الحق بن مولانا برہان الحق نبیرۂ مولانا انوار الحق نے بعد حفظ قرآن، کتب درسیہ منقولات اپنے والد ماجد سے اور معقولات و ادب مولانا عین القضاۃ سے پڑھ کر فراغت حاصل فرمائی۔ اس کے بعد علم طب کی تحصیل کی جانب توجہ فرمائی اور حکیم محمد حسن دہلوی اور جناب حکیم عبدالعزیز دریابادی سے اولاً کتب طبیہ پڑھی اس کے بعد جھوائی ٹولہ کے نامور اطباء جناب حکیم عبدالعزیز اور جناب حکیم عبدالوحید صاحب سے تکمیل طب فرمائی، اس کے بعد مطب

شروع فرمایا اور ایک مدرسہ بنام طبیہ وہاجیہ اصول جدید پر قائم فرمایا جو کئی سال سے کالج کے درجہ پر ترقی دے دیا گیا ہے۔ اس مدرسہ کے متعلق دارالاقامہ اور ایک مفید شفاخانہ بھی حکیم صاحب نے افتتاح فرمایا ہے۔ جس سے غرباء کو مفت دوائیں تقسیم ہوتی ہیں۔ اعمال بالید یعنی سرجری کے کام کے لئے ایک ڈاکٹر موجود رہتا ہے۔ آپ کے صاحبزادے مولوی حکیم معراج الحق صاحب بھی اس میں کام کرتے ہیں۔ کامیابی کے ساتھ یہ کالج اور اس کے متعلق شفاخانہ ملک کی خدمت کر رہا ہے۔ کالج میں طب کی کتب عربی و فارسی میں پڑھائی جاتی ہیں اور اسناد حسب قواعد دیے جاتے ہیں۔ حکیم صاحب اور ان کے صاحبزادے کے علاوہ دیگر مدرسین بھی اس مدرسہ میں کام کرتے ہیں۔ اس کے متعلق ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے۔" 1

مدرسہ طبیہ وہاجیہ نے ترقی کر کے غالباً 1924 میں کالج کی شکل اختیار کی۔ حکیم جعفر محمد صدر الافاضل، حکیم سید قمر علی قمر لکھنوی، حکیم حافظ عبدالولی، حکیم احمد حسن، حکیم سید مظفر حسین، حکیم سید علی آشفتہ اس کے اساتذہ میں تھے۔ حکیم سید بشیر احمد 1927 سے 1937 تک یہاں پرنسپل رہے۔

1926 میں مدرسہ طبیہ وہاجیہ کی طرف سے ہمدردان طب سے مالی تعاون کی اپیل کی گئی تھی تا کہ دواخانہ، شفاخانہ، دارالاقامہ اور تعلیم گاہ کے مصارف کا انتظام اور کالج کے دوسرے منصوبوں کی تکمیل کا بندوبست ہو سکے، اس اپیل میں دوسرے کئی امور کی طرف اہل خیر کو متوجہ کرنے کے ساتھ مالی دشواریوں کی وجہ سے سرجری اور جدید فنون کی تعلیم اور جزء عملی میں پیش آنے والی مشکلات کا خاص طور پر ذکر تھا۔ یہ اپیل اساتذہ اور مجلس منتظمہ کے درج ذیل اصحاب کی طرف کی گئی تھی۔ 2

میر احمد حسین رضوی	میونسپل کمشنر و آنریری مجسٹریٹ	ممبر کالج
حافظ محمد حسن	" "	ممبر کالج
حکیم سید احمد حسن		پروفیسر کالج
حکیم جعفر محمد صدر الافاضل		پروفیسر کالج
حکیم سید علی آشفتہ		پروفیسر کالج

حکیم سید قمر علی قمر لکھنوی		پروفیسر کالج
حکیم حافظ عبدالولی		پروفیسر سرجری
حکیم مہدی حسین	نبیرہ حکیم نبا صاحب مرحوم	منیجر شفاخانہ وہاجیہ کالج
حاجی شیخ محمد کامل تاجر		ممبر کالج
حکیم محمد وہاج الحق		سکریٹری و پرنسپل، طبیہ وہاجیہ کالج
حکیم معراج الحق		نائب سکریٹری، طبیہ وہاجیہ کالج

کالج کا درجہ حاصل کرنے کے بعد 1925 میں وہاجیہ طبیہ کالج، لکھنؤ میں منعقد سالانہ امتحان میں درج ذیل طلبہ نے کامیابی حاصل کی تھی۔[3]

درجۂ اعلیٰ

1۔عطا کریم، گیا 2۔شمس الہدیٰ، اعظم گڑھ 3۔حامد حسین، دھام پور 4۔مسیح الزماں سہسرام 5۔محمد شفیع، پورنیہ 6۔ابوالخیر، مونگیر 7۔محمد فاروق، اعظم گڑھ 8۔انوار احمد، شاہجہاں پور 9۔بشیر احمد، الٰہ آباد 10۔محمد میاں، پنجاب 11۔یتیم الدین، سہسرام 12۔محمد بدیع الزماں، بنگال 13۔احمد حسن، دربھنگہ 14۔مظفر الدین، مونگیر 15۔ہاشم علی، چھپرہ 16۔محمد رئیس، پلامو 17۔شیخ فضل الرحیم، دھام پور 18۔عبدالجبار، رائے بریلی 19۔عبدالغفار، الٰہ آباد 20۔سراج الدین، جونپور 21۔خواجہ حسن شاہ، نیپال 22۔محمد کبیر الدین، مونگیر 23۔محمد ادریس، آرہ 24۔زین الحسن، صفی پور

درجۂ دوم

1۔خلیل احمد، بارہ بنکی 2۔معراج الحق، لکھنؤ 3۔عبدالغفار، بدایوں 4۔عبدالمجید، گیا 5۔آل عباس، فرخ آباد 6۔منیر الدین، آرہ 7۔حبیب اللہ، اعظم گڑھ 8۔محمد شعیب احمد، اجمیر 9۔مصباح اللہ، پشاور 10۔محمد خورشید، دربھنگہ 11۔محمد یعقوب، مونگیر

درجۂ سوم

1۔محمد فیاض الحسن، فتح پور 2۔نعیم الدین، سہسرام 3۔نور الزماں، خوشاب 4۔ابوظفر، مظفر پور 5۔حبیب الرحمٰن، شہرگا 6۔محمد شریف، جونپور 7۔علی حسن، لکھنؤ 8۔ابوالخیر، گیا 9۔محمد زاہد، بلند شہر

1925 کے اس سالانہ امتحان میں حکیم سید احمد حسن، حکیم مرزا جعفر محمد صدر الافاضل، حکیم عنایت اللہ اور حکیم محمد وہاج الحق ممتحن تھے۔ اس امتحان میں شریک طلبہ کے ناموں کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تعلیم حاصل کرنے والے بیشتر طلبہ بیرونی تھے، مقامی طلبہ کی تعداد برائے نام تھی۔ یہاں اتر پردیش کے علاوہ بہار، بنگال، پنجاب، راجستھان، نیپال اور پشاور تک کے طلبہ زیر تعلیم تھے۔ اس سے کالج کی ملک گیر شہرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ وہاجیہ طبیہ کالج مالی مشکلات سے دوچار تھا، لکھنؤ میں اس کا ایک معاصر کالج، منبع الطب تھا گرچہ اس کے حالات نسبتاً بہتر تھے مگر بہت اچھے بھی نہیں تھے۔ ان دونوں کو ملا کر ایک بہتر طبی درسگاہ کی شکل دی جاسکتی تھی۔ چنانچہ 1943 میں حکیم عبدالحلیم نے منبع الطب کا دوبارہ پرنسپل بننے کے بعد اس سلسلہ میں کوشش کی اور وہ کامیاب بھی ہوئے۔ ان کی مساعی سے 1944 میں وہاجیہ طبیہ کالج منبع الطب میں ضم ہوگیا۔ انضمام کے بعد اس کا نیا نام طبیہ وہاجیہ کالج ملحق بہ منبع الطب قرار پایا۔ حکیم عبدالحلیم متحدہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے اور وہاجیہ کا تمام سامان، فرنیچر اور کتب وغیرہ منبع الطب میں منتقل ہوگئیں۔ 1946 میں حکیم عبدالحلیم متحدہ کالج کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ 1951 میں کالج بند ہونے تک وہ اس کے سکریٹری رہے۔4

اس کالج کی تاریخ سے علماء فرنگی محل کے ایک نئے کردار کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کو طبی رونق عطا کرنے میں خاندان عزیزی کے علاوہ دوسرے خانوادوں کا بھی حصہ ہے اور لکھنؤ کو طبی مرکز کا درجہ دلانے میں مدرسہ طبیہ وہاجیہ نے موثر رول ادا کیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ تذکرہ علماء فرنگی محل، مؤلفہ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، غیر مورخ، ص 200

2۔ حامی الصحت، لاہور، جلد 5، شمارہ 3، جنوری 1926، ص 10-9

3۔ ایضاً، ص 11

4۔ تذکرۂ خاندان عزیزی، مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، اشاعت دوم 2009، ص 324-323

اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج۔ الٰہ آباد

طب کے تحفظ اور طبی تعلیم کی تنظیم کے سلسلہ میں انیسویں صدی کا آخری اور بیسویں صدی کا ابتدائی عہد خاص اہمیت کا حامل ہے۔ درسگاہوں کی شکل میں تعلیم کو منظم کرنے اور اسے معاصر رویوں کے مطابق بنانے کا جو کام اس زمانہ میں انجام پایا ہے وہ طبی تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ 1857 کے انقلاب سے پیدا ہونے والے حالات نے دیسی امور کی حفاظت کے لئے ہندوستانیوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ طب کے تحفظ کے لئے تعلیمی تنظیم کی ضرورت کا احساس اسی سلسلہ کا ایک حصہ ہے۔ اسے محسوس کرنے والوں میں ایک اہم نام حکیم احمد حسین عثمانی (1933-1859) کا ہے۔ انھوں نے اس حاجت کے تدارک کے لئے ''الکلیۃ الطبیہ'' کے نام سے علم طب کی جو شمع روشن کی تھی، اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج کی شکل میں اس کی فیض رسانیاں آج بھی جاری ہیں۔ انھوں نے اسے 1904 میں اپنے مکان (واقع سبزی منڈی الٰہ آباد) کے ایک حصہ میں شروع کیا تھا۔

الکلیۃ الطبیہ کا نصاب چار سال پر مشتمل تھا۔ عربی اور اردو کی دو الگ الگ جماعتیں قائم تھیں۔ عربی نصاب کے فارغین کو ماہر طب و جراحت اور اردو جماعت کے طلبہ کو معتمد الطب و الجراحت کی سند دی جاتی تھی۔ یہاں جمعیۃ النقبہ کے نام سے ایک علیحدہ شعبہ تھا، امتحانات سے متعلق تمام امور اسی کے ذمہ تھے۔ [1]

الکلیۃ الطبیہ نے بہت کم عرصہ میں ایک معتبر ادارہ کی حیثیت سے علمی دنیا میں جگہ بنالی تھی۔ 1912 میں مہاراجہ آف ریواونیکٹ رمن سنگھ نے اسے دیکھ کر جس طرح کے توصیفی کلمات کہے تھے، اس سے اس کی ترقیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ حالانکہ اس وقت اس کی کل طبعی عمر محض آٹھ برس تھی، 1914 تک اس کا دائرہ اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ موجودہ جگہ کم پڑنے لگی۔ چنانچہ اسے محلہ ہی کے ایک نسبتاً کشادہ مکان میں منتقل کرنا پڑا۔[2]

حکیم احمد حسین عثمانی نے 1925 میں ایک سوسائٹی تشکیل کر کے اس درسگاہ کے تمام انتظامی امور اس کے حوالے کردیئے تھے۔ انھوں نے یہ درسگاہ فنی خدمت اور ملت کی تعلیمی ضرورت کے لئے قائم کی تھی۔ اس لئے انھوں نے حسب سابق طلبہ سے فیس نہ لینے اور ادارہ کے اقلیتی کردار کی حفاظت کا سوسائٹی کو بھی مکلف بنایا۔[3]

1927 میں بورڈ آف انڈین میڈیسن یوپی نے الکلیۃ الطبیہ کا معائنہ کر کے بورڈ سے اس کے الحاق کی سفارش کی، اس کے بعد یہ طبی درسگاہ یونانی میڈیکل اسکول، الہ آباد کے نام سے موسوم ہوئی۔ اب اس کا دائرہ اتنا بڑھ چکا تھا کہ اسے محلہ ہمت گنج کی ایک وسیع عمارت میں منتقل کرنا پڑا۔ اب تک یہ اسکول عارضی بندوبست کے تحت کرایہ کے مکانوں میں چل رہا تھا۔ لہٰذا تعمیرات کا انتظام ناگزیر ہوگیا۔ اس تقاضہ کے پیش نظر بانیٔ درسگاہ نے محلہ ہمت گنج میں ایک وسیع قطعۂ آراضی خرید کر 1932 میں اسکول کی پہلی عمارت 'بیت البیان' کا سنگ بنیاد رکھا۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں نے اس سلسلہ کو مزید وسعت دی، نتیجتاً تعمیرات کے لحاظ سے یہ ادارہ مستحکم بنیادوں پر کھڑا ہوگیا۔ حکیم احمد حسین نے 30 رجنوری 1933 کو وفات پائی۔ انہیں تقریباً 29 برس اس طبی اسکول کی تعمیر و ترقی کا موقع ملا۔ اس عرصہ میں انھوں نے تعلیمی اور انتظامی لحاظ سے اسے معیاری اور مستحکم صورت عطا کردی تھی۔ ان کے جانشینوں نے تعمیری ضرورتیں پوری کر کے اسے جامع شکل دے دی۔

بانی کالج کے سامنے مدرسہ طبیہ دہلی اور تکمیل الطب لکھنؤ کی صورت میں تعلیم کے دو ماڈل تھے۔ انھوں نے اپنے ادارہ کے لئے جو طرز تعلیم پسند کیا، وہ دہلی اسکول کے مماثل تھا۔ یہاں انھوں نے مدرسہ طبیہ دہلی کے نہج پر نصاب میں طبی مضامین کے متوازی جدید مضامین شامل کئے

تھے۔لیکن وہ اس باب میں محتاط رویہ کے قائل تھے۔ان کا خیال تھا کہ احتیاط سے کام نہ لینے سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوسکتا ہے۔جدید طب سے استفادہ کے لئے،اس کی تعلیم کی حمایت کے باوجود وہ نصاب میں جدید مضامین کے غلبہ کے مخالف تھے۔جب بورڈ آف انڈین میڈیسن یوپی کے نصاب میں جدید مضامین کا حصہ یونانی مضامین سے زیادہ ہوگیا تو اس بات پر انھوں سخت تشویش کا اظہار کیا تھا۔[4] اپنے زمانہ میں یونانی میڈیکل اسکول جدید فکر کا حامل ادارہ تھا مگر اس کی جدت پسندی میں غلو نہیں تھا۔میانہ روی کے ساتھ جدیدیت کی حمایت معاصر طبی دنیا میں اس اسکول کا ایک اہم امتیاز تھا۔اس کی اس خصوصیت کا اعتراف کئی اصحاب فکر نے کیا ہے۔1924 میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے اسکول کا معائنہ کرنے کے بعد اطمینان کا اظہار کیا تھا۔[5]

بانی درسگاہ کی وفات کے بعد ان کے صاجزادگان نے ادارہ جاتی ذمہ داری سنبھالی۔ شفاء الملک حکیم احمد عثمانی(1896-1962) سکریٹری اور حکیم محمد صفوان عثمانی(1902-1952) پرنسپل مقرر ہوئے۔دونوں نے صحیح معنوں میں خلف رشید ہونے کا ثبوت دیا اور اپنے والد کے باقی منصوبوں کو پورا کرنے کا اہتمام کیا۔تعمیرات کے بیشتر منصوبے انہیں کے زمانہ میں مکمل ہوئے۔ بیت البنیان کی تکمیل کے علاوہ بیت الایقان(1935)، بیت التبیان(1939)، بیت الصفوان (1942)، ری پبلک ڈے میموریل ہسپتال(1950) کے ذریعہ تعمیرات کے لحاظ سے ادارہ کو مستحکم صورت میں لا کھڑا کیا۔اب یہ ہر اعتبار سے کالج کا درجہ پانے کا مستحق تھا۔بورڈ آف انڈین میڈیسن یوپی نے 1942 میں یونانی میڈیکل اسکول الٰہ آباد کو کالج کا درجہ عطا کیا۔تب سے یہ اسکول کے بجائے یونانی میڈیکل کالج الہ آباد کے نام سے موسوم ہے۔

1950 میں حکیم حماد عثمانی(1928-2000) بطور کارگزار پرنسپل، کالج سے وابستہ ہوئے۔ 1952 میں انھوں نے اس عہدہ پر مستقل حیثیت میں کام کرنا شروع کیا۔وہ یونانی اور ایلوپیتھی دونوں طریقۂ علاج کے ماہر تھے۔ انھوں نے یونانی میڈیکل اسکول الٰہ آباد سے معتمد الطب اور ڈھاکہ میڈیکل کالج سے LMF کیا تھا۔دونوں طریقۂ علاج پر دسترس کے باعث وہ ان کے محاسن ومعایب کے ساتھ اصلاح طلب پہلوؤں سے بھی واقف تھے۔انہیں اس امر سے بھی آگاہی تھی کہ ان دونوں طبوں کی خوبیوں سے کس طرح مستفید ہوا جاسکتا ہے۔ان

صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر انھوں نے کالج کے انتظامی اور تعلیمی شعبوں میں اصلاح اور تدریسی نظام کی تجدید اور بہتری کے لئے جو کام کیا ہے، وہ اس ادارہ کی تاریخ کا یادگار واقعہ ہے۔ ان کے زمانہ پرنسپلی میں شعبہ صیدلہ اور ہسپتال کے نظام میں کافی بہتری آئی۔ انھوں نے جدید مضامین جیسے تشریح، منافع الاعضاء، میڈیسن، فارماکولوجی، جراحت، پیتھالوجی، حفظان صحت، طب القانون وعلم سموم خود پڑھانے شروع کئے۔ ایک طبی درسگاہ کے طلبہ کو یہ مضامین کتنی مقدار میں اور کس طرح پڑھائے جائیں وہ اسے بہتر طور پر جانتے تھے۔ انھوں نے ان مضامین کی تدریس میں اسے برت کر طبی درسگاہوں میں جدید مضامین کی تعلیم کا ایک نیا اسلوب پیش کیا۔ خالص مغربی طب اور خالص یونانی طب، ان دو انتہاؤں کے درمیان اعتدال کی راہ کس طرح پیدا ہوسکتی ہے، یونانی میڈیکل کالج الہ آباد نے اس کا عمدہ نمونہ پیش کیا۔

حکیم حماد عثمانی کے زمانہ پرنسپلی کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے کالج کیمپس میں سی سی آر یو ایم، نئی دہلی کے کلینیکل ریسرچ یونٹ کے لئے جگہ فراہم کر کے الہ آباد کی عوام کو کونسل کے صحتی پروگراموں سے مستفید ہونے اور اس کی معالجاتی تحقیق سے جڑنے کا موقع فراہم کیا۔

حکیم حماد عثمانی نے اپنے عہد پرنسپلی میں معالجات اور ادویہ میں ایم ڈی شروع کرنے کی ایک اسکیم مرتب کی تھی۔ کانپور یونیورسٹی نے اسے منظوری بھی دے دی تھی، مگر ڈائرکٹوریٹ کے افسران کی سرد مہری کی وجہ سے یہ منصوبہ عملی صورت اختیار نہیں کرسکا۔ اس کالج کے ایک سابق طالب علم حکیم شمس الآفاق جو وزارت صحت، حکومت ہند میں ڈپٹی ایڈوائزر (یونانی) تھے، ان کی کوششوں سے 1997 میں یونانی میڈیکل کالج الہ آباد میں معالجات اور تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں کلیات کے لئے پوسٹ گریجویٹ کورس کی منظوری مل گئی تھی۔ اس مقصد کے لئے وزارت صحت نے پانچ لاکھ روپے بھی منظور کر دیئے تھے، مگر بوجوہ یہ سلسلہ شروع نہیں ہو پایا۔[6]

یہ کالج 1973 سے کانپور یونیورسٹی سے ملحق ہے۔ اس کے ذریعہ داخلہ، تعلیم اور تقسیم اسناد وغیرہ کے کام انجام پارہے ہیں۔ 1982 میں اسمبلی میں منظور ایکٹ کے ذریعہ صوبائی حکومت نے پرائیویٹ میڈیکل ایجوکیشن پر پابندی عائد کر کے تکمیل الطب کالج لکھنؤ کی طرح

یونانی میڈیکل کالج الہ آباد کو اپنی تحویل میں لے لیا۔حکومت کے اس اقدام کے خلاف خاندان عثمانی نے کافی احتجاج کیا لیکن یہ بے سود ثابت ہوا۔حکومت کی تحویل کا یونانی میڈیکل کالج الہ آباد پر منفی اثر پڑا اور اس کی رفتار ترقی معکوس ہوگئی۔اس کالج کے امتیازات کا اصل زمانہ پرونشیلائزیشن سے پہلے کا پیریڈ ہے۔صوبائی حکومت کی ماتحتی میں آکر اس کا بھی حشر وہی ہوا جو اکثر سرکاری اداروں میں نظر آتا ہے۔

حکیم حماد عثمانی 20 اپریل 1988 کو کالج کی 38 سالہ ملازمت کے بعد سبکدوش ہوئے۔ان کے بعد حکیم عطاء الرحمٰن جعفری، حکیم احتشام الحق قریشی، حکیم سید فاروق رضوی، حکیم مزت عثمانی، حکیم محمد شبیر حسین اور حکیم غلام جیلانی پرنسپل ہوئے۔پروفیسر حکیم سعد عثمانی کالج سے وابستہ بانی خاندان کے آخری فرد ہیں۔جون 2011 میں وہ کالج کی ملازمت سے پرنسپل اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔علمی واخلاقی ہر دولحاظ سے وہ خاندانی روایتوں کے امین ہیں۔وہ خاندان عثمانی الہ آباد کی چوتھی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ہندوستان میں طبی خانوادوں کے ذریعہ کئی درسگاہیں قائم ہوئیں۔کچھ امتداد وقت کی نذر ہوگئیں، جو محفوظ ہیں ان میں ایک اہم نام اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج، الہ آباد کا ہے۔اس کا ایک بڑا امتیاز یہ بھی ہے کہ اسے بانی درسگاہ اور ان کے خاندان کی سرپرستی میں سب سے زیادہ لمبے عرصہ تک رہنے کا موقع ملا ہے۔1904 سے 2011 تک بانی خاندان کے افراد اس سے وابستہ رہے ہیں۔

الہ آباد اتر پردیش کا نہایت اہم اور تاریخی شہر ہے۔اس کی اہمیت کے کئی پہلو ہیں۔مذہبی تقدس اور سیاسی اہمیت کے علاوہ اسے علمی مرکز کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ان سب کے ساتھ اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج الہ آباد کی وجہ سے طبی تعلیم کے مرکز کے بطور بھی اس کی شہرت ہے۔اس طرح یہ کالج اس تاریخی شہر کے امتیازات میں اضافہ کا باعث ہے۔اس کالج کی ترقی وبقا حکومت کی دہری ذمہ داری بن جاتی ہے۔اس لئے کہ یہ کالج ایک گراں قدر طبی ورثہ کے ساتھ الہ آباد کے تاریخی امتیازات کا بھی حصہ ہے۔

حوالہ جات

1۔ تذکرۂ خاندان عثمانی، ڈاکٹر سعد عثمانی، عثمانیہ اکیڈمی الہ آباد، 1987، ص 26-25

2۔ ایضاً، ص 26

3۔ ایضاً، ص 28

4۔ ایضاً، ص 222-209

5۔ ایضاً، ص 27

6۔ جہان طب (یونانی میڈیکل کالج الہ آباد نمبر)، جلد 8، شمارہ 3، جنوری۔ مارچ 2007، ص 109، 110، 141

مدرسہ طبیہ۔ لکھنؤ

یہ مدرسہ لکھنؤ میں وکٹوریہ اسٹریٹ پر مرزا محمد علی خاں کے مکان پر واقع تھا۔ خان بہادر نظیر حسن مدرسہ طبیہ لکھنؤ کے آنریری سکریٹری اور سید محمد نصیر سکریٹری تھے۔ حکیم منے آغا، حکیم مظفر حسین، حکیم سید محمد تقی، حکیم سید علی آشفتہ اور حکیم ننھے آغا اس مدرسہ کے اعزازی مدرس تھے۔ بانیان نے مدرسہ طبیہ سے ملحق ایک خیراتی دواخانہ کی اسکیم تیار کی تھی اسے بروئے کار لانے کے لئے ''بڑا دواخانہ'' کے نام سے نظیر آباد میں ایک تجارتی دواخانہ قائم کیا تھا۔ یکم اکتوبر 1921 کو اس دواخانہ کے مالکان نے اس سے ہونے والے نفع کو ایک رزولیوشن کے ذریعہ خیراتی دواخانہ کے لئے مختص کر دیا تھا۔ اس مدرسہ کے تقسیم اسناد کا دوسرا جلسہ 25رفروری 1923 کو منعقد ہوا تھا۔[1] اس لئے اس کا سنہ قیام 1918 یا 1919 ہونا چاہئے۔ اس کے قیام کو حکیم عبدالحلیم لکھنوی سے منسوب کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔ حکیم عبدالحلیم جو تکمیل الطب کے وائس پرنسپل اور انچارج شفاخانہ تھے، وہ اپنے بھائی اور کالج کے سکریٹری شفاء الملک حکیم عبدالحمید سے اختلاف کی وجہ سے ان عہدوں سے مستعفی ہو کر تکمیل الطب سے الگ ہو گئے تھے۔ ان کے ساتھ کالج کے ایک استاد حکیم منے آغا اور آخری سال کے اکیس طلبہ بھی علاحدہ ہوئے تھے۔ ان طلبہ نے باقی تعلیم مدرسہ طبیہ سے پوری کر کے سند حاصل کی تھی۔ ایک خیال کے مطابق یہ مدرسہ بطور خاص انہی طلبہ کے لئے قائم ہوا تھا لہٰذا ان طلبہ کو تعلیم اور سند دے کر ایک سال کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ یہ بات صحیح

نہیں ہے، اس لئے کہ حکیم عبدالحلیم 12 ردسمبر 1929 کو تکمیل الطب سے مستعفی ہو کر حکیم ہادی رضا کی دعوت پر منبع الطب سے وابستہ ہوئے تھے۔[2] لہٰذا ان کے ہاتھوں مدرسہ طبیہ کا قیام خارج از امکان ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ حکیم عبدالحلیم کے استعفیٰ سے تقریباً ایک دہائی پہلے ہی یہ مدرسہ وجود میں آچکا تھا۔

حوالہ جات

1۔ تذکرۂ اطباء اودھ، مؤلفہ حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی، ادارۂ ادبیات، دلی، 2008، ص 91-90

2۔ تذکرۂ خاندان عزیزی، مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، اشاعت دوم 2009، ص 323-322

اجمل خاں طبیہ کالج۔ علی گڑھ

ہندوستان کی طبی درسگاہوں میں اجمل خاں طبیہ کالج کا ایک منفرد مقام ہے۔ 1925 میں اتر پردیش حکومت نے دیسی طبوں کی تعلیمی تنظیم کے لئے بورڈ آف انڈین میڈیسن، یوپی قائم کیا۔ پھر اس سلسلہ کی توسیع کے لئے اسکول اور کالج سطح کے یونانی اور آیوروید کے ادارے قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت یونانی کالج کے لئے جگہ کے تعین کو لے کر ملک بھر کے طبیبوں نے دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا۔ طویل بحث ومباحثہ کے بعد اطبا کی اکثریت اس بات پر متفق ہوئی تھی کہ جس طرح آیوروید کالج، بنارس ہندو یونیورسٹی کے تحت قائم ہوا ہے، اسی طرح یونانی کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر نگرانی ہو۔ اس سے کالج کا مستقبل محفوظ ہونے کے ساتھ اس کی ترقی کے زیادہ امکان محسوس کئے جارہے تھے۔ یہ سوچ واقعی درست تھی۔

اس کالج کے قیام کے ذریعہ دلی اور لکھنؤ کے علاوہ یونانی طب کی ایک تیسری مرکزیت وجود میں آئی، جس نے دلی اور لکھنؤ کے عمدہ نظریاتی اوصاف کو اپنے اندر سمو کر قدامت اور جدیدیت کی ایک معتدل صورت پیش کی اور قدیم وجدید نقطۂ نظر کی انتہائی صورتوں کے درمیان اعتدال کی روش کو اپنا مسلک قرار دیا۔ یہ وصف اس درسگاہ کا سب سے ممتاز پہلو ہے۔ اس امتیاز کے ساتھ یہ کالج پون صدی سے زائد عرصہ سے طبی دنیا میں قیادت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

8/جنوری 1926 کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اس کالج کے قیام سے متعلق ایک کمیٹی

تشکیل دی، اس نے مختلف پہلوؤں پر غور وخوض کے بعد اسے یونیورسٹی کے تحت قائم کرنے کی سفارش کی، جو منظور ہوئی اور 1927 میں طبیہ کالج کا قیام عمل میں آیا۔ یہ ہندوستان میں کسی یونیورسٹی کے تحت قائم ہونے والا پہلا کالج تھا۔[1]

ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ (ایم ڈی برلن، بی ایس پنجاب، ممبر مجلس ماہرین امراض چشم جرمنی) طبیہ کالج کے پہلے پرنسپل منتخب ہوئے۔ ان کا انتخاب دلی اور لکھنؤ کے ماہر اطباء پر مشتمل پینل نے کیا تھا۔ پرنسپل اور اساتذہ کے انتخاب کے بعد صاحب باغ (موجودہ سلیمان ہال) میں تعلیم شروع ہوئی۔[2] 1932 میں پانچ سالہ کورس پورا کر کے 14 طلبہ پر مشتمل پہلا بیچ فارغ ہوا جو انور علی، اصغر حسین، بشیر احمد، مفیض الدین، عبدالرشید، محمد علیم الدین، محمد انجم، محمد ادریس فاروقی، محمد الیاس اعظمی، محمد لقمان حیدر، مصطفیٰ احمد اعظمی، محمد سلیم الدین، سید محمد احمد خاں اور ضرغام علی خاں سلونی پر مشتمل تھا۔[3]

1947 تک طبیہ کالج علی گڑھ کے امتحانات واسناد وغیرہ کا تعلق بورڈ آف انڈین میڈیسن یوپی سے تھا اور DIMS کی سند دی جاتی تھی۔ 1947 میں جب یہ یونیورسٹی کی ماتحتی میں آیا تو ایک نئے نصاب کے مطابق تعلیم شروع ہوئی۔ اس کا پہلا بیچ 1952 میں فارغ ہوا جسے بیچلر آف یونانی طب اینڈ سرجری (BUTS) کی سند دی گئی۔ جو ملک میں یونانی کی پہلی ڈگری تھی۔ یہ ڈگری صرف دو سال دی گئی۔ 1949 میں اس کا نام بدل کر BUMS کر دیا گیا، جس کا پہلا بیچ 1954 میں نکلا تھا۔[4] 1965 میں اسے BUMMS کر دیا گیا لیکن 1970 سے پھر BUMS کی سند دی جانے لگی۔ 1979 میں اکیڈمک کونسل کی منظوری سے سی سی آئی ایم کے نصاب کا یہاں نفاذ ہوا۔

1949 میں ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ سبکدوش ہوئے۔ وہ تقریباً 22 برس پرنسپل کے عہدہ پر فائز رہے۔ ان کے بعد حکیم عبداللطیف فلسفی پرنسپل مقرر ہوئے۔ بطور پرنسپل ڈاکٹر بٹ اور حکیم فلسفی کے اس کالج پر گہرے اثرات ہیں۔ 3 ستمبر 1961 کو حکیم عبداللطیف فلسفی کی سبکدوشی کے بعد ڈاکٹر اسلام الحق انصاری پھر ڈاکٹر جمیل الرحمٰن پرنسپل منتخب ہوئے۔ 1968 میں اچانک ڈاکٹر جمیل الرحمٰن کی وفات کے بعد حکیم عبدالحسیب چند ماہ عارضی پرنسپل رہے۔ پھر یکم مارچ 1969 کو

باقاعدہ پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1972 میں یونیورسٹی نے ایک نئے ایکٹ کے تحت میڈیکل، انجینئرنگ اور طبیہ ان تینوں کالجوں کے پرنسپل کا عہدہ محض انتظامی قرار دے دیا اور درس وتدریس اور تعلیمی مسائل سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اس لئے حکیم عبدالحسیب پرنسپل شپ سے مستعفی ہوگئے۔[5] ان کی جگہ پروفیسر حکیم محمد طیب کا تقرر ہوا۔ 1979 میں پروفیسر علی محمد خسرو کے زمانہ میں علم الادویہ میں پروفیسر منتخب ہونے کے بعد وہ اعزازی طور پر پرنسپل کے فرائض انجام دیتے رہے۔ نومبر 1984 سے اگست 1992 تک پروفیسر محمد قیام الدین پرنسپل رہے۔[6]

1967 میں حکیم اجمل خاں کے یوم پیدائش کے جشن صد سالہ کے موقع پر یونیورسٹی نے ان کی عظیم فنی خدمات کے اعتراف میں طبیہ کالج کو ان کے نام سے منسوب کرنے کا فیصلہ کیا۔ یونانی طب میں اعلیٰ تعلیم کے منصوبہ کے تحت 1972 میں شعبۂ علم الادویہ کا قیام عمل میں آیا۔ حکیم عبدالحسیب اس کے پہلے چیئرمین منتخب ہوئے۔ اس شعبہ کا محض یہی امتیاز نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ پہلی بار یونانی طب کی پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم شروع ہوئی، بلکہ اس سے کہیں بڑی بات یہ ہے کہ یہ شعبہ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ایک رول ماڈل ثابت ہوا اور تعلیم وتحقیق کے میدان میں اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ بیرون علی گڑھ کے علاوہ خود اس کالج کے دوسرے شعبوں میں جب پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم شروع ہوئی تو وہاں بھی اس کے اثرات محسوس کئے گئے۔ 1985 میں دو مزید شعبے قائم ہوئے اور ان میں ایم ڈی کی تعلیم شروع ہوئی۔ معالجات میں حکیم سید علی حیدر جعفری اور کلیات میں پروفیسر سید کمال الدین حسین ہمدانی صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ 1995 میں شعبۂ جراحت قائم ہوا۔ ڈاکٹر تاج الدین تاج شمسی اس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ شعبۂ جراحت میں 1997 سے MS کی تعلیم ہو رہی ہے۔ اسی سال شعبۂ حفظان صحت وطب سماجی کا قیام عمل میں آیا اور اس میں ایم ڈی شروع ہوئی۔ پروفیسر حکیم افضال احمد اس کے پہلے سربراہ مقرر ہوئے۔ 2000 میں شعبۂ تشریح ومنافع الاعضاء اور شعبۂ امراض نسواں واطفال قائم ہوئے۔ اول الذکر میں پروفیسر اقتدار الحسن زیدی اور ثانی الذکر میں پروفیسر قمر اختر کاظمی صدر شعبہ منتخب ہوئیں اور اسی سال شعبۂ امراض نسواں میں ایم ڈی کا آغاز ہوا۔ 2011 میں صیدلہ، علم الامراض، تشریح البدن، امراض جلد وزہرادویہ اور علاج بالتدبیر کے شعبے قائم ہوئے۔ ان میں بالترتیب پروفیسر

تاج الدین، پروفیسر ملک محمد وامق امین، حکیم عبیداللہ قاسمی، پروفیسر شگفتہ علیم اور پروفیسر محی الحق صدیقی صدور شعبہ منتخب ہوئے۔

ایک عرصہ تک یہ کالج فیکلٹی آف میڈیسن کے ماتحت تھا۔ کچھ دنوں حکیم عبداللطیف بھی مشترک فیکلٹی کے ڈین رہے۔ 1986 میں یونیورسٹی نے یونانی فیکلٹی کو مستقل درجہ عطا کیا۔ پروفیسر حکیم محمد طیب اس کے پہلے ڈین مقرر ہوئے۔ یونانی فیکلٹی کے علاحدہ قیام کے سلسلہ میں پروفیسر حکیم محمد طیب اور اس وقت کے پرووائس چانسلر پروفیسر خلیق احمد نظامی کا اہم کردار رہا ہے۔[6] دسمبر 1986 سے دسمبر 1988 تک پروفیسر حکیم محمد طیب ڈین رہے۔ ان کے بعد بالترتیب پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن (دسمبر 1988 تا دسمبر 1990)، پروفیسر محمد تاج الدین تاج شمسی (دسمبر 1990 تا جون 1991)، پروفیسر سید علی حیدر جعفری (جون 1991 تا جولائی 1993)، پروفیسر ابوبکر خاں (جولائی 1993 تا جولائی 1995)، پروفیسر انیس احمد انصاری (جولائی 1995 تا جولائی 1997)، پروفیسر نعیم احمد خاں (جولائی 1997 تا جنوری 1999)، پروفیسر سید مودود اشرف (جنوری 1999 تا ستمبر 2000)، پروفیسر نعیم احمد خاں دوسری بار (ستمبر 2000 تا مارچ 2001)، پروفیسر افضال احمد (مارچ 2001 تا مارچ 2003)، پروفیسر قمر اختر کاظمی (مارچ 2003 تا مارچ 2005)، پروفیسر خالد زماں خاں (مارچ 2005 تا مارچ 2007)، پروفیسر اقتدار الحسن زیدی (مارچ 2007 تا مارچ 2009)، پروفیسر تاج الدین (مارچ 2009 تا مارچ 2011)، پروفیسر شگفتہ علیم (مارچ 2011 تا مارچ 2013)، پروفیسر ابوبکر خاں (مارچ 2013 تا جنوری 2014) ڈین مقرر ہوئے، جنوری 2014 میں پروفیسر نعیم احمد خاں تیسری بار اس فیکلٹی کے ڈین بنے ہیں۔

کالج سے ملحق دواخانہ کا تجربہ سب سے پہلے حکیم اجمل خاں نے کیا تھا۔ مدرسہ طبیہ کے ساتھ "ہندوستانی دواخانہ" قائم کر کے انھوں نے ایک نئی شروعات کی تھی جو بے حد کامیاب رہی۔ اس تجربہ کو طبیہ کالج علی گڑھ میں بھی دہرایا گیا۔ یہاں اس کے قیام کا مقصد تھا کہ طلبہ کو دوا سازی سیکھنے کا موقع ملے، اس کی آمدنی سے ضرورت مند طلبہ کو مالی مدد دی جائے اور ہاسپٹل کے مریضوں کو مفت دوائیں فراہم کی جائیں۔ گویا اس دواخانہ کو یونانی طب کے تعلیمی و معالجاتی نظام کے فروغ کے ایک ذریعہ کے طور پر قائم کیا گیا تھا۔ قیام کے زمانہ میں کسی قدر یہ مقصود حاصل بھی

ہوئے۔ چنانچہ اس وقت دواشناسی اور دواسازی کی تربیت کے لئے تیسرے سال کے طلبہ کے ٹائم ٹیبل میں ایک پیریڈ دواخانہ کے لئے مختص ہوتا تھا۔ دواخانہ کے قیام کے وقت حکیم سید نورالعین حسن راغب چھتاری عارضی منیجر مقرر ہوئے تھے۔ پھر مستقل منیجر کی حیثیت سے حکیم محمد اسلم صدیقی کا تقرر ہوا۔ انھوں نے 15/مارچ 1951 کو چارج لیا، وہ تقریباً 28 برس اس عہدہ پر فائز رہے۔[7] 1979 میں ان کی سبکدوشی کے بعد سعادت علی صدیقی نے اس عہدہ کا چارج سنبھالا، وہ 1992 تک اس عہدہ پر مامور رہے۔ ان کی سبکدوشی کے ایک مختصر عرصہ کے بعد 1993 سے فروری 1999 تک عابد قدیر نے منیجر شپ کے فرائض انجام دیئے۔ مارچ 1999 سے کفیل احمد اس عہدہ پر فائز ہیں۔ 2008 میں ان کی کوششوں سے شعبۂ آیوش سے ادویات کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے ایک کروڑ پینتیس لاکھ انتالیس ہزار تین سو چھ روپے کی گرانٹ ملی تھی۔ ان کے زمانہ کا ایک بڑا کام یہ ہے کہ اس دواخانہ کی پیٹنٹ دواؤں کو نیشنل فارمولری آف یونانی میں شامل کرلیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کا چھٹا حصہ جو 2011 میں شائع ہوا ہے، اس دواخانہ کے نسخوں پر مشتمل ہے۔ یہ دواخانہ اپنی جن مصنوعات کے لئے شہرت رکھتا ہے، اس میں معتد بہ حصہ ان دواؤں کا ہے جن کے نسخوں کی تالیف وترتیب پروفیسر حکیم محمد طیب نے کی تھی۔ دماغین اس سلسلہ کا سب سے اہم نام ہے، جو ایک طرح سے دواخانہ کا برانڈ پروڈکٹ ہے اور دواخانہ کی آمدنی میں اس کا گراں قدر حصہ ہے۔

اپنے قیام کے وقت یہ دواخانہ طبیہ کالج سے متعلق تھا اور اس کی ماتحتی میں کام کررہا تھا۔ کالج سے دواخانہ کے تعلق کا اظہار اس کے نام سے بھی ہوتا ہے، گرچہ اب کالج سے دواخانہ کا تعلق برائے نام ہے اور اب اس سے وہ مقاصد بھی نہیں حاصل ہورہے ہیں جن کے لئے یہ قائم ہوا تھا۔ لیکن آج بھی یہ "دواخانہ طبیہ کالج" کے نام سے موسوم ہے۔ دراصل یہ نام اس کے قدیم تعلق کا مظہر ہے۔ گرچہ دواخانہ کا فیض کالج کو برائے نام پہنچ رہا ہے لیکن ایک دواساز ادارہ کے بطور اس نے جو ترقی کی ہے وہ بہرحال خوش آئند ہے۔ آج اس کا شمار قومی سطح کے یونانی دواخانوں میں ہے اور یہ یونیورسٹی کے لئے منفعت کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق دواخانہ کا تقریباً 35 کروڑ سے زیادہ روپیہ فکسڈ ڈپوزٹ کی شکل میں ہے۔ اس خطیر رقم

سے دواخانہ کو مزید ترقی دی جاسکتی ہے اور اس کے منافع سے طبی تعلیم و تحقیق کے بڑے کام انجام پاسکتے ہیں۔

اس کالج کا ایک ممتاز پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں مضمون کی تعلیم کے ساتھ قلمی مشق اور تصنیفی، تالیفی وصحافتی تربیت کا شروع سے اہتمام رہا ہے۔ تسلسل کے ساتھ اتنے لمبے عرصہ تک اور اس قدر مستحکم صورت میں یہ روایت کسی اور طبی درسگاہ میں نہیں ملتی۔ اپریل 1932 میں ''طبیہ کالج میگزین'' کے نام سے ایک رسالہ جاری ہوا تھا۔ ضرغام علی خاں سلونی (طالب علم سال پنجم) اس کے مدیر اور ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ (پرنسپل) نگراں تھے۔ اساتذہ میں حکیم عبداللطیف فلسفی، ڈاکٹر عبیداللہ انصاری (بی ایس سی، ایم بی بی ایس ممبئ)، حکیم عبداللہ خاں نصر، ڈاکٹر سید عنایت اللہ شاہ (ایم بی بی ایس) مجلس ادارت کے رکن تھے۔ وقفۂ اشاعت اور نام میں کسی قدر تبدیلیوں کے ساتھ یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔ ابتداء میں یہ سہ ماہی تھا، درمیانی عرصہ میں وقفۂ اشاعت مختلف رہا، اب یہ سالانہ مجلّہ کی صورت میں شائع ہوتا ہے۔ 1988 میں شعبۂ کلیات سے ایک رسالہ ''تجدید طب'' جاری ہوا تھا جو ایک شمارہ کے بعد بند ہوگیا۔ حکیم انیس احمد انصاری اس کے ایڈیٹر، حکیم فواد سعید شیرانی اور حکیم ابووارث جمیل جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ اسی سال شعبۂ معالجات سے ایک رسالہ ''معالج'' جاری ہوا، وہ بھی ایک شمارہ کے بعد بند ہوگیا۔ حکیم عبدالمنان اس کے ایڈیٹر اور حکیم برکت اللہ جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ پروفیسر خالد زماں خاں کی کوششوں سے ''یونی میڈ کلیات'' نام کا ایک ششماہی تحقیقی جریدہ 2005 سے شائع ہو رہا ہے۔ اس میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں مقالے شائع ہوتے ہیں۔ مشمولات اور معیار طباعت کے اعتبار سے یہ بڑا معیاری جریدہ ہے۔ پروفیسر خالد زماں خاں اس کے بانی مدیر اعلیٰ ہیں۔ حکیم فواد سعید شیرانی اور حکیم فاروق احمد ڈار بالترتیب مدیر اور شریک مدیر ہیں۔ اس فیکلٹی سے ''یونانی میڈیکس'' نام کا عالمی معیار کا تحقیقی جریدہ جولائی 2010 سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ انگریزی زبان کا ششماہی جریدہ ہے۔ اجراء کے وقت پروفیسر کنور محمد یوسف امین مدیر اور حکیم غفران احمد (ریڈر شعبۂ علم الادویہ) شریک مدیر ہیں۔ حکیم فاروق احمد ڈار اور حکیم عمار بن انور اس کے معاون مدیر تھے۔ جب کہ فیکلٹی کے ڈین اس کے مدیر اعلیٰ ہوتے ہیں۔ اس کالج میں مجلّوں، رسالوں اور جریدوں کی قدیم روایت سے انداز ہوتا ہے

کہ طلبہ واساتذہ کے تصنیفی وتالیفی ذوق کو بیدار کرنے کا یہاں شروع ہی سے اہتمام رہا ہے۔ دیگر کئی امتیازات کی طرح یہ پہلو بھی اس درسگاہ کا ایک اہم وصف ہے، جو اسے دوسری طبی درسگاہوں سے ممتاز کرتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ آئینہ تاریخ طب، مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، 2001، ص388

2۔ تہذیب الاخلاق (خصوصی شمارہ)، جلد 17، شمارہ 3، 4، مضمون نگار حکیم سید مودود اشرف، ادارہ تہذیب الاخلاق ونشانات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص 202-201

3۔ طبیہ کالج میگزین، جلد 1 شمارہ 2، بابت ماہ جولائی 1932، ص۔ ز

4۔ آئینہ تاریخ طب، مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، 2001، ص389

5۔ تذکرۂ خاندان عزیزی، مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، اشاعتِ دوم 2009، ص 411-410

6۔ تذکرۂ اطباء اودھ، مؤلفہ پروفیسر حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی، ادارۂ ادبیات دلی، 2008، ص350 اور 420

7۔ تذکرۂ اطباء عصر، مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، 2010، ص 172، 170

بھارت طبیہ کالج۔ سہارن پور

حکیم ناظر حسن شمیم (یکم جنوری 1901-13/اپریل 1990) اس کالج کے بانی اور مہتمم تھے۔ طب اور طبابت سے ان کے خاندان کا قدیم تعلق رہا ہے۔ ان کے اسلاف اور اخلاف میں کئی نسلوں کی طب سے وابستگی کی روایت ملتی ہے۔

حکیم ناظر حسن شمیم کے والد حکیم مفتی نورالحسن، دادا حکیم عبدالرزاق، پردادا حکیم مفتی عمر دراز طب اور مطب و معالجہ سے وابستہ رہے ہیں۔ حکیم ناظر حسن نے عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم، سہارن پور سے دینی علوم کی تحصیل کی، پھر اپنے والد حکیم نورالحسن سے طب کی چند کتابیں پڑھیں، اس کے بعد فن کی باضابطہ تعلیم کے لئے 1916 میں مدرسہ طبیہ دہلی میں داخل ہوئے، مگر علالت کی وجہ سے سلسلۂ تعلیم درمیان ہی میں منقطع ہوگیا۔ پھر بھوپندر طبیہ کالج پٹیالہ میں داخلہ لیا اور سند فراغت حاصل کی۔ یہاں تعلیم کی تکمیل کے بعد کالج کے ہاسپٹل میں بطور طبیب تین سال وابستہ رہے۔ پھر سہارن پور آکر بازار نخاسہ میں مطب و معالجہ شروع کیا۔ اس زمانہ میں طبی تعلیم کی تحریک زوروں پر تھی، حکیم ناظر نے اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے 1929 میں سہارن پور کے محلہ انصاریان میں بھارت طبیہ کالج کی بنیاد ڈال کر تعلیمی سلسلہ کا آغاز کیا۔ 1936 میں کالج کی ضرورتوں میں اضافہ کے بعد اسے گرودوارہ روڈ پر واقع ایک وسیع بلڈنگ میں منتقل کردیا گیا۔ ابتداً یہاں تین سالہ ڈپلومہ اور اسسٹنٹ حکیم (کمپاؤنڈری) کی تعلیم

ہوتی تھی۔ ان دونوں کورسز کے لئے انڈین میڈیسن بورڈ لکھنؤ نے منظوری دے رکھی تھی۔ 1969 میں مدت تعلیم میں ایک سال کا اضافہ کر کے چار سال کر دیا گیا۔ [2]

حکیم ناظر حسن کے محدود وسائل کے علاوہ کالج کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مالی مشکلات جیسے مسائل سے یہ ادارہ ہمیشہ دوچار رہا، مگر بانیان کی جدوجہد سے کسی نہ کسی صورت میں جاری رہا۔ اسی دوران ایک بے حد ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ سہارن پور میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا۔ 14/ جنوری 1967 کو فسادیوں نے کالج کی لائبریری، شفاخانہ اور دوسرے سازوسامان کو جلا کر راکھ کر دیا۔ صوبائی اور مرکزی حکومت کو اس واقعہ کی اطلاع دے کر کالج کی بازآبادکاری کے لئے درخواست کی گئی، مگر کوئی تعاون نہیں ملا۔ 19/ جنوری 1967 کو حکیم ناظر حسن نے محلہ شاہ ولایت (سہارن پور) کے اپنے ذاتی مکان میں طلبہ کی تعلیم کا انتظام کیا۔ [3]

ابھی یہ کالج اپنے بکھرے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا کہ 1982 میں صوبائی حکومت نے ڈپلومہ سطح کے تمام اداروں کو بند کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اس فیصلہ کے خلاف ذمہ داروں نے ہائی کورٹ سے رجوع کیا۔ بمشکل انہیں اسٹے آرڈر کی صورت میں تھوڑی سی راحت ملی۔ [4] اس عارضی راحت کے باوجود معاملہ عدلیہ کے زیر سماعت ہونے کے باعث کالج خوف وہراس کے سایہ میں تھا۔ اس غیر یقینی ماحول میں تعلیم وتدریس ضرور ہو رہی تھی مگر طلبہ، اساتذہ اور عوام کے اندر اس کے مستقبل کو لے کر کئی طرح کے سوالات تھے۔ اندیشوں کے اس ماحول میں تعلیم وتدریس اور تعمیر وترقی کا متاثر ہونا بدیہی تھا۔ لیکن انتظامیہ نے امید کا دامن نہیں چھوڑا اور جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس توقع پر کہ شاید عدالت سے انہیں مستقل اجازت مل جائے، انھوں نے داخلہ اور تعلیم کے ساتھ تعمیرات کا سلسلہ بھی قائم رکھا۔ 24/ مئی 1998 کو کالج کی نئی بلڈنگ کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ اس کی تاسیسی رسم کے موقع پر طاہر اشرفی (سابق چیئرمین، اتر پردیش مائنارٹی کمیشن) اور مسرور علی خاں (ایم پی) وغیرہ موجود تھے۔

تقریباً اسی برس تک یہاں تعلیم وتعلم کا سلسلہ رہا۔ اس مدت میں کئی نشیب وفراز اور مدوجزر آئے جن سے نکلنے کے لئے کالج کے ذمہ داروں نے کوشش کی لیکن 2008 میں عدلیہ نے سخت موقف اختیار کرتے ہوئے اسے بند کرنے کا قطعی حکم دے دیا۔ اس فیصلہ کے بعد کالج کو بند

کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ 1929 میں قائم یہ کالج 2008 میں بند ہو گیا۔ گرچہ کالج بند ہو چکا ہے، مگر اسے دوبارہ شروع کرنے کے لئے کالج کے ذمہ داروں کی کوششیں جاری ہیں۔ اس وقت سپریم کورٹ میں کالج کا کیس زیر سماعت ہے۔ بظاہر اب کوئی امید نہیں رہ گئی ہے، پھر بھی عدالت عظمیٰ کے فیصلہ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ نئے سرے سے کالج کھولنا اب اتنا مہنگا ہو چکا ہے کہ انتظامیہ کے لئے اتنے سرمایہ کا انتظام ناممکن ہے۔ اگر اس کی سابقہ حیثیت تسلیم کرتے ہوئے اسے کھولنے کی اجازت مل جاتی ہے تو شاید یہ کالج دوبارہ جاری ہو سکے۔

حکیم ناظر شمیم اس کالج کے بانی پرنسپل اور سکریٹری تھے۔ 13 اپریل 1990 کو ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے حکیم نذر الحسن فاروقی کالج کے پرنسپل ہوئے، وہ آخر تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ اگر چہ یہ کالج ڈپلومہ کی سطح سے آگے نہیں بڑھ سکا اور اس کی ترقی میں مالی مسائل ہمیشہ سد راہ بنے رہے، لیکن اسّی برسوں تک یہاں تعلیم و تدریس کا جو سلسلہ رہا ہے طب کی تعلیم کے حوالہ سے ایک اہم واقعہ ہے۔

حوالہ جات

1۔ اصول و قواعد و ضوابط اور نصاب تعلیم بھارت طبیہ کالج، سہارن پور، غیر مورخ، ص 3-2

2۔ ھوالشافی (میگزین)، بھارت طبیہ کالج، سہارن پور، شمارہ 4، 1992، ص 50-49

3۔ ایضاً

4۔ ھوالشافی (میگزین)، بھارت طبیہ کالج، سہارن پور، جلد 6، شمارہ 6، 2002، ص 5

جامعہ طبیہ دارالعلوم۔ دیوبند

ہندوستان میں علوم اسلامیہ کے احیاء اور فروغ کو دارالعلوم دیوبند کے قیام سے حیات نو ملی ہے۔ اس حقیقت کے برعکس اس کے تاریخی کردار کو صرف دینی علوم تک محدود کر دیا جاتا ہے اور بالعموم اسی حیثیت سے اس کا تذکرہ ہوتا ہے۔ طبی تعلیم کے اہتمام کے سلسلہ میں دارالعلوم کی نہایت وقیع خدمات رہی ہیں۔ 1857 کے بعد طبی تعلیم کی ضرورت کا احساس کرنے والوں میں اکابرین دارالعلوم سرفہرست ہیں۔ 1295ھ مطابق 1877 کی روداد میں دارالعلوم میں طبی تعلیم جاری کرنے اور علاج و معالجہ میں کام آنے والے ساز و سامان کی فراہمی کی اپیل کی گئی تھی اور 1296ھ/ 1878 میں اختیاری مضمون کے طور پر باقاعدہ طبی اسباق کی شروعات کر دی گئی تھی۔ شروع میں سدیدی اور شرح اسباب کی تعلیم ہوتی تھی بعد میں قانونچہ، موجز القانون، کلیات نفیسی اور حمیات قانون بھی شامل درس ہوگئیں۔ ابتداء میں دارالعلوم کے اولین صدر مدرس مولانا یعقوب نانوتوی نے اس مضمون کی تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ گویا وہ دارالعلوم کے صدر اول ہونے کے ساتھ طبیب اول بھی تھے۔ [1]

1301ھ/ 1883 میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے اس سلسلہ کو ترقی دے کر باقاعدہ ایک شعبہ کی شکل دے دی۔ شیخ الہند کے برادر خرد مولانا حکیم محمد حسن دیوبندی کا اس شعبہ میں طبیب کی حیثیت سے 1302ھ/ 1884 میں تقرر ہوا، انھوں نے حکیم عبدالمجید خاں دہلوی سے

طب کی تعلیم حاصل کی تھی، یہاں انھوں نے چار دہائیوں سے زائد مدت تک بحیثیت طبیب خدمت انجام دی۔ 1329ھ/ 1911 میں دارالعلوم کے دیگر شعبہ جات کی طرح شعبۂ طب کو مستقل حیثیت عطا کر کے اسے ترقی کا موقع فراہم کیا گیا۔ حکیم محمد حسن دیوبندی کے بعد کچھ دنوں مولانا سید مرتضیٰ حسن چاند پوری، علامہ انور شاہ کشمیری اور حکیم رمضان الحق لکھیم پوری سے طلبہ نے طب کے اسباق پڑھے۔

1350ھ/ 1931 میں مولانا حکیم محمد عمر دیوبندی کے دارالعلوم میں طبیب مقرر ہونے کے بعد یہاں طبی تعلیم کے سنہرے دور کا آغاز ہوا۔ اس عہدہ کے فرائض میں علاج و معالجہ کے علاوہ طبی کتابوں کی تعلیم بھی شامل تھی۔ حسب دستور انھوں نے معالجہ اور تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ شام میں منتہی درجات کے طلبہ کو درسیات پڑھاتے اور صبح میں نسخہ نویسی کی مشق کرواتے۔ دارالعلوم میں جامعہ طبیہ کے قیام سے پہلے حکیم محمد عمر کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنے والے طلبہ کی تعداد پانچ سو سے متجاوز ہے۔ وہ تلامذہ جنھوں نے ان سے قانونچہ، نفیسی، موجز القانون، شرح اسباب اور حمیات قانون جیسی کتابیں پڑھیں اور امتحان دے کر کامیاب ہوئے ان کی تعداد تقریباً پونے چار سو ہے۔ حکیم نفیس الرحمٰن تھانوی نے حکیم محمد عمر کے تذکرہ میں ان تلامذہ کی تفصیل پیش کی ہے۔[2]

طب میں طلبہ کے رجحان کو دیکھتے ہوئے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے 1960 میں اس قدیم شعبہ کو ترقی دے کر ''جامعہ طبیہ دارالعلوم'' کے نام سے باقاعدہ ایک درسگاہ کی شکل دے دی۔ حکیم محمد عمر اس کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس کے انتظام و انصرام کے لئے ''مجلس طبی'' کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا قاری محمد طیب اس کے صدر اور حکیم سید محمد الیاس کٹھوروی سکریٹری قرار پائے۔ ملک کے مشہور اطباء اس کے رکن منتخب ہوئے۔ مجلس طبی کے مشورہ سے کالج کے اصول و ضوابط طے ہوئے اور چار سال پر مشتمل ایک نصاب ترتیب دیا گیا۔ علاوہ ازیں لائق اساتذہ اور مستعد عملہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ عملی تعلیم اور ہسپتال کے لئے ضروری سامان اور آلات مہیا کئے گئے۔ دارالعلوم کے قریب ہی جانب شمال میں ایک وسیع قطعۂ آراضی خرید کر لاکھوں روپیہ کے صرفہ سے کالج اور ہسپتال کی ضروریات کے لئے عمارت تعمیر کی گئی۔ جامعہ طبیہ میں داخلے اور امتحانات دارالعلوم کے طرز پر شوال اور شعبان کے مہینوں میں

ہوتے تھے۔ داخلے کے مجاز وہ طلبہ تھے، جنھوں نے دارالعلوم دیوبند یا کسی مستند درسگاہ سے فاضل کی سند حاصل کی ہو۔ دارالعلوم کے دوسرے شعبہ جات کی طرح جامعہ طبیہ میں بھی کسی قسم کی کوئی فیس نہیں تھی، بلکہ سبھی طلبہ کو مفت قیام، عاریۃً درسی کتب اور تقریباً ایک تہائی طلبہ کو امداد طعام اور نقد وظائف کی سہولت فراہم تھی۔

1964 میں جامعہ طبیہ دارالعلوم کا پہلا بیچ فارغ ہوا۔ انہیں فاضل طب و جراحت (BTMS) کی سند دی گئی اور 1968 تک کے فارغین کو یہی سند دی جاتی رہی۔ بعد میں بعض وجوہات سے انڈین میڈیسن بورڈ، یوپی کے ذریعہ اس کی منظوری منسوخ کردی گئی، جن فضلاء کا رجسٹریشن ہوگیا تھا اسے رد کر کے رجسٹریشن سرٹیفکٹ اور سند فراغت واپس کرنے کا حکم ہوا۔ سابقہ اسناد کو واپس لے کر فاضل طب (DUM) کی سند دی گئی اور اس کی بنیاد پر بورڈ سے دوبارہ رجسٹریشن سرٹیفکٹ جاری ہوا۔ 1981 میں حکیم عبدالرزاق (سابق ڈائرکٹر سی سی آر یو ایم، نئی دہلی) اور حکیم سید خلیفۃ اللہ (سابق وائس چیئر مین سی سی آئی ایم، نئی دہلی) کی کوششوں سے جامعہ طبیہ کی کوالیفیکیشن کو حکومت ہند کی وزارت صحت و خاندانی بہبود، نئی دہلی کے گزٹ نوٹیفکیشن مورخہ 22/اگست 1981 کے ذریعہ سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن کے ایکٹ 1970 کے سیکنڈ شیڈول میں درج کیا گیا۔[3]

جامعہ طبیہ دارالعلوم ملک کی دوسری طبی درسگاہوں سے اس اعتبار سے منفرد و ممتاز تھا کہ یہاں یونانی طب کی تعلیم طب اسلامی کی حیثیت سے ہوتی تھی اور اس کے اصول و مسائل کو اسلامیات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جامعہ کے بعض امتحانی پرچوں کو دیکھ کر اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ 1387ھ/ 1967 کے نفیسی کے امتحان کا ایک سوال تھا ''خلقت انسانی کے بارے میں قرآن کریم میں بتلایا گیا ہے ''ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمأ مسنون ''اور اطباء کا خیال ہے کہ ''الارکان ھی اجزاء اولیۃ لبدن الانسان'' واضح کیجئے کہ تخلیق انسانی میں 'صلصال' اور 'حمأ مسنون' کو کون سی فوقیت حاصل ہے اور دیگر عناصر کیا خدمات انجام دیتے ہیں''، لیکن بعد میں جامعہ طبیہ کے امتحان اور تعلیم کا یہ طریقہ موقوف کردیا گیا کیونکہ زیر درس نصاب تعلیم کو انڈین میڈیسن بورڈ، یوپی سے جس طرح کی منظوری حاصل تھی اس

سے یہ طریقہ قطعی مختلف تھا، جب کہ اس طرح کے نصابات میں اسباق اور امتحانات سرکار سے منظور شدہ نہج پر مطلوب ہوتے ہیں۔ 4

جامعہ میں جو اساتذہ مامور تھے، ان میں سے کئی نے اعلیٰ علمی وفنی خدمات کے ذریعہ ملک گیر شہرت حاصل کی۔ اس ضمن میں حکیم محمد عمر کے علاوہ حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی کا نام بے حد ممتاز ہے۔ انھوں نے درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف، ترجمہ نگاری اور لغت نویسی کے میدان میں جو نمایاں مقام حاصل کیا ہے، معاصر طبی دنیا میں اس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی۔ اس سلسلہ کے دوسرے اہم ناموں میں حکیم سید ایوب علی قاسمی (سابق ریڈر شعبۂ علم الادویہ، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، اے ایم یو، علی گڑھ) اور پروفیسر حکیم شمیم احمد سعیدی (بانی جامعہ طبیہ، دیوبند) کے اسماء بھی قابل ذکر ہیں۔

جامعہ طبیہ کے آخری زمانہ میں بعض انتظامی تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ حکیم شمیم احمد سعیدی جو کچھ دنوں وائس پرنسپل کے منصب پر بھی فائز رہے، بحیثیت سکریٹری نامزد کیے گئے اور حکیم محمد عمر کی جگہ، جو جامعہ طبیہ کے قیام سے ہی پرنسپل تھے، سینئر استاذ حکیم سید محمد نفیس کو پرنسپل کی ذمہ داری تفویض کردی گئی۔ جامعہ کے آخری بیچ کے طلبہ کی اسناد پر بحیثیت پرنسپل انہی کے دستخط ہیں۔ 5

10/ مارچ 1984 کو صوبائی حکومت نے تمام ڈپلومہ کالجوں پر پابندی عائد کردی، اب انہیں جاری رکھنے کی محض ایک صورت یہ تھی کہ انفرااسٹرکچر کی توسیع کرکے گریجویشن سطح کا ادارہ بنا دیا جائے۔ صوبہ کے کئی اداروں نے یہ شکل اختیار کرکے اپنے وجود کو باقی رکھا۔ جامعہ طبیہ کے ذمہ داروں کے لئے یہ کام بہت آسان تھا۔ اس لئے کہ ان کے سامنے وسائل کی دشواریاں نہیں تھیں۔ حالانکہ DUM کی جگہ بیچلر کورس شروع کرنے کے مقصد سے کچھ دنوں پری طب کی کلاسیں ہوئیں بھی، مگر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے 19 تا 21 شعبان 1406ھ مطابق 1985 کے منعقدہ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعہ جامعہ طبیہ دارالعلوم کو تحلیل کرنے کا فیصلہ کردیا۔ اس طرح ایک صدی سے زائد عرصہ سے جاری ایک طبی سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ جامعہ کے بند ہوجانے کے بعد زیر تعلیم طلبہ کو باقی تعلیم کی تکمیل کے لئے دوسرے اداروں میں داخل کردیا گیا۔

جب کہ عملہ کے افراد کو حسب لیاقت دار العلوم کے مختلف شعبوں میں منتقل کر دیا گیا۔[6]

1980 میں دار العلوم دیو بند میں جشن صد سالہ منایا گیا۔ اس کے بعد ہی جامعہ طبیہ پر خطرات کے بادل منڈلانے شروع ہو گئے تھے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے جس طرح مدنی خاندان نے مولانا وستانوی کے مہتمم منتخب ہونے پر محاذ کھولا تھا، اسی قسم کی محاذ آرائی جشن صد سالہ کے بعد اس وقت کے مہتمم مولانا قاری محمد طیب کے خلاف مولانا اسعد مدنی کے گروپ نے کی تھی۔ یہ محاذ ہر اس چیز کے خلاف تھا، جس کا کسی قسم کا تعلق قاری محمد طیب اور ان کے دور اہتمام سے تھا۔ چونکہ جامعہ طبیہ قاری محمد طیب کے دور اہتمام میں شروع ہوا تھا، اس لئے وہ بھی نشانے پر تھا۔ جشن صد سالہ کے بعد قاری محمد طیب کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد مولانا محمد سالم عبوری طور پر مہتمم منتخب ہوئے، مگر وہ بھی ان لوگوں کو راس نہیں آئے، ان کے زمانۂ اہتمام میں ایسی شورش برپا ہوئی اور ایسی تخریب کاری ہوئی کہ دار العلوم کو غیر معینہ مدت کے لئے بند کرنا پڑا۔ دراصل موقع کے منتظر طبقہ کو اسی وقت کا انتظار تھا۔ مولانا محمد سالم کی جگہ مولانا مرغوب الرحمٰن مہتمم منتخب ہوئے اور انہی کے دور اہتمام میں جامعہ طبیہ کو تحلیل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن اس معاملہ میں ان کی حیثیت صرف ایک مہرہ کی تھی۔ پس پردہ کچھ دوسرے ذہنوں کا یہ کھیل تھا۔[7] افسوس ہوتا ہے کہ ذاتی عناد کا جذبہ اتنی قبیح شکل اختیار کر سکتا ہے اور ایک تعلیمی سلسلہ کے خاتمہ کا موجب بن سکتا ہے۔ ایک باوقار علمی ادارہ کے ذمہ داروں کا اس قسم کا طرز عمل بے حد شرمناک ہے۔

حوالہ جات

1، 2، 3، 4۔ تذکرہ حضرت الحاج مولانا حکیم محمد عمر دیوبندی، حکیم نفیس الرحمٰن تھانوی، ہمدم پریس، مالیگاؤں، اشاعت 2008، ص 34-37، 40-46، 51-52، 92

5، 6۔ یونی میڈ کلیات جلد 5 شمارہ 1 تا جلد 7 شمارہ 2 اپریل 2009 تا مارچ 2012، ص 3، 6

7۔ حامد حسن بن محمد صدیق خاں قاسمی، متوطن سدھارتھ نگر مقیم حال ممبئی سے حاصل زبانی معلومات، موصوف جامعہ طبیہ کے آخری بیچ کے طالب علم ہیں۔

یونانی میڈیکل کالج۔ کانپور

اس کا قیام 1972 میں حکیم عبدالصبور ادیبؔ کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ حکیم عبدالصبور کا شمار کانپور کے باحیثیت مسلم تاجروں میں تھا۔ تجارت کے ساتھ طب اور طبی صحافت سے انہیں خاصی دلچسپی تھی۔ 1971 میں انھوں نے میڈیکل ڈائجسٹ کے نام سے کانپور سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا تھا۔ جون 1971 میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا تھا۔ بعد میں اس کا مرکزی دفتر کانپور سے دہلی منتقل ہوگیا اور نام کی تھوڑی ترمیم کے ساتھ نومبر 1971 میں یہ رسالہ شفاء میڈیکل ڈائجسٹ، دہلی کے نام سے جاری ہوا۔ طبی صحافت کے تجربہ کے بعد حکیم عبدالصبور ادیبؔ نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے 1972 میں یونانی میڈیکل کالج، کانپور کی بنیاد رکھی۔ جس میں الیف ایم بی ایس کی تعلیم کا انتظام تھا۔ ان کی سرپرستی میں یہ کالج تقریباً دو سال جاری رہا، لیکن وسائل کی کمی کے سبب ان کے لئے اس کالج کو جاری رکھ پانا مشکل ہو رہا تھا۔ 1974 میں جمعیۃ العلماء ہند (شاخ کانپور) کے ذمہ داروں نے اسے اپنی تحویل میں لے کر اس کے نظم ونسق کا نئے سرے سے بندوبست کیا۔ جمعیۃ کی تحویل میں آنے کے بعد یہ کالج بینا جھابڑ سے رجبی روڈ پر واقع جمعیۃ کی بلڈنگ میں منتقل ہوگیا۔ یہاں یہ نئے سرے سے مولانا حسین احمد مدنی یونانی میڈیکل کالج کے نام سے جاری ہوا اور پہلے سے زیر تعلیم طلبہ کے داخلوں کی تجدید کی گئی۔ نئے انتظام کے تحت کالج کو شروع ہوئے کچھ ہی مہینے گزرے تھے کہ صوبہ میں جاری ڈگری سطح کی طبی

درسگاہوں کے یونیورسٹی سے الحاق کو ضروری قرار دے کر ان کے لئے معیار کی پابندی کو لازمی بنادیا گیا اور جو کالج مجوزہ شرائط پر پورے نہیں پائے گئے، ان میں تعلیم ممنوع قرار دے دی گئی۔ اسی زمرہ میں 1975 میں مولانا حسین احمد مدنی یونانی میڈیکل کالج، کانپور کو بھی بند ہونا پڑا۔ اس کے بند ہونے کے بعد یہاں زیر تعلیم ان طلبہ کو جو سائنس اسٹریم کے تھے، اسٹیٹ تکمیل الطب کالج لکھنؤ اور اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج، الٰہ آباد منتقل کر دیا گیا۔ چونکہ یہ طلبہ کانپور میں ایف ایم بی ایس کا نصاب پڑھ رہے تھے جب کہ لکھنؤ اور الٰہ آباد کے اسٹیٹ یونانی کالجوں میں بی یو ایم ایس کی تعلیم ہو رہی تھی۔ لہٰذا کانپور سے منتقل ہونے والے طلبہ کو بی یو ایم ایس سال اول سے تعلیم شروع کرنی پڑی۔ سائنس اسٹریم کے طلبہ کو تو جیسے تیسے داخلہ مل گیا لیکن وہ طلبہ جو اورینٹل اسٹریم سے تعلق رکھتے تھے، انہیں صوبائی کالجوں نے داخلہ دینے سے منع کر دیا۔ مجبوراً ان طلبہ نے کورٹ سے رجوع کیا۔ بالآخر قانونی چارہ جوئی کے بعد انہیں داخلہ کی اجازت ملی۔ انھوں نے لکھنؤ اور کانپور سے بی یو ایم ایس کی تعلیم پوری کی۔ لیکن انہیں اس کے لئے مالی نقصان اٹھانے کے ساتھ کافی ذہنی اذیتوں سے گزرنا پڑا اور ان کی زندگی کے کئی قیمتی سال بھی برباد ہو گئے۔

یہ کالج 1972 میں شروع ہو کر 1975 تک جاری رہا، ان تین برسوں میں ڈاکٹر کے بی ورما، حکیم علی احمد اور حکیم چودھری عبدالرشید نے بحیثیت پرنسپل خدمات انجام دیں۔

الرشاد طبیہ کالج ۔ اعظم گڑھ

اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں مدارس و مکاتب کی ایک دنیا آباد ہے۔ ہندوستان میں اسلامی اور مشرقی علوم کی نشر و اشاعت میں یہاں کے مدارس کا بڑا اہم حصہ ہے۔ مشرقی علوم کے تمام شعبوں میں ان مدرسوں کے فارغین نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ گزشتہ سو برسوں سے اس ضلع کا یہ امتیاز قائم ہے۔

جامعۃ الرشاد کا شمار ضلع اعظم گڑھ کے اہم مدارس میں ہے۔ معروف عالم دین مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم اس کے بانی اور مہتمم تھے، انھوں نے جامعہ کی توسیع کرتے ہوئے، اسلامیات کے ساتھ طب کی تعلیم کے لئے 1973 میں الرشاد طبیہ کالج کی بنیاد ڈالی۔ حکیم سید اشتیاق احمد (صاحب کلیات عصری) اس کالج کے پرنسپل تھے، وہ بعد میں گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج، گلبرگہ (کرناٹک) میں پروفیسر اور پرنسپل ہوئے۔ الرشاد طبیہ کالج میں پرنسپلی کے ساتھ وہ تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ ان کے زیر درس رہے طلبہ کا بیان ہے کہ علم تشریح جیسا خشک مضمون، وہ اتنے دلچسپ انداز میں پڑھاتے تھے کہ کلاس ختم ہونے تک ان کے لکچر میں طلبہ کی دلچسپی قائم رہتی تھی، جن اور دہ، شرائین اور عضلات کی وہ وضاحت کر دیتے، ان کی تصویریں پردۂ ذہن پر مرتسم ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر خلیل احمد (بلیریا گنج، اعظم گڑھ) فزیالوجی کے استاذ تھے، ان کا طریقۂ درس بھی بہت عمدہ تھا۔ ڈاکٹر مقصود احمد (شیرواں، سرائے میر، اعظم گڑھ) علم کیمیا

پڑھاتے تھے۔ڈاکٹر سید جمال اعظم گڑھ شہر کے رہنے والے تھے، وہ یہاں کے اچھے اساتذہ میں تھے، ان کے علاوہ کالج میں جتنے اساتذہ تھے، سبھی اپنے مضمون میں ماہر تھے۔

جامعۃ الرشاد کے کیمپس ہی میں یونانی طلبہ کے لئے کلاسز کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں اعظم گڑھ کے علاوہ گونڈہ، بستی، بہرائچ، بلیا، گورکھپور وغیرہ کے طلبہ بھی زیر تعلیم تھے۔ حالانکہ یہ کالج صرف دو ڈھائی برس ہی جاری رہا، مگر اس قلیل عرصہ میں مشرقی اتر پردیش کے بیشتر اضلاع میں اس نے شہرت پالی تھی۔ تعلیم کے معاملہ میں سرزمین اعظم گڑھ کو جو اعتبار حاصل ہے غالباً وہی قرب وجوار کے طلبہ کے لئے کشش کا سبب بنا اور وہ طب کے اس نوزائیدہ کالج میں تعلیم کے لئے داخل ہوئے۔

باوجودیکہ یہاں بہت باصلاحیت اساتذہ تھے، ان کی وجہ سے تعلیم کا معیار بہت عمدہ تھا، مگر اس کالج کے پاس وہ انفراسٹرکچر نہیں تھا، جو حکومت کے مجوزہ ضابطہ کے لحاظ سے مطلوب تھا، لہٰذا ریاستی حکومت نے اسے بند کرنے کا حکم صادر کر دیا، اگر حکومت کی طرف سے کچھ دنوں کی مہلت ملتی تو کالج کے منتظمین اس کا بندوبست ضرور کر لیتے۔اس لئے کہ اس ضلع کے اہل ثروت میں علم وفن کی قدردانی کا بڑا جذبہ ہے، لیکن حکومت کے فوری تقاضے کی تکمیل سردست مشکل تھی، اس لئے کالج کے ذمہ داروں نے مہلت کے لئے ہائی کورٹ سے رجوع کیا، مگر اس نے کوئی راحت نہیں دی اور کالج بند کرنے سے متعلق حکومت کے فیصلہ کی توثیق کر دی، ساتھ ہی زیر تعلیم طلبہ کے بارے میں حکم دیا کہ ان کی باقی تعلیم کا بندوبست تکمیل الطب کالج، لکھنؤ اور اسٹیٹ میڈیکل کالج، الہ آباد میں کیا جائے۔اس فیصلہ کے بعد کالج کے طلبہ کو الہ آباد اور لکھنؤ منتقل کر کے اسے بند کر دیا گیا۔

ڈاکٹر نورالدین اعظمی، الرشاد طبیہ کالج کے پہلے بیچ کے طالب علم ہیں، انھوں نے کالج بند ہونے کے بعد باقی تعلیم لکھنؤ سے پوری کی۔ قصبہ پھولپور ضلع اعظم گڑھ میں ان کا شاندار ہاسپٹل ہے۔ان کا شمار پھولپور کے نمائندہ ڈاکٹروں میں ہے۔اس مضمون کی تفصیلات انہیں سے منقول ہیں۔

سلفیہ طبیہ کالج۔ بنارس

جامعہ سلفیہ بنارس کا شمار ہندوستان کی اہم دینی درسگاہوں میں ہے۔عربی زبان و ادب اور مسلک اہل حدیث کی تعلیم کے لئے اسے ملک گیر شہرت حاصل ہے۔ یہاں کے ذمہ داروں اور بہی خواہوں نے اسلامیات کے ساتھ عصری تعلیم کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے، جامعہ کے زیراہتمام ایک طبیہ کالج کا منصوبہ بنایا۔ یہ واقعہ گزشتہ صدی کی آٹھویں دہائی کا ہے۔ مولانا عبدالوحید بنارسی اس وقت جامعہ کے ناظم تھے، انھوں نے ڈاکٹر مختار احمد ندوی اور ڈاکٹر ابوالعباس حریری کی تحریک پر یہ پروگرام بنایا تھا۔مولانا ندوی، غیرمنقسم اعظم گڑھ کے قصبہ مئو کے رہنے والے تھے، انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلہ میں مالیگاؤں (مہاراشٹر) اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بڑے اہم کام کئے ہیں۔ڈاکٹر ابوالعباس حریری نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کی تھی، وہ جامعۃ الملک عبدالعزیز جدہ (سعودی عرب) میں نباتیات کے پروفیسر رہ چکے ہیں، صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد سے ان کے اچھے مراسم تھے، وہ اپنے والد کی وجہ سے سیاسی اثر ورسوخ کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ان کے والد مولانا عبدالمجید حریری سعودی عرب میں ہندوستان کے امبسڈر رہ چکے ہیں۔

جامعہ سلفیہ بنارس کے زیراہتمام طبیہ کالج کا قیام، ڈاکٹر مختار احمد ندوی اور ڈاکٹر ابوالعباس حریری کے ذہن کا منصوبہ تھا۔اس قسم کے منصوبوں پر عمل آوری کے لئے مالی وسائل

بہت اہم ہوتے ہیں۔ مگر جامعہ کے سامنے اس قسم کے مسائل نہیں تھے، اس لئے کہ اسے خلیجی ممالک کا تعاون حاصل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے دوسرے مدارس اور جامعات کے برعکس یہاں ہمیشہ مالی وسائل کی فراوانی رہی ہے۔ جامعہ سلفیہ میں طبیہ کالج کے لئے جو اسباب مطلوب تھے، وہ یہاں وافر مقدار میں دستیاب تھے۔ مزید برآں مشرقی اتر پردیش میں واقع ہونے کی وجہ سے اس کی ترقی کے امکان بہت زیادہ تھے۔ اس لئے کہ یونانی طب کی تعلیم وتدریس کے تعلق سے یہ خطہ بڑا زرخیز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں یونانی طب کو اس دور میں سہارا ملا ہے، جب طب کے روایتی خاندانوں نے اس فن سے رشتہ توڑ لیا تھا۔

75 / 1974 میں اس کالج کا افتتاح عمل میں آیا اور بڑے تزک واحتشام سے تاسیسی جلسہ کا انعقاد ہوا، اس موقع پر یونانی طب کی بڑی سربرآوردہ شخصیتیں مدعو تھیں۔ حکیم عبدالحمید دہلوی، حکیم حماد عثمانی (الہ آباد)، حکیم عبدالرزاق (ڈائرکٹر سی سی آر یو ایم)، ڈاکٹر عالیہ امان، پروفیسر حکیم محمد طیب (علی گڑھ)، حکیم شکیل احمد شمسی (لکھنؤ)، حکیم شمیم احمد سعیدی (دیوبند) وغیرہ اس تقریب کے خاص مہمان تھے۔ حکیم عبدالحمید نے اس موقع پر پچیس ہزار روپے کا عطیہ بھی پیش کیا تھا۔ افتتاحی تقریب میں جن طبی شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا، یہی لوگ اس زمانہ میں طبی تعلیم وتحقیق سے جڑے معاملات میں دخیل تھے۔ ان کی شرکت محض رسمی نہیں تھی، بلکہ انھوں نے تقریب میں شریک ہو کر گویا اپنی سطح سے تعاون کی پیش کش کردی تھی، ان کی شرکت وتعاون سے جامعہ کے لئے قانونی مسئلوں کا حل آسان ہوگیا تھا۔ جامعہ سلفیہ کے ذمہ داروں نے افتتاحی تقریب کا جس طرح اہتمام کیا تھا اور اس میں یونانی طب کے ذمہ داروں کو مدعو کر کے اپنے مشن سے جوڑنے کی کوشش کی تھی، اس سے ان کی دور اندیشی کا اندازہ ہوتا ہے۔

چونکہ اس کالج کے نظم ونسق کا معاملہ جامعہ سلفیہ کے زیر اہتمام تھا، اس لئے اسے عوام کا اعتماد حاصل کرنے میں دشواری نہیں ہوئی اور افتتاح کے فوراً بعد طلبہ کے داخلے شروع ہوگئے۔ حالانکہ ابھی صوبائی حکومت اور دیسی طبوں کے نگراں اداروں سے منظوری نہیں ہو پائی

تھی، لیکن ذمہ داروں کو یقین تھا کہ یہ مسئلہ بآسانی حل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ مولانا مختار احمد ندوی جیسا سرکردہ اس مشن کا حصہ تھا اور ڈاکٹر ابوالعباس حریری جیسی فعال اور اثر ورسوخ کی حامل شخصیت اس مشن کی قیادت کر رہی تھی۔ اطباء نے افتتاحی تقریب میں شریک ہوکر، اپنے تعاون کا یقین پہلے ہی دلا دیا تھا لہٰذا منظوری کا حصول کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔

طلبہ کے داخلوں کے بعد کلاسیں شروع کر دی گئیں۔ ابتداً طبیہ کالج جامعہ ہی کے کیمپس میں واقع تھا۔ تعلیم کے ساتھ یہیں طلبہ کے قیام وطعام کا نظم تھا، جن لوگوں نے کالج کو دیکھا ہے، ان کا بیان ہے کہ سائنسی مضامین کی عملی مشق کے لئے جو تجربہ گاہیں بنی تھیں، وہ بہت اعلیٰ اور معیاری قسم کی تھیں۔ گرچہ عارضی طور پر جامعہ کے کیمپس ہی میں تعلیم وتدریس کا انتظام تھا۔ مگر مستقل کیمپس کے لئے جامعہ کے ذمہ داروں نے ایک وسیع قطعۂ آراضی خرید لیا تھا۔ مستقبل میں وہیں طبیہ کالج کی تعمیر کا منصوبہ تھا۔

ڈاکٹر ابوالعباس حریری کالج کے بانیوں میں تھے اور وہی اس کے روح رواں تھے، وہ رضا کارانہ طور پر کبھی کبھی کلاس بھی لیا کرتے تھے۔ جو اساتذہ یہاں مستقل طور پر تعلیم وتدریس کے لئے مامور تھے، ان میں سے چند نام معلوم ہو سکے ہیں۔ ماسٹر علاء الدین کیمسٹری کے استاد تھے اور ماسٹر اطہر انگریزی پڑھاتے تھے۔ ان اساتذہ اور پڑھائے جانے والے مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں بی یو ایم ایس کے بجائے پری طب سے تعلیم کا آغاز ہوا تھا۔

ابھی کالج اپنے وجود کے ابتدائی مرحلہ میں تھا، اسی دوران ڈاکٹر ابوالعباس حریری بیمار پڑ گئے۔ حریری کی مستقل علالت کے باعث صوبائی حکومت سے منظوری اور یونیورسٹی سے الحاق کا کام التواء میں پڑ گیا۔ حکومت کی منظوری حاصل نہ ہو پانے سے طلبہ میں اضطراب کا پیدا ہونا فطری تھا۔ دھیرے دھیرے ان کی بے چینی شورش اور ہنگامہ میں تبدیل ہوگئی۔ اگر منظوری سے متعلق یقین دہانی کرادی جاتی تو وہ مطمئن ہو جاتے۔ مگر جامعہ کے ذمہ دار ایسا کرنے میں ناکام رہے اور انھوں نے مسئلہ کے حل میں سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ ان کے اس رویے سے ہنگامہ اور

بھڑک اٹھا اور طلبہ نے منظوری کے مطالبے کو لے کر اسٹرائک کر دی۔ جامعہ سلفیہ کی انتظامیہ نے کالج کو بند کر دینے ہی میں عافیت سمجھی اور طلبہ کو جبراً کیمپس سے نکال کر کالج کو مقفل کر دیا۔ تقریباً تین سال تک جاری رہنے کے بعد یہ کالج بند ہو گیا۔ اس کے اس طرح بند ہو جانے سے نہ صرف سیکڑوں طلبہ کا تعلیمی مستقبل برباد ہوا بلکہ ملّت طب کے ایک ادارہ سے محروم ہو گئی۔

ابن سینا طبیہ کالج، بیناپارہ۔ اعظم گڑھ

اعظم گڑھ کا شمار ہندوستان کے مردم خیز اضلاع میں ہے۔ یہاں کے مسلمانوں نے قومی سطح پر جو امتیاز حاصل کیا ہے وہ ہند اسلامی تاریخ کا ایک روشن پہلو ہے۔ اسلامیات، ادبیات ولسانیات سے لے کر معاصر علوم، فنون لطیفہ، قومی وملی قیادت اور سیاست وغیرہ کے شعبوں میں ان کے کارہائے نمایاں کے گہرے نقوش موجود ہیں۔ یہاں کے مدارس اور جامعات نے اسلامی اور مشرقی علوم کے احیاء اور فروغ میں جو اہم کردار ادا کیا ہے، اس کا ان میدانوں میں مشاہدہ ہوتا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح، جامعۃ الفلاح، جامعۃ الرشاد، جامعہ اشرفیہ، نیشنل شبلی کالج اور دارالمصنفین (شبلی اکیڈمی) وغیرہ ایسے ادارے ہیں، جو قومی اور بین الاقوامی سطح پر شناخت رکھتے ہیں۔ اہالیان اعظم گڑھ نے ضلعی سطح پر اداروں کے قیام کے علاوہ قومی سطح پر قائم ہونے والے مسلم اداروں کی بناو تاسیس میں بھی نہایت سرگرمی سے حصہ لیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ اسلامی اور جدید تعلیم کے لئے انیسویں وبیسویں صدی میں قائم ہونے والے اہم ادارے ہیں۔ ان کے قیام اور فروغ میں اس ضلع کا اہم تعاون ہے۔

اس ضلع کے مسلم آبادی والے قریوں کے بارے میں کسی مبالغہ کے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تمدنی لحاظ سے یہ شہری معیار رکھتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یہاں کے جو ادارے قومی سطح پر شناخت کے حامل ہیں، ان میں سے اکثر، قریوں یا چھوٹے قصبوں میں واقع ہیں۔ ان

سے وابستہ ایک قابل ذکر امر یہ بھی ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز اور شناخت قائم کرنے والی اس ضلع کی بیشتر شخصیتوں کا تعلق دور افتادہ گاؤں اور دیہاتوں سے ہے۔ علامہ شبلی نعمانی، علامہ حمید الدین فراہی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی، مولانا صدرالدین اصلاحی، علامہ اقبال سہیل، کیفی اعظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، مولانا وحیدالدین خاں، پروفیسر اسرار احمد، پروفیسر شمیم جیراج پوری، ابو عاصم اعظمی، کیفی اعظمی، شبانہ اعظمی، جنرل اسلم بیگ (پاکستان)، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور مولانا سلطان احمد اصلاحی وغیرہ کا تعلق قریات سے ہے۔

اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ سرائے میر سے تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کی مسافت پر بیناپارہ گاؤں ہے۔ اس کے اور سرائے میر کے درمیان مشہور اسلامی درسگاہ مدرسۃ الاصلاح واقع ہے، جس سے اطراف کے لوگوں کی دینی اور مذہبی تعلیم کی ضرورت بخوبی پوری ہو رہی تھی۔ مگر عصری علوم کے ایک ادارہ کی ضرورت محسوس کر کے اس گاؤں اور اس کے قرب و جوار کے لوگوں نے بیناپارہ مائنارٹی ایجوکیشنل سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور اطراف میں واقع 23 مواضعات کے سربرآوردہ لوگوں کو اس کا رکن بنایا۔ اس سوسائٹی کے قیام میں عبدالصمد عرف مکھن شیخ، نبی احمد (انسپکٹر) اور ابوسفیان خاں کی کلیدی حیثیت ہے۔ اس سوسائٹی نے 24 جنوری 1971 کو جونیئر ہائی اسکول سے اپنے تعلیمی منصوبوں کا آغاز کیا۔ اس نے 1975 میں ہائی اسکول اور 1978 میں انٹرمیڈیٹ اور مسلم اقلیتی ادارہ کی حیثیت سے صوبائی حکومت سے منظوری حاصل کرلی۔ اس منصوبہ کی خاطر خواہ کامیابی نے سوسائٹی کے ذمہ داروں کو حوصلہ عطا کیا، انھوں نے 9/جولائی 1978 کو ایک طبی کالج کے قیام کی قرارداد پاس کر کے اسے عملی شکل میں لانے کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا۔ صوبہ کی حکومت سے اس کی اجازت کے لئے ایک وفد نے اترپردیش بورڈ آف انڈین میڈیسن کے رجسٹرار دیا شنکر باجپئی سے ملاقات کی۔ ان کی طرف سے اجازت کا عندیہ ملنے کے بعد 28/دسمبر 1980 کو سوسائٹی کی میٹنگ میں 25/جنوری 1981 کو کالج کا سنگ بنیاد رکھے جانے کی تجویز طے پائی اور حسب پروگرام اس کی تاسیس عمل میں آئی۔ سوسائٹی کے منیجر عبدالصمد نے طلبہ کی رہائش کے لئے اقبال سہیل ہال کا اور مہیش کمار لیلا دھر ڈھولکیہ، حاجی نیاز احمد، حافظ التفات احمد اور حاجی صفات علی نے ہاسپٹل کے چار وارڈوں کا سنگ بنیاد رکھا۔ حکیم شکیل احمد شمسی،

حکیم احتشام الحق قریشی، حکیم شبیر امام، چندر جیت یادو، شیام لال یادو (وائس چیئر مین راجیہ سبھا) جیسی مقتدر طبی اور سیاسی شخصیتوں کے علاوہ علاقہ کے سیکڑوں لوگ اس موقع پر موجود تھے۔

کالج کی رسم تاسیس کے وقت طے پایا کہ اس طبی درسگاہ کا نام ''ابن سینا طبیہ کالج'' ہوگا۔ اس نام کی تجویز کا محرک یہ تھا کہ اس زمانہ میں ابن سینا کا ہزار سالہ جشن منایا جارہا تھا۔ ابن سینا سے نسبت رکھنے والے ممالک ایران اور ازبکستان وغیرہ اپنے اپنے طور پر اسے خراج عقیدت پیش کررہے تھے۔ اس موقع پر اہالیان اعظم گڑھ نے اس نوزائیدہ طبی درسگاہ کو ابن سینا کے نام موسوم کرکے اسکی عظیم طبی خدمات کو جو خراج تحسین پیش کیا وہ ہر لحاظ سے ایک یادگار امر ہے، اس کے نام سے انتساب کے ذریعہ باشندگان اعظم گڑھ نے وہ فرض کفایہ ادا کردیا جو ہندوستان سے ابن سینا کے تعلق کی وجہ سے اس ملک کی طبی برادری پر عائد ہورہا تھا۔

1981 سے کالج میں ڈپلومہ سطح کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ حکیم ارشاد احمد صاحب جو اس کی تحریک کا حصہ تھے، اس کے پرنسپل منتخب ہوئے۔ اساتذہ کے طور پر حکیم غیاث الدین، حکیم محمد ارشد اور حکیم ابوالخیر کا تقرر عمل میں آیا۔ سائنسی مضامین کی تدریس کے لئے بیناپارہ مائنارٹی ایجوکیشنل سوسائٹی کے تحت چل رہے انٹر کالج کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ کالج میں باقاعدہ تعلیمی سلسلہ شروع ہونے کے بعد مزید اساتذہ کی ضرورت پڑنے پر حکیم مظفر باسط، حکیم ارشاد احمد خاں، حکیم نعیم احمد خاں، حکیم تاج الدین اور طارق اکرم صدیقی وغیرہ تدریسی عملہ میں شامل ہوئے۔ حکیم نعیم احمد خاں اور حکیم تاج الدین اس وقت فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر ہیں اور یہ دونوں اس فیکلٹی کے ڈین بھی رہ چکے ہیں۔ حکیم طارق اکرم صدیقی جامعہ ہمدرد کی یونانی فیکلٹی میں سینئر استاذ ہیں۔

1984 میں 28 طلبہ پر مشتمل ڈی یو ایم ایس کا پہلا بیچ فارغ ہوا۔ ابھی کالج ابتدائی مرحلہ میں تھا، سوسائٹی کے اراکین اور پرنسپل کالج کے استحکام کے لئے جدوجہد کرہی رہے تھے کہ ایک بے حد حوصلہ شکن واقعہ پیش آیا۔ اتر پردیش حکومت نے صوبہ میں چل رہے ڈپلومہ سطح کے تمام ویدک اور یونانی کالجوں کو بند کرنے کا فیصلہ صادر کردیا۔ یہ حکم بلا استثناء سبھی کالجوں کے لئے تھا مگر ابن سینا طبیہ کالج کے ذمہ دار، کالج کو اقلیتی ادارہ سمجھ کر اسے اس حکم سے مستثنیٰ سمجھتے رہے اور داخلہ و

تعلیم کا سلسلہ بدستور جاری رکھا۔ نتیجتاً وہ سیکڑوں طلبہ، جو اس دوران کالج میں زیر تعلیم تھے، لاکھوں روپے اور برسوں کا وقت صرف کرنے کے باوجود اسناد سے محروم رہے اور ان کا مستقبل کالج کے ذمہ داروں کی ناسمجھی کی نذر ہو گیا۔

1994 میں ابن سینا طبیہ کالج میں بی یو ایم ایس کا کورس شروع ہوا۔ اس سے پہلے برسوں بلا منظوری، تعلیم اور داخلہ کی وجہ سے، یہاں سیکڑوں طلبہ کا مستقبل برباد ہو چکا تھا، اس کی وجہ سے عوام میں کالج کی شبیہ مشکوک ہو گئی تھی، ان کا اعتماد حاصل کر کے کالج کے وقار کو بحال کرنا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ حکیم ارشاد صاحب نے آزمائشوں کے اس مرحلہ کو بڑی خوش اسلوبی سے عبور کیا اور شب و روز محنت کر کے یہاں تعلیم و تدریس کا کامیاب سلسلہ شروع کیا۔ انتظامیہ اور پرنسپل کی مساعی اور پیہم کوششوں سے کالج نے محض چند برسوں میں مستحکم بنیاد حاصل کر لی اور اس کا شمار صوبہ کے اچھے طبی اداروں میں ہونے لگا۔

اس کالج کو استحکام بخشنے اور اسے ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں حکیم ارشاد صاحب کی مساعی سب سے اہم ہیں۔ یہ اس کالج کی خوش بختی تھی کہ اسے ان کے جیسا انتظامی صلاحیتوں کا حامل پرنسپل ملا۔ لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ یہ کالج ان کے لئے ایک اچھا پلیٹ فارم بنا، جہاں انہیں انتظامی جوہر دکھانے کا موقع ملا اور اس کے ذریعہ انھوں نے طبی حلقہ میں شناخت حاصل کی۔ حکیم صاحب پرنسپل ہونے کے ساتھ اس کے قیام کی تحریک کا بھی حصہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کالج کے لئے ان کی شخصیت بڑی اہم تھی اور وہ کالج کے معاملات میں بے حد اثر انداز تھے۔ سوسائٹی کے بعض ذمہ داروں کو ان کا یہ اثر و رسوخ ناگوار گزرنے لگا اور ان کی طرف سے اس کے مظاہر سامنے آنے لگے۔ نتیجتاً اختیارات کی کشمکش شروع ہو گئی۔ اس واقعہ سے دلبرداشتہ حکیم ارشاد صاحب نے کالج سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا اور انتظامیہ کو استعفیٰ سونپ کر اس کی ذمہ داریوں سے دستبردار ہو گئے۔ مگر انتظامیہ نے استعفیٰ منظور نہ کر کے ان سے اس فیصلہ پر نظر ثانی کی درخواست کی۔ ان کے اس اقدام سے کالج کے حق میں ارشاد صاحب کی بیش قدر خدمات کے اعتراف کا پتہ چلتا ہے۔ تقریباً ایک سال بعد حکیم ارشاد صاحب واپس آئے تو سوسائٹی نے ان کے علاحدگی کے زمانے کے مشاہروں کو ادا کر کے مفاہمتی جذبہ کا ثبوت پیش کیا۔ اس سے لگنے لگا کہ اب حالات

معمول پر آگئے ہیں اور دلوں کی گرد صاف ہوگئی ہے۔ مگر یہ گرد نہیں بلکہ دلوں کے آبگینہ کا بال تھا، جواب بھی باقی تھا۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد اس کا اظہار ہونے لگا اور ارشاد صاحب نے دوبارہ مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس بار حالات پہلے سے زیادہ خراب تھے۔ انتظامیہ کے لوگ مفاہمت کے کسی امکان سے مایوس ہو چکے تھے لہٰذا استعفیٰ منظور کرلیا اور ارشاد صاحب کالج سے ہمیشہ کے لئے الگ ہوگئے۔ چونکہ کالج کے پاس مستحکم بنیاد ہے اس لئے وہ بدستور چل رہا ہے۔ لیکن کیمپس میں بانی پرنسپل کی عدم موجودگی ایک بڑے خلا کے طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ارشاد صاحب کی علاحدگی کے بعد پروفیسر حکیم غیاث الدین پرنسپل مقرر ہوئے، وہ کالج کے زمانۂ قیام ہی سے یہاں استاذ تھے، وہ اعظم گڑھ کے مشہور طبیب حکیم شبیر امام مرحوم کے بیٹے ہیں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں۔

ابن سینا طبیہ کالج کے قیام سے استحکام تک کے مرحلہ میں ابوسفیان خاں، نبی احمد خاں، عبدالصمد عرف مکھن شیخ، حاجی نیاز احمد، ابوعاصم اعظمی، اعجاز احمد خاں اور عبدالقیوم وغیرہ کی مساعی شامل ہیں۔ بینا پارہ مائناریٹی ایجوکیشنل سوسائٹی کی تشکیل کے وقت نبی احمد خاں صدر اور مکھن شیخ منیجر تھے۔ نبی احمد کے بعد ان کے بیٹے قوی احمد صدر بنے اور مکھن شیخ کے بعد حاجی نیاز احمد (ابوعاصم اعظمی کے والد) منیجر مقرر ہوئے۔ اس وقت اعجاز احمد خاں سوسائٹی کے صدر اور عبدالقیوم (پہلے صدر، نبی احمد کے پوتے) منیجر ہیں۔

ابن سینا طبیہ کالج انفرااسٹرکچر کے لحاظ سے اچھی حالت میں ہے۔ یہاں پچاس طلبہ کے داخلہ کی گنجائش ہے۔ بیرونی طلبہ کے لئے ہوسٹل کی سہولت ہے۔ سو بستروں کا شفاخانہ ہے لیکن دیہات میں واقع ہونے اور آمدورفت کی دشواری کی وجہ سے مریضوں کا مرجوعہ کم رہتا ہے۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے والے پچاس فیصد طلبہ مقامی اور بقیہ نصف صوبہ کے دوسرے اضلاع سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے والوں میں طالبات کا تناسب زیادہ ہے۔

اس وقت کانپور یونیورسٹی سے ملحق صوبہ کی آٹھ ایسی طبی درسگاہیں ہیں جو ٹرسٹ اور سوسائٹیوں کے تحت نجی وسائل سے چل رہی ہیں اور یہ افراد یا خاندانوں کی ملکیت ہیں، ان میں ابن سینا طبیہ کالج واحد ایسی درسگاہ ہے جو عوامی سوسائٹی کے تحت ہے، جو اس کے انتظامی اور تعلیمی

امور کی نگراں ہے۔ یہ سوسائٹی تشکیل کے وقت 22 مواضعات پر مشتمل تھی، لیکن اس وقت صرف سترہ گاؤں تک ہی اس کا دائرہ محدود ہے۔ حالانکہ اسے کم از کم ضلعی سطح تک وسیع ہونا چاہئے تاکہ اس ادارہ کو زیادہ بہتر انتظامی صلاحیت کے حامل لوگوں سے مستفید ہونے کا موقع مل سکے۔ صرف چند مواضعات تک اس کا دائرہ محدود ہونے سے اکثر یہاں مقامی اثرات اور گاؤں کی مخصوص سیاست کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس کمی کے باوجود یہ کالج تعلیمی معیار اور انتظام وانصرام کے پہلو سے اتر پردیش بلکہ شمالی ہند کے ان طبی کالجوں سے بدرجہا بہتر ہے جو افراد یا خاندان کی ملکیت کے طور پر کمرشیل منفعت کے لئے قائم ہیں۔

اس وقت اتر پردیش میں جتنے بھی غیر سرکاری طبی ادارے ہیں، ان سب میں اساتذہ کے مشاہرے بے حد معمولی ہیں، اس لئے وہ بہتر مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور موقع ملتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اس طرح پرائیویٹ کالجوں میں اساتذہ کی آمد ورفت کا سلسلہ مستقل رہتا ہے۔ ایک استاذ کے جانے کے بعد اس کے متبادل کے انتظام میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ اس سے طلبہ کا کافی تعلیمی نقصان ہوتا ہے۔ ابن سینا طبیہ کالج کا معاملہ اس بابت قدرے مختلف ہے۔ یہاں کے بیشتر اساتذہ قرب وجوار اور اطراف سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے کم مشاہروں کے باوجود وہ یہاں رہنا گوارا کرتے ہیں اور ان کے چھوڑ کر کہیں اور جانے کا اندیشہ کم رہتا ہے۔ لیکن اس کا ایک نقصان دہ پہلو بھی ہے۔ اس کالج کو غیر مقامی اچھے اساتذہ سے استفادہ کا موقع نہیں مل پارہا ہے۔ اگر سوسائٹی کے ذمہ دار مشاہروں کو بہتر کر کے باہر کے اساتذہ کے لئے بھی موقع فراہم کریں تو اس سے یہاں کے معیار تعلیم میں مزید بہتری آئے گی۔

سہارن پور طبیہ کالج۔ سہارن پور

2/جولائی 1982 کو اتر پردیش میں ''ارجن پر کرن'' نام سے ایک طبی قانون نافذ ہوا۔ اس کی دفعات 8 اور 9 کی رو سے نجی زمرہ میں دیسی طبوں کی درسگاہیں کھولنے اور ان کے چلانے پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔ البتہ دفعہ 10 کے تحت اقلیتی اداروں کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔ اس استثناء کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 1984 میں سہارن پور کی معروف شخصیت ڈاکٹر محمد اسلم خاں (بانی صدر)، ان کے رفقاء ڈاکٹر شبیر بیگ مرحوم (بانی سکریٹری) اور حکیم نفیس الرحمان تھانوی (بانی پرنسپل) کی مساعی سے مسلم ایجوکیشنل بیورو (رجسٹرڈ سوسائٹی) کے زیر اہتمام ''سہارن پور طبیہ کالج'' کے نام سے ایک اقلیتی طبی درسگاہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے دفتر کا افتتاح درگا کالونی خلاصی لین میں ایک کرایہ کی بلڈنگ میں، مفتی مظفر حسین ناظم مدرسہ مظاہر العلوم (وقف) کے دعائیہ کلمات سے ماہ فروری میں ہوا۔ بعد ازآں مارچ میں اس وقت کی مرکزی وزیر صحت محسنہ قدوائی کے ہاتھوں کالج کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس موقع پر رشید مسعود (ایم پی) اور سہارن پور کی معزز شخصیات تشریف فرماتھیں۔ آغاز کے کچھ ماہ بعد یہ کالج محلہ صابری باغ میں حاجی افضال صابری وبرادران کی عمارت میں منتقل ہوگیا۔ یہاں تقریباً سات آٹھ برس جاری رہا پھر اپنی ذاتی عمارت (واقع ہنڈن روڈ جی ٹی روڈ) میں منتقل ہوا۔

اس کالج میں طب کا چارسالہ ڈپلومہ کورس پڑھایا جاتا تھا۔ منتظمین کی جدوجہد سے اس

کورس کو یوپی انڈین میڈیسن بورڈ، لکھنؤ سے منظوری حاصل ہوئی اور تین بیچوں کے فارغین کے رجسٹریشن ہوئے۔ مگر کچھ مدت بعد صوبائی حکومت کی طبی ڈپلومہ نہ چلانے کی پالیسی کے سبب اس منظوری پر عمل درآمدگی معرض التواء میں پڑ گئی، مگر ہائی کورٹ کے اسٹے سے کچھ دنوں کے لئے راحت ملی اور فارغین کے رجسٹریشن ہوئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں یہ سلسلہ بھی موقوف ہوگیا اور کالج میں داخلوں کا سلسلہ بند کرنا پڑا۔ گرچہ نامساعد حالات کی وجہ سے سہارن پور طبیہ کالج زیادہ دنوں جاری نہیں رہ سکا، مگر بانیانِ کالج خصوصاً حکیم نفیس الرحمٰن تھانوی کی غیر معمولی جدوجہد تحسین وپذیرائی کی مستحق ہے۔

جامعہ طبیہ۔ دیوبند

10/مارچ 1986 کو مولانا مرغوب الرحمٰن کے دور اہتمام میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے "جامعہ طبیہ دارالعلوم" کو تحلیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ طلبہ، اساتذہ اور بہی خواہانِ ملت، سبھی اس فیصلہ پر ششدر اور حیران تھے۔ مگر کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ مولانا مرغوب الرحمٰن کے پاس اس کا کوئی معقول جواب نہیں تھا اور مولانا اسعد مدنی خود کو اس مسئلہ سے غیر متعلق ظاہر کررہے تھے۔ طب کی کئی سرکردہ شخصیات نے مولانا مرغوب الرحمان (مہتمم دارالعلوم) کو سمجھانے اور ان کے خدشات کو دور کرنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ کسی بھی صورت میں جامعہ کو دوبارہ جاری کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے، اس طرح دارالعلوم دیوبند میں 1878 سے جاری طبی تعلیم کا سلسلہ بند ہوگیا۔

کچھ لوگ جامعہ طبیہ دارالعلوم کے بند ہوجانے پر اظہار تأسف کررہے تھے، کچھ بند ہونے کے اسباب کی معقولیت اور نامعقولیت پر بحث کررہے تھے، کچھ نے اسے قضا وقدر کا معاملہ سمجھ کر صبر کرنا مناسب سمجھا۔ مگر پروفیسر شمیم احمد سعیدی جو گزشتہ 23 برسوں (17/ستمبر 1963) سے اس سے بحیثیت استاذ وابستہ تھے اور کچھ دنوں وائس پرنسپل اور سکریٹری بھی رہے، انھوں نے اس واقعہ کا منطقی سبب تلاشنے یا افسوس ظاہر کرنے یا اسے تقدیر کے حوالہ کردینے کے بجائے اس بند سلسلہ کو دوبارہ شروع کرنے کا تہیہ کیا۔ اس بابت اپنے عزائم کے اظہار اور رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے انھوں نے 5/مارچ 1987 کو اپنے احباب اور بہی خواہانِ طب کی ایک میٹنگ منعقد کی۔

حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی کی صدارت میں میٹنگ کے شرکاء نے حکیم شمیم احمد سعیدی کے منصوبہ کی تائید کرتے ہوئے، انہیں ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔ چونکہ یہ طبی درسگاہ جامعہ طبیہ دارالعلوم کے بند سلسلہ کے احیاء کے طور پر قائم ہونے جارہی تھی اس لئے طے پایا کہ یہ اپنے سابقہ نام سے ہی شروع ہوگی۔ بس اس میں دارالعلوم کی نسبت کا لاحقہ نہیں ہوگا، بلکہ اس کا نام جامعہ طبیہ دیوبند ہوگا۔

اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مسلم پروگریسیو اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی آف اتر پردیش کے نام سے ایک سوسائٹی تشکیل دی گئی۔ اس کے تحت یکم جولائی 1987 کو جامعہ طبیہ دیوبند کی بنیاد پڑی اور دس جولائی کو مولانا محمد سالم قاسمی اور مولانا محمد نعیم کی دعاؤں سے باضابطہ کالج کا آغاز ہوا۔ اب مرحلہ حکومت کی اجازت، سی سی آئی ایم کی منظوری اور یونیورسٹی سے الحاق کا تھا۔ حکیم شمیم احمد سعیدی کی تگ و دو سے یہ سارے مراحل بھی طے پا گئے۔ 1990 میں صوبائی حکومت نے اسے اقلیتی ادارہ کی حیثیت سے منظوری عطا کی۔ 1991 میں سی سی آئی ایم کی منظوری کے بعد کانپور یونیورسٹی سے اس کا الحاق عمل میں آیا۔ یہاں تعلیم و تدریس کا بڑا کامیاب سلسلہ جاری ہے اور روز بہ روز یہ کالج ترقی کی نت نئی منزلیں طے کر رہا ہے۔ 2001 سے یہاں شعبۂ معالجات میں ایم ڈی بھی ہو رہی ہے۔ توقع ہے اگلے سیشن سے صیدلہ، حفظان صحت اور علاج بالتدبیر کے شعبوں میں بھی ایم ڈی شروع ہو جائے گی۔ حکومت اتر پردیش کی نگرانی میں چلنے والے سرکاری اور غیر سرکاری طبی کالجوں میں جامعہ طبیہ دیوبند پہلا ادارہ ہے، جہاں پی جی سطح کی تعلیم کا نظم شروع ہوا۔ اس کے علاوہ معیار اور تعلیمی ماحول کے اعتبار سے یہ دوسرے صوبائی کالجوں سے کافی بہتر حالت میں ہے۔

حکیم شمیم احمد سعیدی کے بعد ان کے بڑے بیٹے انور سعید بڑی خوش اسلوبی سے کالج اور سوسائٹی کے سکریٹری کے طور پر اپنے والد کی جانشینی کر رہے ہیں۔ وہ طبی سیاست میں بھی سرگرم ہیں۔ سی سی آئی ایم کے رکن کے علاوہ صوبہ کے آیورویدک اینڈ یونانی طبی بورڈ کے چیئرمین بھی ہیں۔ ان کے ان مناصب سے کالج کو کافی فائدہ پہنچ رہا ہے۔

''جامعہ طبیہ دیوبند'' حکیم شمیم احمد سعیدی کا مہتم بالشان کارنامہ ہے، انھوں نے اسے

قائم کر کے دیوبند میں اس تعلیمی سلسلہ کو جاری رہنے کا سامان پیدا کر دیا جو پچھلی ایک صدی سے یہاں قائم تھا، مگر کچھ لوگوں کی خودغرضی سے 1986 میں بند ہو گیا تھا۔ حکیم سعیدی کی اس خدمت کا اعتراف کیا جانا چاہئے۔ ساتھ ہی انور سعید اور اختر سعید کی تحسین ہونی چاہئے، اس لئے کہ یہ بڑے سلیقہ سے اپنے والد کی طبی وراثت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

دیوبند یونانی میڈیکل کالج، اسپتال اینڈ ریسرچ سینٹر۔ دیوبند

دیوبند میں یونانی طب کی تعلیم کے لئے قائم ہونے والا یہ تیسرا کالج ہے، اس کا قیام مسلم ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیر ایسوسی ایشن کے ذریعہ عمل میں آیا ہے۔ ڈاکٹر قمر الزماں قریشی (پیدائش 14 رجنوری 1963۔ دیوبند) اس تنظیم کے بانی ہیں۔ وہ بڑی فعال شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے 1989 میں جے پور سے بی یو ایم ایس کرنے کے بعد منظور احمد (آئی پی ایس) اور ڈاکٹر سید فاروق (ہمالیہ ڈرگ کمپنی) کے تعاون سے یونانی میڈیکل کالج کے قیام کے لئے اس تنظیم کی تشکیل کی تھی۔ اسی کے زیر اہتمام یہ کالج قائم ہوا۔ 1991 میں سی سی آئی ایم، نئی دہلی سے منظوری اور چھترپتی شاہو جی مہاراج یونیورسٹی، کانپور سے الحاق کے بعد یہاں داخلہ اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ قیام کے وقت کلاسز اور ہاسپٹل کا بندوبست کرایہ کی بلڈنگ میں تھا۔ 1995 میں کالج اور ہاسپٹل کی تعمیر کے بعد یہ موجودہ کیمپس کی جدید عمارت میں منتقل ہوا۔

ڈاکٹر قمر الزماں قریشی کا صوبہ کی طبی سیاست میں اچھا اثر ہے۔ 2005 سے 2011 تک وہ صوبہ سے سی سی آئی ایم کے رکن رہے ہیں۔ اس وقت وہ بورڈ آف انڈین میڈیسن، لکھنؤ کے ممبر ہیں۔ طبی سیاست میں قریشی کے اثرات، ان کے کالج کے مسائل کے حل کے سلسلہ میں معاون رہے ہیں۔ ان کے اثر ورسوخ کی وجہ سے اس کالج کو ان مسائل سے کم دوچار ہونا پڑا، جس سے آج کل اکثر طبی درسگاہوں کو گزرنا پڑ رہا ہے۔

مختصر مدت میں اس کالج نے تعمیرات اور مادی وسائل کے لحاظ سے قابل اطمینان پیش رفت کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ سب قمرالزماں قریشی کی جدوجہد اور محنت کا نتیجہ ہے، لیکن افرادی وسائل کے نظام کو بہتر بنا کر تدریس اور تعلیم کو مزید بہتر صورت عطا کرنے کی ضرورت ہے۔ بانی کالج کی اطلاع کے مطابق سی سی آئی ایم، نئی دہلی نے سال 2012 کے لئے شعبۂ معالجات، منافع الاعضاء، امراض نسواں وقبالت اور جراحت میں دو دو سیٹوں کے لئے MD کی اجازت عطا کردی ہے۔ جلد ہی داخلہ کا عمل شروع ہونے کی توقع ہے۔ دیوبند میں گزشتہ ڈیڑھ سو برسوں سے ادارہ جاتی صورت میں طبی تعلیم کی جو شاندار روایت موجود ہے، اس کی پاسداری دیوبند یونانی میڈیکل کے ذمہ داروں کا فریضہ ہے۔

علامہ اقبال یونانی میڈیکل کالج۔ مظفر نگر

یہ کالج رڑکی روڈ مظفر نگر میں واقع ہے۔ اس کا قیام ڈاکٹر ضمیر حسن تیاگی کے ہاتھوں 1992 میں ہوا تھا۔ وہ انتظامی امور کی نگرانی کے ساتھ پرنسپل شپ کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ ابھی اسے قائم ہوئے بمشکل چھ ماہ ہوئے تھے کہ یہ معین الحسن راؤ کی تحویل میں آ گیا۔ انھوں نے راؤ ایجوکیشنل سوسائٹی قائم کر کے اس کے انتظام و انصرام کا اپنے طور پر بندوبست کیا۔ 1993 سے یہاں داخلہ اور تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن 1999 سے 2005 تک سی سی آئی ایم کی عدم منظوری کے سبب داخلے موقوف رہے۔ 2006 میں ریاست علی چودھری (ACN Group) نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا اور سی سی آئی ایم سے داخلہ کی منظوری حاصل کر کے، درس و تدریس کا از سر نو آغاز کیا۔ چودھری کے ہاتھوں میں آنے کے بعد اس کے جاری رہنے کی سبیل پیدا ہو گئی ہے اور اب یہ مضبوط ہاتھوں میں ہے مگر ایک معتبر ادارہ کی صورت یہ کب اختیار کر پائے گا، اس کا انتظار کرنا ہوگا۔ ایک عرصہ تک تعلیمی سلسلہ موقوف رہنے اور نظم و نسق کی خراب صورت حال کی وجہ سے اس کی شبیہ کو جو دھچکا لگا ہے اس کے ازالہ میں برسوں لگ سکتے ہیں۔ اب تک موجودہ انتظامیہ کی طرف سے اس سمت میں کوئی سنجیدہ پہل نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی یہ مسئلہ ان کی ترجیحات میں جگہ پا سکا ہے۔ ہنوز اس کا معاملہ ACN گروپ کے تحت چلنے والے علی گڑھ آیورویدک اینڈ یونانی میڈیکل کالج سے بہت مختلف نہیں ہے۔

ڈاکٹرضمیر حسن تیاگی علامہ اقبال یونانی میڈیکل کالج کے بانی پرنسپل تھے۔ان کے بعد ڈاکٹرمحمد یعقوب تیاگی، ڈاکٹرمحمد علی، ڈاکٹرمبین خاں، ڈاکٹرایس پی بھٹناگر پرنسپل مقرر ہوئے۔ 2006 میں آراے چودھری کی تحویل میں آنے کے بعد سے ڈاکٹرمحمد رضوان خاں (علی گڑھ) اس عہدہ پرفائز ہیں۔

2006 سے نئے انتظام وانصرام کے تحت یہاں داخلہ اور تعلیم کا سلسلہ تو شروع ہوگیا ہے،مگر معیار کے حصول کا اہم کام ابھی باقی ہے۔کالج کے تئیں عوامی تاثر کو بدلنے کے لئے اس کے ذمہ داروں کو سخت جدوجہد کرنی ہوگی۔

علی گڑھ یونانی اینڈ آیورویدک میڈیکل کالج۔علی گڑھ

اس کالج کا قیام 1993 میں آل انڈیا مسلم ری ہیبی لیٹیشن سوسائٹی کے ذریعہ عمل میں آیا تھا۔ ریاست علی چودھری اس کے روح رواں ہیں۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طالب علم ہیں۔ انھوں نے یہاں سے ایم اے (اکنامکس) اور جرنلزم کا ڈپلومہ کیا ہے اور مودی نگر میرٹھ سے بزنس مینجمنٹ کی تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کا آبائی وطن میرٹھ ہے، علی گڑھ کی حیثیت ان کے وطن ثانی کی ہے۔

اس وقت تعلیم، بزنس کا بے حد منفعت بخش شعبہ ہے۔ یہ دیکھ کر آر اے چودھری نے اس میدان میں قسمت آزمائی کی اور بڑی کامیابی حاصل کی۔ اس وقت وہ ایسوسی ایٹ آف چودھری نیٹ ورک گروپ (ACN Group) کے مالک ہیں۔ اس کے تحت یونانی اور آیورویدک کالج کے علاوہ پندرہ مزید پروفیشنل کورسز چل رہے ہیں۔

آر اے چودھری کے یونانی کالج کو علی گڑھ میں واقع ہونے کا بڑا فائدہ ملا۔ اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ، طب کی تعلیم کے لئے ملک گیر شہرت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے طبی تعلیم کے سلسلہ میں علی گڑھ کے نام کو ملک بھر میں جو اعتبار حاصل ہے، ایک حد تک اس کا فائدہ چودھری کے یونانی کالج کو بھی مل رہا ہے۔ طب کی تعلیم کا خواہش مند ایک بڑا طبقہ صرف علی گڑھ کے نام پر یہاں چلا آتا ہے۔ اس کالج میں بہت سے ایسے طلبہ بھی داخلہ لے لیتے ہیں جنھیں اجمل خاں طبیہ کالج میں

ایڈمیشن نہیں مل پاتا۔اس کالج کے لئے فائدہ اٹھانے کے اور بھی بہت سے مواقع ہیں۔علی گڑھ میں واقع ہونے کی وجہ سے اس کالج کو اچھے اور باصلاحیت اساتذہ بہت آسانی سے مل جاتے ہیں۔ ان کی خدمات حاصل کر کے کالج کے معیار تعلیم کو بہت عمدہ کیا جاسکتا ہے۔ ACN Group کے مالک ریاست علی چودھری کو اس اہم پہلو پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ایک عرصہ تک ان کے کالج میں سی سی آر یو ایم کے علاقائی تحقیقاتی مرکز برائے طب یونانی، علی گڑھ کی ایک کلینکل یونٹ بھی قائم رہی ہے۔اس سے کالج کو بڑا فائدہ پہنچ رہا تھا،لیکن کالج کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے یہ یونٹ بند ہوگئی۔

اطلاع کے مطابق گزشتہ برس سے یہاں ایم ڈی (یونانی) کی تعلیم بھی شروع ہوگئی ہے۔

شمع غوثیہ مائنارٹی یونانی میڈیکل کالج۔غازی پور

شمع غوثیہ مائنارٹی یونانی میڈیکل کالج کا قیام 1997 میں اتر پردیش مسلم سماج ڈیولپمنٹ سیوا سمیتی، غازی پور کے زیر اہتمام عمل میں آیا۔سمیتی کے بانی اور صدر ڈاکٹر محمد اعظم قادری ہیں۔ان کا شمار ضلع کے ذی حیثیت اور اثر ورسوخ کے حامل لوگوں میں ہے۔وہ کالج کے مینیجنگ ڈائرکٹر بھی ہیں۔محسن صدیقی، شاداب صدیقی اور ثاقب صدیقی کالج کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے رکن ہیں۔ یہ تینوں ڈاکٹر محمد اعظم قادری کے بیٹے ہیں۔کالج کے دوسرے ذمہ داروں میں سید علی نیر، ایجوکیشن ڈائرکٹر اور پروفیسر غضنفر امام پرنسپل ہیں۔یہ دونوں کالج کے زمانہ قیام ہی سے ان عہدوں پر فائز ہیں۔اس سلسلہ کا ایک اہم نام پروفیسر افضال احمد کا ہے۔وہ علاج بالتدبیر کے استاذ اور صدر شعبہ ہیں اور تعلیم وتدریس کے ساتھ کالج کے انتظامی امور میں بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے طلبہ، اساتذہ، انتظامیہ، ہر حلقہ میں مقبول ہیں۔

کالج کا رسمی افتتاح گرچہ 1997 میں ہوا لیکن صوبائی محکمہ صحت اور سی آئی ایم کی منظوری کے بعد 2000 سے یہاں داخلہ اور تعلیم کا آغاز ہوا۔اس میں ابتداً تیس طلبہ کے داخلہ کی اجازت تھی، جو 2010 سے چالیس ہوگئی ہے۔یہ کالج چھترپتی شاہو جی مہاراج یونیورسٹی، کانپور سے ملحق ہے۔

کالج کے پاس ترقی کے بے حد مواقع ہیں اس کا انتظام وانصرام مضبوط ہاتھوں میں

ہے۔مزید برآں اس کا محل وقوع ایسے علاقہ میں ہے جہاں طبی تعلیم کا بڑا رواج ہے۔ وسائل اور اسباب کے لحاظ سے یہ کالج اچھی حالت میں ہے۔کالج کے پاس خوبصورت بلڈنگ اور تقریباً تمام ضروری انفرااسٹرکچر موجود ہے، مگر ان کا خاطر خواہ استعمال نہیں ہورہا ہے۔ اس لئے یہ چیزیں سامان آرائش بنی ہوئی ہیں۔ اچھے اساتذہ کا بندوبست کر کے تعلیم کے نظام اور معیار کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

ارم یونانی میڈیکل کالج۔ لکھنؤ

ارم ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام 6 ستمبر 2004 کو لکھنؤ میں کرسی روڈ پر ارم یونانی میڈیکل کالج کا آغاز ہوا۔ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (چیئر مین آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) کے ہاتھوں یہ رسم انجام پائی۔

اب تک ارم ایجوکیشنل سوسائٹی کے ذریعہ لکھنؤ اور بارہ بنکی میں 36 تعلیمی ادارے قائم ہو چکے ہیں، ان سے تقریباً آٹھ سو اساتذہ، دو سو دیگر ملازمین وابستہ ہیں اور تیرہ ہزار کے قریب طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ ڈاکٹر سید خواجہ محمد یونس، سوسائٹی کے بانی اور روح رواں ہیں۔ انھوں نے 1970 میں اپنی بیٹی ارم کے نام پر اس سوسائٹی کی تشکیل کی تھی۔ 25 فروری 1971 کو ارم ایجوکیشنل سوسائٹی کا ریاستی حکومت کے ذریعہ رجسٹریشن ہوا۔ یہی سوسائٹی ارم یونانی میڈیکل کالج کی منتظم ہے۔ خواجہ صاحب سوسائٹی کے بانی منیجر ہیں۔ وہ سوسائٹی کے تحت چل رہے اداروں کو ملا کر یونیورسٹی کی شکل دینا چاہتے ہیں، توقع ہے کہ آئندہ کچھ برسوں میں ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا۔

کالج کے رسمی آغاز کے تقریباً دو سال بعد داخلہ اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر اشفاق احمد (علیگ) اس کے پہلے پرنسپل تھے۔ ان کے بعد اب ڈاکٹر عبدالحلیم پرنسپل شپ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

حکیم رئیس یونانی میڈیکل کالج۔ سنبھل

یہ کالج جناب دردمند دواخانہ کے بانی حکیم رئیس کے نام سے منسوب ہے۔ رئیس صاحب کی شخصیت اور ان کے طبی فیض کو جاری رکھنے اور اسے مزید پھیلانے کے لئے ان کے بیٹے حکیم ظفر احمد صادق نے حکیم رئیس ایجوکیشنل سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے تحت 2010 میں حکیم رئیس یونانی میڈیکل کالج کے نام سے ایک طبی درسگاہ کی بنیاد رکھی۔ سنبھل، مرادآباد میں ایک بڑے قطعۂ آراضی پر اس کالج کی عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ صوبائی حکومت کی منظوری، چھترپتی شاہو جی مہاراج یونیورسٹی، کانپور سے الحاق اور سی سی آئی ایم، نئی دہلی کی اجازت کے بعد 2013 سے یہاں داخلے اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا ہے، پہلے سال 50 طلبہ کے داخلے ہوئے تھے، ڈاکٹر خالد جمال اس کالج کے پہلے پرنسپل ہیں۔ حکیم ظفر احمد صادق اس کالج کے چیئر پرسن، ان کے بیٹے لقمان احمد صادق مینیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔

ابھی یہ ادارہ تعمیر و ترقی کے مرحلہ میں ہے، مگر اس کے ذمہ داروں کے جذبۂ خلوص اور انتھک جدو جہد سے توقع ہے کہ یہ جلد ہی مستحکم صورت اختیار کر لے گا۔

مدرسہ طبیہ۔ گیا

بہار میں یونانی طب کے تعلیمی نظام کی تنظیم اور توسیع کے لئے جو کوششیں ہوئی ہیں، مدرسہ طبیہ گیا کا شمار اس سلسلہ کی ابتدائی کاوشوں میں ہوتا ہے۔ اس طبی درسگاہ کی بنیاد حکیم سید شاہ محمد حمید فردوسی نے رکھی تھی۔ شاہ صاحب کا آبائی وطن بہار شریف محلہ خانقاہ ضلع پٹنہ تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم الملک مخدوم شاہ شرف الدین احمد یحیٰ منیری سے ملتا ہے۔ ان کے والد سید شاہ امین احمد فردوسی مشائخ کبار میں تھے۔ ان کے خاندان کو بہار اور بنگال میں عزت واحترام کا مرتبہ حاصل تھا۔ سید شاہ محمد حمید فردوسی نے تکمیل الطب، لکھنؤ سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ یہاں سے فراغت کے بعد کچھ دنوں چھپرہ اور دربھنگہ میں رہ کر مطب کیا، مگر یہاں کی فضا راس نہ آنے کی وجہ سے گیا آ گئے اور یہاں مطب شروع کیا۔ گیا کے زمانۂ قیام میں انھوں نے مدرسہ طبیہ کی بنیاد ڈالی۔ ان کے پاس کافی دور دراز سے طلبہ طب سیکھنے آتے تھے، طلبہ کے ساتھ ان کا رویہ بہت ہمدردانہ ہوتا تھا۔ [1]

حوالہ

1۔ رموز الاطباء، مولفہ حکیم محمد فیروز الدین، دار الکتاب رفیق الاطباء، لاہور، 1914، ص 311

درسگاہ طبیہ وشفاخانہ سنجری۔ گیا

اسے حکیم سید محمد ابراہیم نے 1923 میں قائم کیا تھا۔ وہ تکمیل الطب کالج، لکھنؤ کے سند یافتہ تھے۔ 1917 میں تحصیل طب کے بعد شفاخانہ تکمیل الطب میں اسسٹنٹ انچارج اور پروفیسر سرجری مقرر ہوئے۔ انہیں سرجری میں کافی مہارت حاصل تھی۔ ان کے مطب میں ازدحام کا یہ عالم تھا کہ یومیہ چارسو تک مریض ان سے رجوع کرتے تھے۔ بہار گورنمنٹ نے انہیں کوکین کے استعمال کی خصوصی اجازت دی تھی۔ ان سے پہلے بہار کے کسی یونانی طبیب کو یہ اعزاز حاصل نہیں تھا۔[1]

درسگاہ طبیہ، گیا میں طب کی تعلیم مفت ہوتی تھی۔ داخلہ، امتحان وتعلیم کی کوئی فیس نہیں تھی۔ خاص حالتوں میں قیام وطعام اور وظیفہ کا بھی انتظام تھا۔ سرجری کی تعلیم کے لئے شفاخانہ سنجری میں غریبوں کو مفت دوا دی جاتی تا کہ لڑکوں کو عملی تجربات کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملیں۔ وظیفہ یاب طلبہ کے لیے سرجری کی تعلیم ضروری تھی اور انہیں مدت تعلیم پوری کرنے کی ضمانت دینی پڑتی تھی۔[2]

21/دسمبر 1926 کو آنریبل بابو گنیش دت سنگھ منسٹر لوکل سلف گورنمنٹ بہار واڑیسہ نے درسگاہ طبیہ وشفاخانہ سنجری کا معائنہ کیا تھا۔ انھوں نے حکیم محمد ابراہیم آنریری سکریٹری کے کاموں کی ستائش کرتے ہوئے پانچ سو روپے دینے کا اعلان کیا تھا۔[3]

تاریخ اطباء بہار کے مطابق درسگاہ طبیہ گیا صرف چند سال جاری رہ کر بند ہوگئی، لیکن

سنجری شفاخانہ حکیم سید محمد ابراہیم کی وفات 2/دسمبر 1952 تک جاری رہا۔ 1950 میں حکومت بہار نے شفاخانہ کے لئے نوسو روپیہ کی امداد منظور کی تھی، لیکن حکیم سید محمد ابراہیم نے اسے لینے سے منع کردیا تھا۔[4]

صرف چند سال جاری رہنے کی بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ راقم کی نظر سے اس درسگاہ کے ایک طالب علم حکیم سید عبدالعلیم بن سید عبدالحلیم متوطن گیا کی ڈگری گزری ہے، یہ ڈگری درسگاہ طبیہ کے سکریٹری حکیم سید محمد ابراہیم نے 24/فروری 1935 کو جاری کی ہے۔ انھوں نے یہاں سے تین سالہ فارسی نصاب کی تکمیل کی تھی۔ اس نصاب میں میزان الطب، کفایۂ منصوری، تکشیف الحکمت، مخازن التعلیم، طب اکبر، مفرح القلوب، حمیات قانون اور نسخہ نویسی کی تعلیم ہوتی تھی۔ حکیم سید محمد شرف الدین قادری بھی درس گاہ طبیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ وہ 25/دسمبر 1901 کو پیدا ہوئے اور ایک سو پندرہ برس کی عمر میں 29/دسمبر 2015 کو کلکتہ میں وفات پائی اور خانقاہ مجیبیہ، پٹنہ میں مدفون ہیں[5]۔ ان کی اعلیٰ طبی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے پدم شری اور پدن بھوشن جیسے شہری اعزازات سے نوازا تھا۔ راقم کے پاس بانیٔ درسگاہ حکیم سید محمد ابراہیم کی ایک تصویر ہے، اس میں وہ درسگاہ طبیہ کے ہاسپٹل ''شفاخانہ سنجری'' میں ایک آتشکی زخم کا آپریشن کررہے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ مشیر الاطباء (مدیر حکیم محمد حسن قرشی)، مارچ واپریل 1923، ص 12

2۔ الحکیم، جلد 12، شمارہ 11، ستمبر 1927، ص 36

3۔ الحکیم، جلد 12، شمارہ 5، مارچ 1927، ص 33

4۔ تاریخ اطباء بہار (جلد اول)، مؤلفہ حکیم محمد اسرار الحق، پٹنہ لیتھو پریس، 1980، ص 30

5۔ ہندوستان اکسپریس (اردو روزنامہ)، دہلی، 30/دسمبر 2015

مدرسہ طبیہ سوہ سرائے۔ پٹنہ

علاقائی سطح پر طبی تعلیم کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے حکیم عبدالرزاق سوہی بہاری نے یکم جنوری 1928 کو سوہ سرائے بہار شریف ضلع پٹنہ میں اس طبی درسگاہ کی بنیاد رکھی۔ یہاں عربی اور فارسی زبان میں تعلیم ہوتی تھی اور مدت تعلیم تین برس تھی۔ قیام کے وقت سرجری کی تعلیم کا انتظام نہیں تھا، لیکن بانی مدرسہ کا منصوبہ تھا کہ آئندہ تعلیمی میقات سے مدت تعلیم میں ایک سال کا اضافہ کر کے سرجری کی تعلیم بھی دی جائے۔

فارسی درجات میں درج ذیل نصاب پڑھایا جاتا تھا۔

سال اول: قانونچہ (تمام)، مفرح القلوب، کفایۂ منصوری

سال دوم: طب اکبر جلد دوم (تمام)، قرابادین قادری (تمام)، مفرح القلوب از مقالہ پنجم تا ختم کتاب

سال سوم: طب اکبر جلد اول (مکمل)، نسخہ نویسی، مفرح القلوب از ابتداء تا مقالہ پنجم

یہاں عربی درجات کے طلبہ کے لئے درج ذیل نصاب مقرر تھا۔

سال اول: قانونچہ (مکمل)، مفرح القلوب (مکمل)، موجز (مکمل)

سال دوم: اقصرائی کلیات (مکمل)، شرح اسباب (مکمل)، سدیدی معالجات (مکمل)

سال سوم: نفیسی کلیات (مکمل)، حمیات قانون، نسخہ نویسی، حصہ تشریح از کامل الصناعۃ (مجوسی)

محمد مختار سوہی بہاری اس مدرسہ کے ذمہ داروں میں تھے۔ ان کے نام سے شائع ایک اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف صبح میں دو گھنٹہ، چار سے چھ بجے تک تعلیم ہوتی تھی۔[1] اس مدرسہ میں تعلیم کے لئے جو اوقات مختص تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ صرف مقامی طلبہ کے لئے قائم ہوا تھا۔ ورنہ ان اوقات میں غیر مقامی طلبہ کا یہاں تعلیم حاصل کر پانا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ یہ مدرسہ کچھ ہی دنوں جاری رہ کر بند ہو گیا۔

حوالہ

1۔ الحکیم، جلد 13، شمارہ 6، اپریل 1928، ص 34

گورنمنٹ طبی کالج۔ پٹنہ

گورنمنٹ مدراس نے دیسی طبوں کو سائنٹیفک اصولوں پر مبنی مان کر، سرکاری سرپرستی میں ان کی تعلیم کا اہتمام کر کے دور ابتلا میں ایک ایسی نظیر پیش کی تھی، جس کی دوسرے صوبوں میں تقلید کی گئی۔ پھر ان صوبوں میں مدراس کے طرز پر درسگاہوں کے قیام کا مطالبہ ہونے لگا۔ بہار کے لوگ بھی ایک عرصہ سے یہ مانگ کر رہے تھے۔ آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس بھی اس ضرورت کی طرف صوبائی حکومت کو متوجہ کر رہی تھی۔ جب 1926 میں گورنمنٹ بہار واڑیسہ نے اس دیرینہ مطالبہ کو مان کر مدراس کے طرز پر یونانی اور آیورویدک تعلیم کے لئے درسگاہیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو کانفرنس نے اپنے چودھویں اجلاس (منعقدہ 6 تا 8 مارچ 1926) کے موقع پر حکومت کے اس دست اعانت اور سرپرستی کے لئے تہنیتی قرارداد منظور کر کے، اس کے اس اقدام کی ستائش کی تھی۔ [1]

26/جولائی 1926 کو پٹنہ میں گورنمنٹ طبی اسکول کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے رسمی آغاز کے بعد حکومت نے مناسب افراد کے انتخاب اور درسگاہ کے لئے ایک جامع خاکہ اور لائحۂ عمل مرتب کرنے کے لئے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی۔ حکیم عبدالمجید خاں لکھنؤ، حکیم عبدالحلیم لکھنؤ اور حکیم کبیرالدین دہلی اس کمیٹی کے رکن تھے۔ ان ماہرین نے مختلف پہلوؤں پر چار روز کے طویل غور وخوض کے بعد حکیم محمد ادریس (پرنسپل) حکیم مظاہر احمد، مظفرپور (دوم پروفیسر)،

حکیم عبدالحیٔ پٹنہ (سوم پروفیسر)، حکیم خواجہ رضوان احمد (پروفیسر مضامین جدیدہ) کے ناموں کی سفارش کی۔ ان کے باضابطہ تقرر کے بعد یہاں درس وتدریس کا عمل شروع ہوا۔[2] یہاں کا طرزِ تعلیم کافی حد تک طبیہ کالج دہلی سے مشابہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ طبیہ کالج دہلی کی طرح یہاں تعلیم کا ذریعہ عربی اور اردو رکھا گیا۔[3] 14/ دسمبر 1934 کو جاری طبی اسکول کا نیا نصاب، جس کی تکمیل کرنے والوں کو GUMS کی سند دی جاتی تھی، وہ بھی بڑی حد تک طبیہ کالج، دہلی کے طرز پر تھا۔ اس میں جدید مضامین جیسے تشریح، منافع الاعضاء اور سرجری کی تعلیم کا خاص اہتمام تھا۔[4]

طلبہ کی عملی تربیت کے لئے کالج سے ملحق شفاخانہ کا قیام عمل میں آیا۔ 9/ فروری 1927 کو حکیم شاہ عبدالمعید انچارج شفاخانہ اور خادم رسول عطار مقرر ہوئے۔ ابتدائی آٹھ برسوں تک یہ طبی اسکول کرایہ کی عمارت میں چلتا رہا۔ 1934 میں کدم کنواں پٹنہ کے موجودہ کیمپس میں منتقل ہوا۔ 1943 میں اس طبی اسکول نے کالج کا درجہ حاصل کیا۔[5]

1930 میں چار سالہ کورس مکمل کر کے 23 طلبہ پر مشتمل پہلا بیچ فارغ ہوا۔ راقم نے 1932 میں فارغ ایک طالب علم محمد یونس کی سند دیکھی ہے، جسے گورنمنٹ طبی اسکول کی گورننگ باڈی کے پریسیڈنٹ نے اپنے دستخط سے جاری کیا ہے۔ اس میں Passed final examination in Tib تحریر ہے۔ کچھ دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شروع کے فارغین کو فاضل طب کی سند دی گئی تھی۔ ایک طالب علم حکیم نبی بخش سائل متوطن امروہہ، یوپی (وفات1956) نے بھی اس درسگاہ سے فاضل کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہ ایک اچھے طبیب ہونے کے ساتھ صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔ ''گلشن چہار بیت'' کے نام سے ان کا دیوان 1929 میں شائع ہوا تھا۔[6] یہاں فاضل طب کی ڈگری صرف چند برس دی گئی پھر اس کی جگہ GUMS کی سند دی جانے لگی جو 1983 تک دی جاتی رہی۔ 1984 سے BUMS کی سند جاری ہوئی۔ 1934 سے 1952 تک کالج کے ذریعہ ہی اسناد دی جاتی رہیں۔ 1953 سے 1972 تک امتحانات، اسناد اور رجسٹریشن وغیرہ کے معاملات اسٹیٹ فیکلٹی آف آیورویدک میڈیسن کے زیرِ نگرانی رہے۔ 1973 میں یونیورسٹی آف بہار، مظفر پور (اس کا موجودہ نام بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی، مظفر پور ہے) میں حکومت نے دیسی طبوں کی فیکلٹی قائم کر کے ان کی درسگاہوں کے تمام امور اس کے حوالہ

کردیئے۔ تب سے یہ طبی کالج بھی اس یونیورسٹی سے ملحق ہے۔ اب اس کے سارے معاملات اس کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔ [7]

حکیم محمد ادریس یہاں کے پہلے پرنسپل تھے۔ وہ تکمیل الطب کالج، لکھنؤ کے 1910 بیچ کے فارغ تھے۔ 26/جولائی 1926 سے 26/اکتوبر 1950 تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے۔ انھی کی پرنسپلی میں یہاں تعلیم کا آغاز ہوا اور اس ادارہ نے ارتقاء کے مدارج طے کر کے کالج کا مرتبہ حاصل کیا۔ حکیم محمد ادریس کی سبکدوشی کے بعد حکیم عبدالاحد نے اس عہدہ کی ذمہ داری سنبھالی۔ وہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، دہلی کے فارغ تھے۔ 27/اکتوبر 1951 سے 19/فروری 1970 تک انھوں نے اس عہدہ پر خدمت انجام دی۔ ان کے بعد بالترتیب حکیم اشرف کریم (20/فروری 1970 تا 30/اپریل 1981)، حکیم سید علیم الدین بلخی (یکم مئی 1981 تا 31/مارچ 1985)، حکیم شمیم احمد (یکم اپریل 1985 تا 17/دسمبر 1991)، حکیم محمد شہاب الدین (18/دسمبر 1991 تا حال) اس کالج کے پرنسپل ہوئے۔ موخر الذکر سبھی چاروں پرنسپل اسی کالج سے فارغ ہیں۔

1930 میں 23 طلبہ پر مشتمل پہلا بیچ فارغ ہوا تھا۔ دفتری ریکارڈ کے مطابق 2002 تک یہاں سے 1311 طلبہ فارغ ہو چکے تھے۔ [8] اس کالج کو قائم ہوئے 90 برس ہو چکے ہیں، اس طویل مدت کے لحاظ سے فارغین کی تعداد کم ہو سکتی ہے، مگر کردار کے اعتبار سے اس کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ اس کی گنتی ہندوستان کی ان منتخب درسگاہوں میں ہے، جن کے طبی تعلیم کے میدان میں گہرے اثرات ہیں۔ اس کالج کی وجہ سے بہار کا شمار طب کے اہم تعلیمی مراکز میں رہا ہے۔ اس صوبہ کے علاوہ اتر پردیش کے مشرقی اضلاع میں بھی اس کے اثرات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ان ضلعوں کے کئی سو طلبہ نے یہاں سے استفادہ کیا ہے۔

طبی کالج پٹنہ میں مدارس کے فارغین کو خاص مراعات حاصل تھیں۔ کالج کی پہلی میٹنگ میں جو تجاویز منظور ہوئی تھیں، ان میں ایک اہم شق یہ تھی کہ مدارس کے طلبہ، داخلہ و تعلیمی فیس سے مستثنیٰ ہوں گے، مراعات کا یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں اب بھی جاری ہے۔ اس وقت اکثر طبی درسگاہوں کے دروازے اہل مدارس کے لئے بند ہیں، مگر یہاں مختصر تعداد ہی میں سہی آج بھی ان کے لئے نشستیں مخصوص ہیں۔ ان طلبہ کو پری طب کا ایک سالہ اضافی کورس کرا کے بی یو ایم ایس میں

داخلہ دیا جاتا ہے۔ اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ اور فیکلٹی آف یونانی میڈیسن جامعہ ہمدرد کے علاوہ یہ تیسرا کالج ہے جہاں مدارس کے طلبہ کے لئے تحصیل طب کی سہولت ہے۔ ان تینوں درسگاہوں کی وجہ سے فضلاء مدارس کا رشتہ، طب سے استوار ہے۔

قیام سے لے کر اب تک اکثر یہ کالج وسائل کی کمی جیسے مسائل سے دوچار رہا ہے، یہ مسئلے اس کی ترقی کی راہ میں مزاحم رہے ہیں، ورنہ اس کا کردار مزید جامع اور مؤثر ہوتا۔ اگر حکومتی اداروں اور کالج کے ذمہ داروں نے خاطر خواہ توجہ دی ہوتی تو یہ طبی تعلیم کا ایک بڑا ادارہ بن چکا ہوتا۔ کچھ عرصہ پہلے صوبائی حکومت نے کالج کی تجدید کاری کے لئے فنڈ جاری کیا ہے اور مرکزی حکومت نے اسے ماڈل کالج کے طور پر ڈیولپ کرنے کے لئے خصوصی پیکیج دیا ہے۔ اس سے حالات میں کچھ بہتری آنے کی امید پیدا ہوئی ہے۔ لیکن یہ تعاون افرادی اور مادی وسائل کی کمی کی صورت میں پیدا ہونے والے بحران کے لئے بہت ناکافی ہے۔ اس لئے یہ کام بڑے پیمانہ پر کئے جانے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

1۔ المسیح دہلی (دفتر المسیح، دہلی)، اپریل 1926، ص4

2۔ المسیح دہلی (دفتر المسیح، دہلی)، ستمبر 1926، ص56

3۔ ایضاً، ص7

4۔ اے ہسٹری آف یونانی میڈیکل سائنس ان بہار، مؤلفہ ڈاکٹر مظفر الاسلام، بہار یونانی میڈیکل سوسائٹی، 2004، ص41-42

5۔ بہار میں یونانی طب کا ارتقاء، مؤلفہ حکیم سید مظفر احسن، پٹنہ لیتھو پریس، 1985، ص62

6۔ روزنامہ صحافت، دہلی (ادارتی صفحہ)، 11 /جنوری 2013

7۔ اے ہسٹری آف یونانی میڈیکل سائنس اِن بہار، مؤلفہ ڈاکٹر مظفر الاسلام، بہار یونانی میڈیکل سوسائٹی، 2004، ص20

8۔ ایضاً، ص41-81

ذوالفقار حیدر یونانی میڈیکل کالج۔ سیوان

سیوان کا شمار بہار کے مشہور اضلاع میں ہے، اسے ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ راجندر پرشاد کی جائے پیدائش ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہیں موضع فرید پور میں مجاہد آزادی مولانا مظہرالحق کی آخری آرام گاہ ہے۔ 1979 میں اس ضلع کے تاریخی واقعات میں ذوالفقار حیدر یونانی میڈیکل کالج کی شکل میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ یہ کالج سیوان کی ایک معزز شخصیت ذوالفقار حیدر عرف بادل بابو کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے بانی قربان حیدر ہیں، وہی اس کے بانی سکریٹری بھی ہیں۔ قربان حیدر ذوالفقار حیدر کے بڑے بیٹے ہیں۔ کالج کے بانیوں میں ایک اہم نام حکیم اکبر کا بھی ہے۔ مگر کالج قائم ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد نہ جانے کیوں وہ اس سے لاتعلق ہو گئے۔

1979 میں جب یہ کالج قائم ہوا تھا تو اسلامیہ ہائی اسکول، سیوان کی بلڈنگ میں تعلیم وتدریس کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اب اس کالج کے پاس تقریباً چار ایکڑ کے وسیع رقبہ کا ذاتی کیمپس ہے، جو سیوان ریلوے اسٹیشن کے شمال مشرق میں ڈیڑھ کلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے۔

معیار تعلیم کے لحاظ سے یہ کالج بہار کی طبی درسگاہوں میں امتیاز کا حامل ہے۔ حکیم عطاء الرحمٰن اس کے پہلے پرنسپل تھے۔ ان کی سبکدوشی کے بعد کالج کے سینئر استاذ ڈاکٹر زاہد حسین (علیگ) نے عبوری طور پر یہ ذمہ داری سنبھالی۔ 18 نومبر 1990 سے وہ مستقل پرنسپل کی حیثیت سے فرائض

انجام دے رہے ہیں۔اس وقت بہار کی طبی درسگاہوں میں اس کالج کو اعتبار کا جو مرتبہ حاصل ہے وہ دراصل ڈاکٹر زاہد حسین کے حسن انتظام کا نتیجہ ہے۔ پرائیویٹ اداروں میں ایسی مثالیں کم ملتی ہیں، جہاں ایک ہی شخص مسلسل تین دہائیوں تک پرنسپل کے عہدہ پر فائز ملے۔اس سے کالج کے بہتر انتظام، مجلس منتظمہ اور پرنسپل کے اچھے کوآرڈی نیشن کا اظہار ہوتا ہے۔اس کالج کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ بڑی نامور ہستیوں کی اسے سرپرستی حاصل رہی ہے۔ بہار کے سابق وزیر تعلیم مرحوم زوّار حسین مجلس منتظمہ کے پہلے صدر تھے۔ان کے انتقال کے بعد شمائل نبی، سابق وزیر صحت بہار نے ان کی جانشینی کی۔ مارچ 2001 سے نومبر 2005 تک محمد شہاب الدین ممبر پارلیمنٹ صدر رہے۔ان کے بعد نثار حیدر مجلس انتظامیہ کے صدر منتخب ہوئے۔وہ تاحال اس منصب پر فائز ہیں۔

یہ کالج بی آر امبیڈکر یونیورسٹی، مظفر پور سے ملحق ہے۔سی سی آئی ایم اور وزارت صحت بہار کی اسے منظوری حاصل ہے۔ یہاں گریجویشن سطح کی اچھی تعلیم ہوتی ہے۔ یہاں زیر تعلیم طلبہ کی اکثریت دوسرے صوبوں خاص طور پر اتر پردیش، کشمیر اور مہاراشٹر سے تعلق رکھتی ہے۔طالبات کا تناسب تقریباً چالیس فیصد ہے۔کالج سے ملحق سو بستروں کا ہاسپٹل ہے، جس سے مقامی لوگوں کو طبی سہولت اور طلبہ کو عملی مشق کے مواقع مل رہے ہیں۔

یہ کالج انفرااسٹرکچر کے لحاظ سے بہتر صورت میں ہے اور ہندوستان کے ان چند کالجوں میں سے ہے جہاں تعلیم وتدریس کی مناسب سہولتیں موجود ہیں، اس کا اعتراف سی سی آئی ایم کے ذمہ داروں کے ذریعہ کیا گیا ہے، ان سب کے پیچھے محمد شہاب الدین سابق صدر کی مساعی ہیں۔ تعلیم کے میدان میں ان کی اہم خدمات ہیں، دراصل ان کا خواب ایک یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا، وہ چاہتے تھے کہ ان کے زیر انتظام جتنے تعلیمی ادارے چل رہے ہیں، ان سب کو یکجا کر کے اور معیاری شکل دے کر یونیورسٹی کی صورت عطا کر دیں۔ مگر بعض الزامات کے تحت ماخوذ ہوجانے کے باعث ان کے یہ عزائم تکمیل کو نہیں پہنچ سکے۔ وہ ذوالفقار حیدر یونانی میڈیکل کالج کو اس مجوزہ یونیورسٹی کا حصہ بنانا چاہتے تھے اور یہاں ایم ڈی سطح کی تعلیم کے لئے بھی کوشاں تھے۔امید ہے کہ ان کی رہائی کے بعد یہ کالج ایک بار پھر ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا۔

سلفیہ یونانی میڈیکل کالج۔ دربھنگہ

بہار کے دربھنگہ ضلع میں مسلمانوں کی تعلیم کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی بن ڈاکٹر سید عبدالفرید کی بڑی اہم خدمات ہیں، انھوں نے انجمن اہل حدیث ٹرسٹ قائم کر کے اس ضلع میں دینی اور عصری تعلیم کے لئے جو کام کیے ہیں، اس کے اثرات نہ صرف یہاں بلکہ اطراف کے اضلاع میں بھی محسوس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالحفیظ کی تعلیمی اور اصلاحی خدمات کی تحسین کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کہا تھا ''اگر ان کے جیسے دس افراد مسلمانوں میں پیدا ہو جائیں تو ہندوستان میں دعوتی و اصلاحی انقلاب برپا ہو جائے اور اس ملک کا نقشہ بدل جائے۔'' اس وقت انجمن اہل حدیث ٹرسٹ کے تحت دربھنگہ میں جو ادارے چل رہے ہیں ان سے مولانا کے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ دارالعلوم احمدیہ سلفیہ، مدرسہ احمدیہ سلفیہ، تعلیم البنات، سلفیہ اسکول اور ملت کالج وغیرہ سے دربھنگہ اور اس کے اطراف کے مسلمانوں میں مذہبی اور عصری علوم کی نشرواشاعت کے ساتھ ان کے اندر تعلیم کی اہمیت و ضرورت کا احساس بیدار کرنے میں ان اداروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسی ٹرسٹ کے ذریعہ لہری سرائے، دربھنگہ میں 1981 میں سلفیہ یونانی میڈیکل کالج کا قیام عمل میں آیا۔ حکیم عبدالرزاق (سابق ڈائرکٹر سی سی آر یو ایم، نئی دہلی) اور اے آر قدوائی (سابق گورنر صوبۂ بہار) کی دلچسپی اور تعاون نے کالج کی منظوری اور الحاق جیسے دشوار مرحلے بہت آسان کر دیئے۔

ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادگان نے ٹرسٹ کی ذمہ داری سنبھالی اور تندہی سے اپنے والد مرحوم کے عزائم کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہیں اور نہایت سلیقہ سے انتظامی ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی کالج کے بانی سکریٹری تھے، ان کی رحلت کے بعد ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر سید عبدالعزیز سلفی سکریٹری منتخب ہوئے، منجھلے بیٹے ڈاکٹر سید عبدالحکیم جوائنٹ سکریٹری، چھوٹے بیٹے ڈاکٹر عبدالحلیم بحیثیت ڈائرکٹر، کالج کے انتظامی امور میں حصہ لے رہے ہیں۔

حکیم عبدالخالق وامی کالج کے پہلے پرنسپل تھے۔ 1981 سے 1994 تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے۔ ان کے انتقال کے بعد کالج کے سینئر استاذ حکیم محمد معاذ سلفی پرنسپل مقرر ہوئے، دسمبر 2008 تک انھوں نے بطور پرنسپل خدمت انجام دی۔ جنوری 2010 میں ان کا انتقال ہوا۔ محمد معاذ سلفی کی سبکدوشی کے بعد حکیم سلیمان احمد جنوری 2009 سے بحیثیت پرنسپل خدمت انجام دے رہے ہیں، وہ شعبۂ قبالت کے صدر بھی ہیں۔ حکیم محمد انور حسین، نائب پرنسپل کی شکل میں انتظامی امور کی انجام دہی میں انہیں تعاون پیش کر رہے ہیں۔

کالج کے فریدیہ ہاسپٹل میں 75 بستروں کی گنجائش ہے۔ یہاں یونانی اور ایلوپیتھی طریقۂ علاج سے معالجہ کی سہولت ہے۔ یہ ہاسپٹل بانیٔ کالج ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی کے والد ڈاکٹر سید عبدالفرید کے نام موسوم ہے۔

سلفیہ یونانی میڈیکل کالج شعبۂ آیوش، وزارتِ صحت و خاندانی بہبود حکومت ہند سے منظور شدہ اور صوبہ کی بی آر امبیڈکر بہار یونیورسٹی، مظفر پور سے ملحق ہے۔ اب تک طلبہ کے 22 بیچز فارغ ہو چکے ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے۔ یہ صوبہ اور ملک کے مختلف حصوں میں ذاتی مطبوں یا حکومت کے صحتی اداروں سے وابستہ ہو کر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

نظامیہ یونانی میڈیکل کالج۔ گیا

گیا کا شمار نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے اہم شہروں میں ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس شہر کو گوتم بدھ سے نسبت ہے۔ بہار کی طبی تاریخ میں اس شہر کا امتیاز یہ ہے کہ صوبہ میں یونانی طب کی تعلیم کا آغاز سب سے پہلے یہیں سے ہوا تھا۔ حکیم سید شاہ محمد حمید فردوسی نے مدرسہ طبیہ گیا کے ذریعہ اور حکیم سید محمد ابراہیم نے 1923 میں درسگاہ طبیہ اور شفاخانہ سنجری قائم کر کے بہار میں طبی تعلیم کا اہتمام کیا تھا۔ گیا، بہار کے ان اہم شہروں میں ہے جہاں یونانی طب کا پہلے سے بول بالا رہا ہے۔ حکیم سید محمد محامد بیتھوی، حکیم مہدی، حکیم نواب امداد امام اثر (مؤلف رسالۂ طاعون و کاشف الحقائق)، حکیم عنایت کریم، حکیم ضیاء الحسن، حکیم ھادی علی عرف حکیم بڑے صاحب، حکیم منجھلے صاحب، حکیم ننھے صاحب، حکیم محمد مظہر نبی بیتھوی، حکیم سید محمد ابراہیم، حکیم سید محمد ظہیر، حکیم بلال وارثی، حکیم عبدالواسع، حکیم ظفر، حکیم نور احمد گیا کے مشہور طبیبوں میں تھے۔ کہا جاتا ہے، حکیم منجھلے صاحب کے مطب کے سامنے دوا کے لئے استعمال ہونے والے مٹی کے کوزے اور کلھیا بیل گاڑی میں بھر کر پھینکے جاتے تھے۔ حکیم ننھے نواب کے کحل الجواہر کی اتنی شہرت تھی کہ یہ بیرون ملک بھی برآمد ہوتا تھا۔[1] ماضی میں گیا کی طبی شہرت کا تقاضا تھا کہ یہاں مناسب اہتمام کے ذریعہ اس سلسلہ کو جاری رکھنے کی تدابیر کی جاتیں۔ 1952 میں حکیم سید محمد ابراہیم کی وفات کے بعد درسگاہ طبیہ کے بند ہونے سے گزشتہ تین دہائیوں سے جاری طب کی تعلیم

وتدریس کا سلسلہ موقوف ہو گیا تھا۔ اسے دوبارہ شروع کرنے کی ضرورت تھی۔ حکیم انوار الحسن نے اس داعیہ کو محسوس کر کے طب و تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کی توجہ اس جانب مبذول کرنا شروع کی۔ برسوں کی کوشش اور ذہن سازی کے ذریعہ وہ کچھ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہوئے۔ انہیں سید غفران احمد شمیم اور خلیل احمد انصاری کی صورت میں طب کے دو بہی خواہ ملے، جن کے تعاون سے انہیں اپنے خواب کو تعبیر عطا کرنے کا موقع ملا۔ خلیل احمد انصاری نے کنڈی نوادہ روڈ گیا پر واقع اپنی فیکٹری کے وسیع کیمپس کو کالج کے استعمال کے لئے پیش کر کے اس کے قیام کی راہ کا ایک بڑا مسئلہ حل کر دیا۔[2]

اداروں سے بڑی شخصیتوں کی وابستگی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس سے اداروں کو عوام و خواص کا اعتماد حاصل کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اس مجوزہ کالج کے لئے بھی ایسی ہی ایک شخصیت کی تلاش تھی۔ اس مقصد کے لئے سید نظام الدین، ناظم امارت شرعیہ (سابق امیر شریعت بہار، جھارکھنڈ واڑیسہ) سے کالج کی سرپرستی قبول کرنے اور اسے اپنے نام سے منسوب کرنے کی درخواست کی گئی اور انہیں ملّی اور قومی مفاد کے لئے ان گزارشات کو قبول کرنے پر آمادہ کیا گیا۔ مولانا نے اپنے نام کے استعمال کی اجازت دے کر اور اس کی سرپرستی قبول کر کے ایک طرح سے اسے سند اعتبار عطا کر دی۔ بہار، جھارکھنڈ اور اڑیسہ وغیرہ میں مولانا کی شخصیت کافی مقبول تھی۔ یہاں کے لوگ ان پر بے حد اعتماد کرتے تھے۔ نظامیہ یونانی میڈیکل کالج کو مولانا سید نظام الدین کی سرپرستی اور ان کے نام سے منسوب ہونے کا بھرپور فائدہ پہنچا۔[3]

ابتدائی مراحل طے ہونے کے بعد اب رائے عامہ ہموار کرنے کا مسئلہ تھا۔ اس کے لئے 25/جون 1985 حکیم انوار الحسن کے مطب پر عوامی میٹنگ منعقد کر کے علاقہ کے لوگوں کو اعتماد میں لینے کے ساتھ ایک مجلس انتظامی تشکیل دی گئی۔ مولانا سید نظام الدین، سید غفران احمد شمیم، حکیم انوار الحسن، عتیق الرب، محمد عباس، محمد اسلام، صبطین منظر، شفیع الرحمٰن، شکیل احمد انصاری اور مطیع الرحمٰن اس کے رکن منتخب ہوئے۔ انہیں کے زیر اہتمام 22/فروری 1986 کو اخلاق الرحمٰن قدوائی گورنر بہار کے ہاتھوں کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ رسمی آغاز کے بعد ابھی اس کی منظوری وغیرہ کا کام شروع ہی ہوا تھا کہ ایک طوفانی آندھی نے اس مکان کو زمین بوس کر دیا جہاں تعلیم شروع

ہونے والی تھی۔ یہ حادثہ بڑا حوصلہ شکن تھا، مگر کالج انتظامیہ نے ہمت نہیں ہاری۔ اس موقع پر انہیں مولانا سید نظام الدین کی سرپرستی نے بڑا حوصلہ عطا کیا۔ اب طے پایا کہ یہ کالج گیا شہر میں واقع ایک دوسری عمارت ''شمسی بلڈنگ'' میں شروع کیا جائے۔ کالج سے اخلاق الرحمٰن قدوائی کی دلچسپی نے کئی دشوار مرحلوں کو آسان بنا دیا۔ سی سی آئی ایم کی منظوری اور حکومت بہار کے محکمۂ صحت سے اجازت جیسے اہم مسئلے بڑے آرام سے حل ہو گئے۔ بی آر امبیڈکر بہار یونیورسٹی، مظفر پور سے کالج کے الحاق کے بعد داخلے اور تعلیم و تدریس کا کام شروع ہوا۔ عارضی بندوبست کے ذریعہ تعلیمی سلسلہ جاری ہو جانے کے بعد مجلس انتظامیہ نے کالج کے مستقل کیمپس کے لئے گیا شہر سے پانچ کلومیٹر کی مسافت پر، پٹنہ روڈ پر ایک قطعۂ آراضی خریدا۔ 21 ستمبر 1991 کو یہاں امیر شریعت اور کالج کے بانی سرپرست مولانا سید نظام الدین کے دست مبارک سے کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ 1992 سے نئے کیمپس میں تعلیم ہو رہی ہے۔[4]

کالج کے قیام اور اس کی تعمیر و ترقی میں حکیم انوار الحسن کی مساعی قابل ذکر ہیں۔ وہ کالج کے اہم بانیوں میں ہیں۔ وہی اس کے بانی پرنسپل ہیں اور تا حال اس عہدہ پر فائز ہیں۔ حکیم انوار الحسن گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ کے 1977 بیچ کے فارغ ہیں، ان کے والد حکیم عبد الواسع گیا کے مشہور طبیب تھے۔

یہ کالج نظامیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر سوسائٹی گیا کے زیر انصرام چل رہا ہے۔ سوسائٹی کی جدوجہد نے اسے بہت جلدی سی سی آئی ایم کے مجوزہ معیار تک پہنچا دیا۔ تعلیم و تدریس کے ساتھ کالج سے ملحق اسپتال میں سو بستروں کی گنجائش ہے۔ اس میں معالجات، نسواں، اطفال، جراحیات، امراض عین اذن انف و حلق اور تحفظی و سماجی طب کی او پی ڈی اور آئی پی ڈی کا نظم ہے۔ شعبۂ علم الادویہ کے زیر اہتمام فارمیسی قائم ہے۔ یہاں ہاسپٹل میں استعمال ہونے والی یونانی دوائیں اساتذہ کی نگرانی میں طلبہ تیار کرتے ہیں اور دوا سازی کی مشق بہم پہنچاتے ہیں اور ہربل گارڈن میں نباتی دواؤں کی شناخت حاصل کرتے ہیں۔

چونکہ کالج شہر سے پانچ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے اس لئے طلبہ کی آمد و رفت کی سہولت کے لئے بس کا نظم ہے اور کالج میں باہر سے آنے والے مہمانوں کے لئے گیسٹ ہاؤس کا

انتظام ہے۔، بحیثیت مجموعی کالج کی پیش رفت قابل اطمینان ہے۔ مجلس انتظامیہ کے لوگ بڑے خلوص اور لگن سے کالج کو آگے بڑھانے کے لئے کوشاں ہیں۔ اس کالج کے قیام سے گیا میں اس تعلیمی سلسلہ کا احیاء ہوا ہے جسے حکیم سید شاہ محمد حمید فردوسی اور حکیم سید محمد ابراہیم نے شروع کیا تھا۔ اب تک اس کالج سے طلبہ کے پچیس بیچ فارغ ہو چکے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ خطبۂ استقبالیہ، جلسۂ افتتاح نظامیہ یونانی میڈیکل کالج و اسپتال، گیا، مورخہ 22 رفروری 1986 بروز سنیچر، پیش کردہ محمد خلیل انصاری، مطبوعہ تاج پریس، گیا

2۔ یہ تفصیل حکیم انوار الحسن (پرنسپل کالج ہٰذا) کی فراہم کردہ اطلاعات پر مبنی ہیں

4-3 حسب اطلاع حکیم انوار الحسن اور پروفیسر سید فضل اللہ قادری، سابق استاذ گورنمنٹ طبی کالج، پٹنہ

ویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج۔ امرتسر

حکیم ابوتراب عبدالحق اس کالج کے بانی ہیں، وہ 1868/69 میں قصبہ خواص پور ضلع امرتسر میں پیدا ہوئے، ان کے والد مولوی عبدالعزیز دینی علوم کے فاضل تھے، وہ دینا نگر کی جامع مسجد میں امام اور خطیب تھے۔ حکیم ابوتراب عبدالحق کے ننہیال میں کئی مشہور طبیب گزرے ہیں۔ حکیم دسوندی خاں ان کے نانا اور حکیم بدرالدین خاں ماموں تھے۔ غالباً اسی لئے مروجہ علوم کی تحصیل کے بعد حکیم ابوتراب عبدالحق نے طبی تعلیم کے لئے مدرسہ طبیہ میں داخلہ لیا اس سے فراغت کے بعد دینا نگر آئے۔ یہاں کچھ دنوں قیام کرکے امرتسر آگئے اور 1893 میں شفاخانہ اور ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس میں وہ طلبہ کو علم طب کے علاوہ مذہبی تعلیم بھی دیتے تھے۔[1] آگے چل کر یہ مدرسہ یونانی اور آیورویدک اسکول بن گیا۔ 1927 میں اس نے ترقی کرکے کالج کی شکل اختیار کرلی۔[2] یہاں فارغین کو حاذق الاطباء کی سند دی جاتی تھی۔ حکیم ابوتراب عبدالحق کے صاحبزادگان حکیم ابوالفقر شمس الحق خاں، ابوالحسن حکیم محمد احسان الحق خاں اور حکیم ابوالمظہر محمد ظہورالحق اسی کالج کے فارغ تھے۔[3] اس کالج کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ جب دارالعلوم طبیہ بٹالہ قائم ہوا تو اس کے بانیان، ویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، امرتسر سے اپنے کالج کا الحاق کرنا چاہ رہے تھے۔[4]

10/جولائی 1934 کو حکیم ابوتراب عبدالحق کی صدارت میں ایک اجلاس منعقد ہوا۔

اس میں فیصلہ کیا گیا کہ کالج کی ترقی کے لئے بلدیہ امرتسر سے امداد طلب کی جائے۔[5] چنانچہ یہ درخواست قبول کرتے ہوئے بلدیہ نے مالی امداد اور زمین دینے کا وعدہ کیا تھا۔[6]

بیرونی طلبہ کی رہائش کے لئے کالج میں دارالاقامہ کا نظم تھا۔ اس کے فارغین کو یہاں کی سند کی بنیاد پر کئی ریاستوں میں ملازمت کی سہولت تھی۔ اس کالج کے امتحان میں پرائیویٹ طور پر بھی شرکت کی اجازت تھی۔ حکیم ابوتراب عبدالحق کے بعد حکیم ابوالفقر شمس الحق پرنسپل ہوئے، وہ آخر تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ نصف صدی سے زائد عرصہ تک طبی تعلیم کے میدان میں خدمت انجام دینے والا یہ کالج 1947 میں تقسیم کے سانحہ کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

حوالہ جات

1۔ رموز الاطباء، مؤلفہ حکیم محمد فیروز الدین، دار الکتاب رفیق الاطباء لاہور، 1914، ص 400-399

2۔ آئینہ تاریخ طب، مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ، 2001، ص 389

3۔ رموز حکمت مؤلفہ حکیم عبدالرحیم خاں جمیل، اسٹیم پریس گجرات، مطبوعہ 1937، ص 250 اور 588

4۔ الحکیم، جلد 25، شمارہ 8، جون 1939، ص 41

5۔ الحکیم، جلد 19، شمارہ 10، اگست 1934، ص 37

6۔ الحکیم، جلد 20، شمارہ 2، دسمبر 1934، ص 43

بھوپندر طبیہ کالج۔ پٹیالہ

اس کالج کے بانی اور مہتمم شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں بھٹی تھے، وہ پٹیالہ کے مشہور قصبہ سنام میں پیدا ہوئے۔ ان کے اہل خاندان، سنام کے راجپوت تھے۔ طبابت کے لحاظ سے ان کا خاندان پٹیالہ ریاست کا سب سے بڑا اور مشہور خاندان تھا۔ اس خاندان کے کئی افراد شاہی طبیب کے اعزاز سے مفتخر ہوئے ہیں۔[1]

شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں نے مروجہ تعلیم کے ساتھ اپنے والد حکیم محمد علی خاں سے طب کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، حافظہ بہت عمدہ پایا تھا، محض چودہ برس کی عمر میں انھوں نے ''رباعیات طب یوسفی'' حفظ کرلیا تھا۔ ابھی چودہ سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ تایا حکیم مہر علی خاں شاہی طبیب سے طب کی انتہائی کتابیں پڑھیں، انہیں سے مطب و معالجہ کی تربیت حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد 1914 میں پٹیالہ میں مطب شروع کیا۔ فنی قابلیت اور ذہانت کی بدولت علاج و معالجہ میں بہت جلد شہرت حاصل کرلی۔ 1917 میں ہز ہائنس کردن پرنس مہاراجہ ادھیراج والی بڑودہ کے علاج کے لئے مدعو کئے گئے۔ دوسرے امراض کے ساتھ مہاراجہ کے معدہ اور جگر میں صلابت بھی تھی۔ حکیم دلبر حسن خاں کو ان کے کامیاب اور شاندار معالجہ پر معقول فیس کے ساتھ ایک خطیر رقم بطور انعام پیش کی گئی۔ امراء اور والیان ریاست کے علاوہ بہت سے یورو پین آفیسر بھی ان کے زیر علاج رہے ہیں۔ یہ اعزاز بہت کم ہندوستانی طبیبوں کے

حصہ میں آیا ہے۔ انگلستان کے معروف پروفیسر ڈاکٹر ایل ایف رشبروک ولیمس جو محکمۂ انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا کے ڈائرکٹر تھے (وہ ریاست پٹیالہ کے وزیر خارجہ بھی رہے ہیں) انہیں شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں سے بڑا تعلق خاطر تھا، انھوں نے انگلستان کے مشہور اخباروں میں لکھا تھا کہ حکیم دلبر حسن خاں جس معجزانہ حذاقت کے حامل ہیں اسے دیکھ کر یونانی طب کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ رشبروک ولیمس کا یہ مضمون ہندوستان کے کئی انگریزی اور اردو اخباروں میں بھی شائع کیا گیا تھا۔ حکیم دلبر حسن خاں کی فنی قابلیت کی وجہ سے گورنمنٹ آف انڈیا نے انہیں شفاء الملک کا گرانقدر خطاب عطا کیا تھا، وہ پنجاب کے پہلے شخص تھے جنہیں یہ خطاب مرحمت ہوا تھا۔ لب المجربات، گنجینۂ مجربات اور طبی فارماکوپیا ان کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔[2]

بھوپندر طبیہ کالج کا قیام حکیم دلبر حسن خاں کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس کالج کو صوبۂ پنجاب کی پہلی باقاعدہ درسگاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کی وجہ سے پنجاب اور اس کے اطراف میں طبی تعلیم کی اشاعت ہوئی۔ 1925 میں اس کالج کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا۔ ابتدأ یہ کالج دارالعلوم پٹیالہ کے نام سے موسوم تھا لیکن بانی کالج نے یہ سوچ کر کہ اس دارالعلوم کو ہندو کالج کی طرح (جو کہ مہاراجہ کے جدامجد کے نام سے منسوب تھا) مہاراجہ بھوپندر کے نام سے منسوب کردیا جائے تو اس کے وقار میں مزید اضافہ ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں مہاراجہ کے حضور ایک درخواست پیش کی، جسے انھوں نے منظور فرماتے ہوئے دارالعلوم طبیہ کو اپنے نام سے منسوب کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ یہ اجازت نامہ گورنمنٹ پٹیالہ کی طرف سے پٹیالہ گزٹ مورخہ 25 مئی 1927 میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔[3]

اکثر بیانوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بھوپندر طبیہ کالج (دارالعلوم طبیہ پٹیالہ) کا قیام 1925 میں ہوا تھا جب کہ زبدۃ الحکماء حکیم محمد حسن قرشی کے بیان سے ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے، وہ دلبر حسن خاں کے بارے میں لکھتے ہیں "اس وقت آپ شاہی مطب اور مدرسہ طبیہ پٹیالہ کے مہتمم ہیں"، قرشی کی یہ تحریر 1923 کے اوائل کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گرچہ بھوپندر طبیہ کالج کا باقاعدہ آغاز 1925 میں ہوا۔ مگر غیر رسمی طور پر اس کی ابتدا پہلے سے ہو چکی تھی۔[4]

بھوپندر طبیہ کالج میں حکیم مولوی مفتی حشمت اللہ پہلے پرنسپل مقرر ہوئے ڈاکٹر راجارام،

جو ٹی شفاخانہ پٹیالہ کے انچارج تھے، وہ اناٹومی اور فزیالوجی کی تعلیم پر مامور ہوئے۔ ان کے علاوہ یہاں کے ابتدائی اساتذہ میں حکیم احمد حسن اور حکیم محمد بشیر خاں کا نام ملتا ہے۔ یہاں عربی اور اردو کی دو علاحدہ جماعتیں تھیں اور مدت تعلیم دو سال تھی۔ اردو جماعت کا آخری امتحان پاس کرنے والوں کو حاذق الحکماء (پہلے اس جماعت کا نام طبیب کامل تھا مگر بعد میں بدل کر حاذق الحکماء کر دیا گیا) اور عربی جماعت کے طلبہ کو طبیب اکمل کا ڈپلومہ دیا جاتا تھا۔ حاذق الحکماء کے پہلے سال کے نصاب میں قانونچہ (اردو)، موجز (اردو)، میزان الطب (مکمل)، طب اکبر (جلد اول)، مفرح القلوب (مکمل)، کتاب الادویہ، تشریح الابدان (نصف اول) اور دوسرے سال کے نصاب میں طب اکبر جلد دوم، لب المجربات، تشریح الابدان اور کتاب الجراحت پڑھائی جاتی تھی۔ طبیب اکمل کے پہلے سال کے نصاب میں نفیسی فن اول، شرح اسباب جلد اول، کتاب الادویہ، تشریح الابدان نصف اول، کلیات قانون (شیخ الرئیس) اور سال دوم کے نصاب میں شرح اسباب جلد دوم، حمیات قانون، تشریح الابدان (مکمل) اور کتاب الجراحت کی تعلیم ہوتی تھی۔ سالانہ امتحان کے علاوہ سہ ماہی امتحان بھی ہوتے تھے اور سالانہ امتحان میں شرکت کے لئے ستر فیصد حاضری لازمی تھی۔ پرائیوٹ طور پر بھی طلبہ امتحان میں شریک ہوسکتے تھے۔ تعلیم شام پانچ بجے سے شروع ہوتی تھی۔ 5

مذکورہ بالا تفصیلات اس زمانہ کی ہیں جب بھوپندر طبیہ کالج قائم ہوا تھا۔ اس کے بعد کے زمانہ میں یہ مکمل طور پر ڈے کالج ہوگیا تھا اور یہاں ڈھائی سال 6 پھر تین سال کا نصاب پڑھایا جانے لگا۔ 7

کالج میں حاذق الحکماء کی تعلیم کا پہلا سال مکمل ہونے پر امتحانات ہوئے۔ اس وقت کے ممتحنین کی جو تفصیل ملتی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ موجز کا پرچہ حکیم محمد شریف، ایڈیٹر رسالہ الحکیم، لاہور نے، قانون کا پرچہ حکیم ابوتراب عبدالحق نے اور دیگر پرچے حکیم حشمت اللہ (پرنسپل) اور ڈاکٹر راجا رام نے بنائے تھے۔ 7

کالج کے قیام کو ایک سال پورا ہونے پر 13 رجنوری 1927 کو پہلا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ وزیر خارجہ ریاست پٹیالہ پروفیسر ایل ایف رشبروک ویلمس نے اس کی صدارت فرمائی تھی۔

اس جلسہ میں ریاست کے دیگر عمائدین جیسے ایڈمنسٹریٹیو کونسل کے صدر راجہ گرودت سنگھ بہادر اور ریاست کے وزیر داخلہ نواب لیاقت حیات خاں کے علاوہ اطراف و اکناف کے جلیل القدر اطباء کثیر تعداد میں شریک ہوئے تھے۔ [8]

کالج کے پہلے سالانہ جلسہ کے موقع پر ریاست کے وزیر داخلہ نے اعلان کیا تھا کہ اس کالج کی اعانت کا مسئلہ حکومت کے زیر غور ہے، چنانچہ 1927 میں ریاست کی طرف سے اسے نوسو روپے سالانہ کی گرانٹ جاری ہوئی۔ الحکیم جون 1928 کی اشاعت سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست نے ایک سال کے اندر ہی اس گرانٹ میں اضافہ کر کے اسے اٹھارہ سو روپیہ سالانہ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ حکومت کی طرف سے اسے اور بھی کئی مراعات عطا کی گئیں تھیں۔ مثلاً تشریح کی عملی مشق کے لئے نعشوں کی فراہمی کی حکومت نے اجازت دے رکھی تھی۔ [9]

اس کے علاوہ یہاں طلبہ کو یہ اجازت تھی کہ وہ ریاست کے راجندر ہسپتال میں جراحت اور جدید طریقۂ تشخیص کی مشق حاصل کر سکتے ہیں۔ راجندر ہسپتال کی اجازت دلوانے میں پروفیسر ایل ایف رشبروک ولیمس کی مساعی کا بڑا دخل تھا۔ اس اجازت کے بعد ڈاکٹر ڈبلیو جی وینس بہادر ڈائرکٹر آف میڈیکل سروسز نے بھوپندر طبیہ کالج کے طلبہ کی ہاسپٹل میں حاضری کے لئے ایک علاحدہ رجسٹر رکھوا دیا تھا اور طلبہ ہر ایک وارڈ میں مامور کئے جاتے تھے۔ [10]

زمانہ قیام ہی سے بانیان کالج کی کوشش رہی کہ یہاں طلبہ کو یونانی کے ساتھ جدید طب کے اہم اصولوں کی تعلیم دی جائے۔ اسی لئے طلبہ کی تعلیم کے واسطے ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جب پہلے بیچ کے حاذق الحکماء کے نتائج کا اعلان ہوا تو اس بات کا ذکر بطور خاص کیا گیا تھا کہ اب سکنڈ ایئر کے طلبہ کو دنداں سازی اور آنکھوں کے آپریشن کے ساتھ خون، بلغم، قارورہ کا ڈاکٹری طریقہ پر امتحان، انجکشن اور دوسرے آلات کے استعمال کی ترکیب سکھائی جائے گی۔ [11]

الشفاء کے نام سے اس کالج کا ایک ماہانہ ترجمان تھا۔ اس کے مدیر حکیم محمد اسلم جالوی بہاری تھے۔ یہ رسالہ ابتداء میں پٹیالہ سے شائع ہو رہا تھا، بعد میں اس کا مرکزی دفتر دہلی منتقل ہو گیا تھا۔ اس کے سرپرست حکیم دلبر حسن خاں تھے۔ رسالہ کی شرح چندہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کالج کے ترجمان کے علاوہ مالی تعاون کا بھی ایک وسیلہ تھا۔ عام لوگوں کے لئے اس کا سالانہ

چندہ ڈیڑھ روپیہ جب کہ روٗسا کے لئے پانچ روپے اور والیان ریاست کے لئے یہ شرح پچیس روپے تھی۔

میرے پیش نظر ''الشفاء'' کے دو شمارے ہیں، ایک اگست 1927 کا ہے، جو پٹیالہ سے شائع ہوا ہے۔ دوسرا شمارہ جنوری، فروری 1945 کا ہے، یہ دہلی سے شائع ہوا ہے۔ موخرالذکر شمارہ سے بھوپندر طبیہ کالج کے بارے میں کئی اہم معلومات سامنے آتی ہیں۔ اس کے مطابق کالج میں داخلہ کی اہلیت انٹرنس یا منشی، مولوی اور ادیب تھی۔ مدت تعلیم تین سال تھی اور فارغین کو حاذق الحکماء کی سند دی جاتی تھی۔ اساتذہ میں حکیم اور ڈاکٹر دونوں تھے۔ طب کے ساتھ ڈاکٹری کے ضروری مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔ کالج کا اپنا خیراتی شفاخانہ تھا۔ یہاں اساتذہ کی نگرانی میں طلبہ تشخیص وتجویز سیکھتے اور صیدلاتی مشق بہم پہنچاتے تھے۔ شفاخانہ میں استعمال ہونے والی دوائیں طلبہ کے ذریعہ تیار کروائی جاتی تھیں۔ بھوپندر طبیہ کالج، اقامتی ادارہ تھا۔ یہاں ہندو مسلم اور سکھ تینوں مذاہب کے طلبہ کی رہائش کا انتظام تھا، مگر ہر ایک کے کھانے کا علاحدہ بندوبست تھا۔ کالج کا استاد دارالاقامہ کا انچارج ہوتا اور طلبہ میں سے ہاؤس مانیٹر اور فوڈ مانیٹر ہوتے تھے۔ پنجاب گورنمنٹ نے یہاں کے سند یافتگان کو میونسپل کمیٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور چھوٹے قصبات کی کمیٹیوں میں بطور طبیب ملازم رکھے جانے کا امتیازی حق عطا کر رکھا تھا۔ گورنمنٹ یو پی اور گورنمنٹ سی وبرار نے اس کالج کی سند کو تسلیم کرتے ہوئے یہاں کے طلبہ کو خاص مراعات دے رکھی تھی۔ اتر پردیش انڈین میڈیسن بورڈ نے اس کالج کے سند یافتگان کے رجسٹریشن کی منظوری دی تھی۔ ریاست بھوپال نے بھی اس کالج کو تسلیم کیا تھا۔ کالج کی کفالت کا ذریعہ ریاست پٹیالہ کا مالی تعاون اور طلبہ کی فیس سے حاصل ہونے والی رقم تھی۔ جب کالج کا دائرہ وسیع ہوا تو بڑھے ہوئے مصارف کے لئے یہ رقم ناکافی ہوگئی۔ شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں نے کالج کو جاری رکھنے کے لئے تقریباً چالیس ہزار روپے اپنی جیب سے خرچ کردئے۔ پھر بھی یہ کالج تقریباً دس ہزار کا مقروض تھا۔ کالج کو جاری رکھنے کے لئے بادل ناخواستہ عوام سے تعاون کی اپیل کی گئی۔ حالانکہ پہلے جلسہ تقسیم اسناد کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تقریب میں شریک طب کے کئی بہی خواہوں نے مالی تعاون کی پیش کش کی تھی، مگر شفاء الملک نے اس وقت منع کردیا تھا۔ جنگِ عظیم ثانی کے یہ

اثرات تھے کہ میٹرک پاس طلبہ کو بھی اس زمانہ میں اچھی ملازمتیں مل جاتی تھیں۔ اس لئے عام کالجوں میں طلبہ کے داخلہ کا تناسب کم ہو گیا تھا۔ طبی کالجوں میں یہ تناسب اور بھی کم تھا۔ چنانچہ بھوپندر طبیہ کالج پٹیالہ میں ڈیڑھ سو طلبہ سے تعداد کم ہوتے ہوتے صرف 31 یا 32 رہ گئی تھی اور اخراجات دو چند ہو گئے تھے۔ کالج کو جاری رکھنے کے لئے مالی وسائل بڑھانے کی ضرورت تھی۔ حکیم امان اللہ خاں رئیس اعظم ملتان، نے جو کالج کے بہی خواہوں میں تھے، عوام سے تعاون کی اپیل کی اور ایک اسکیم یہ رکھی کہ کالج کی مجلس مشاورت میں ایک فیصد ممبران کا اضافہ کیا جائے اور ہر اس بہی خواہ کو اس کالج کا ممبر بنایا جائے جو کم از کم سو روپیہ کی مدد کرے۔ الشفاء میں شائع ایک اطلاع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے ایک سند یافتہ حاذق الملک ڈاکٹر مرزا مختار عالم گورکانی دہلوی نے یہاں سے فراغت کے بعد لیبوریٹری ٹریننگ حاصل کی اور اردن اسپتال میں ایک سال کام کرنے کے بعد امریکن فوجی اسپتال میں طبی خدمات کے لئے مامور ہوئے۔[12]

ابھی یہ کالج مالی مشکلات اور ملکی و عالمی حالات سے نبرد آزما تھا ہی کہ تقسیم ہند کا المیہ پیش آ گیا۔ اس کی وجہ سے پنجاب کے مسلمان اور وہاں کے مسلم ادارے جس تباہی سے دوچار ہوئے وہ ہندوستان کی تاریخ کا نہایت المناک باب ہے۔ بھوپندر طبیہ کالج بھی انہی حالات کی نذر ہو کر بند ہوا۔ حکیم محمد اصغر شروانی (شیخ المعالجات) اس کالج کے آخری پرنسپل تھے۔

بھوپندر طبیہ کالج کا شمار پنجاب کی اہم طبی درسگاہوں میں رہا ہے۔ اس نے یہاں طبی تعلیم کی اشاعت میں کافی اہم کردار ادا کیا ہے۔ تقسیم کے بعد جب حالات بہتر ہوئے تو حکیم عبدالحمید دہلوی نے آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے پلیٹ فارم سے کئی موقعوں پر بھوپندر طبیہ کالج کو دوبارہ شروع کرنے کا حکومت سے مطالبہ کیا تھا۔ برہان پور میں منعقد 1957 کے اجلاس میں انھوں نے حکومت سے مطالبہ کرتے ہوئے کہا تھا:

> "بعض ریاستوں میں کسی عذر کی بنا پر جو درسگاہیں بند کی گئی ہیں، ان کو مناسب مدد دے کر دوبارہ جاری کیا جائے۔ آصفیہ طبیہ کالج بھوپال، طبیہ کالج بمبئی اور بھوپندر طبیہ کالج پٹیالہ پھر سے کھولے جائیں اور ان کے انتظامات کا معقول بندوبست کیا جائے۔"[13]

حکیم عبدالحمید نے کئی موقعوں پر اس مطالبہ کو دہرایا ہے، مگر اب تک اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے کسی مثبت ردعمل کا اظہار نہیں ہوا ہے۔ کانفرنس کے موجودہ عہدداروں اور کلیدی عہدوں پر متمکن یونانی طب کے ذمہ داروں کو اس مسئلہ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

1۔ مشیر الاطباء (مدیر حکیم محمد حسن قرشی)، مارچ، اپریل 1923، ص 62

2۔ رموز حکمت، مرتبہ حکیم محمد عبدالرحیم جمیل، اقبال اسٹیم پریس، گجرات، مطبوعہ 1937، ص 29-28

3۔ الحکیم، جلد 13، شمارہ 4، فروری 1928، ص 27

4۔ مشیر الاطباء (مدیر حکیم محمد حسن قرشی)، مارچ، اپریل 1923، ص 62

5۔ الحکیم، جلد 11، شمارہ 9، جولائی 1926، ص 32-29

6۔ الطبیب لاہور، جلد 5، شمارہ 7، جولائی 1938، ص 44

7۔ الحکیم، جلد 12، شمارہ 2، دسمبر 1926، ص 38

8۔ الحکیم، جلد 12، شمارہ 4، فروری 1927، ص 35 اور 37

9۔ الحکیم، جلد 12، شمارہ 6، اپریل 1927، ص 4

10۔ الحکیم، جلد 13، شمارہ 4، فروری 1928، ص 27

11۔ الحکیم، جلد 12، شمارہ 2، دسمبر 1926، ص 38

12۔ الشفاء دہلی، جلد 17، شمارہ 1، 2، جنوری، فروری 1945، ص 3

13۔ خطبات حمید از حکیم عبدالحمید، مرتبہ ڈاکٹر خاور ہاشمی، خواجہ پریس، دہلی، 1995، ص 92

اجمل طبیہ کالج۔ امرتسر

تقسیم سے پہلے پنجاب کے جو شہر طبی تعلیم اور تحریک کے مرکز تھے، ان میں امرتسر کا نام بھی شامل ہے۔ اطبائے امرتسر نے یونانی اور آیورویدکی اشاعت کے لئے جو اہتمامات کئے تھے اس کا اندازہ یہاں قائم تعلیمی اداروں سے ہوتا ہے۔ تقسیم سے پہلے اس شہر میں یونانی طب کے دو کالج موجود تھے۔ اجمل طبیہ کالج، امرتسر اور ویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، امرتسر۔ اس شہر میں بیک وقت ان دو طبی درسگاہوں کی موجودگی سے یہاں کے لوگوں کی طب سے دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔
اجمل طبیہ کالج امرتسر میں یونانی طب کے ساتھ آیوروید کی تعلیم کا انتظام تھا۔ یہاں یونانی کی دو جماعتیں، ملک الحکماء اور عمدۃ الحکماء اور ایک جماعت آیوروید کی، شری ویدراج قائم تھی۔ اس زمانہ کی اکثر طبی درسگاہوں کی طرح اجمل طبیہ کالج میں بھی پرائیویٹ تعلیم کا نظم تھا۔ اس زمانہ کے طبی رسالوں میں ایسے بہت سے اشتہار نظر آتے ہیں، جس میں خواہش مند حضرات کو پرائیویٹ امتحان میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ 1

یہاں یونانی اور آیوروید کی ڈپلومہ سطح کی تعلیم کا انتظام تھا، یہاں پڑھائے جانے والے نصاب کی مدت دو سال تھی۔ امتحانات کی جو تفصیل ملتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سندی اور غیر سندی دو طرح کے امتحانات ہوتے تھے۔ 2

کالج میں تقسیم اسناد کا آٹھواں جلسہ 25 / نومبر 1945 کو منعقد ہوا تھا۔ اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ یہ کالج 1936 یا 1937 میں قائم ہوا ہوگا۔ اس جلسہ کی روداد سے پتہ چلتا ہے کہ حکیم خیر محمد صاحب کالا باغ ضلع میانوالی اور وید دیوراج امرتسر مشترکہ طور پر اس جلسہ کے صدر تھے۔ تقسیم اسناد کے اس اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعہ پنجاب، یو پی، سی پی برار، کشمیر، پٹیالہ، بھوپال اور بھاول کی حکومتوں سے اس کالج کو تسلیم اور منظور کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔[3]

حکیم مولوی ابوالحسن محمد احسان الحق خاں کالج کی گورننگ باڈی کے جنرل سکریٹری تھے۔ دراصل وہی اس کالج کے روح رواں تھے۔ امرتسر میں 1947 میں فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے وہ 12 راگست 1947 کو راولپنڈی منتقل ہوگئے، ان کے بعد یہ کالج بھی بند ہوگیا۔ راولپنڈی پہنچ کر وہاں کے حکام اور اطباء کے تعاون سے اجمل طبیہ کالج، راولپنڈی کے نام سے اس کی باز آبادکاری کا منصوبہ بنایا۔ انھوں نے اپنے ان عزائم کا اظہار 1948 میں جاری ایک اعلانیہ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''12 راگست 1947 کو میں فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے سرزمین امرتسر کو خیرباد کہہ کر 13 راگست کو راولپنڈی پہنچ گیا۔ اب کالج کو از سر نو راولپنڈی میں جاری کرنے کے انتظامات کئے جارہے ہیں۔ فی الحال مجھے اس قدر عرض کرنا ہے کہ انشاء اللہ تکمیل انتظامات کے فوراً بعد اجمل طبیہ کالج راولپنڈی کے اجرا کا اعلان کردیا جائے گا۔ راولپنڈی شہر کے جو حکام اور حضرات اطباء کرام خصوصاً جناب حکیم حاکم الدین، حکیم محمد یحیٰ عبدالحمید، حکیم محمد اسلم حیات، حکیم ڈاکٹر خواجہ غلام محی الدین، حکیم انتظام الدین، حکیم غلام نبی، حکیم یٰسین، حکیم حافظ محمد شرف الحق، حکیم منیر فتح شاہ، تکمیل انتظامات کے سلسلہ میں میرا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ میں ان کا صمیم قلب سے سپاس گزار ہوں۔''[4]

حوالہ جات

1۔ حکیم دکن، جلد 9، شمارہ 3، اپریل 1945، ص 31

2۔ الطبیب لاہور، جلد 5، شمارہ 8، اگست 1938، ص 38

3۔ حکیم دکن، جلد 9، شمارہ 12، جنوری 1946، ص 31-30

4۔ تکمیل الطب، جولائی 1948، شائع کردہ تکمیل الطب کالج لکھنؤ، ص 30

مدرسہ طبیہ، ویسٹرن یونیورسٹی۔ کپورتھلہ

دستیاب تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ ویسٹرن یونیورسٹی کپورتھلہ نے مدرسہ طبیہ کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا تھا، جہاں فاصلاتی طرز پر یونانی طب کی تعلیم ہوتی تھی۔ زبدۃ الحکماء حکیم عبدالحق (کپورتھلہ) ایک عرصہ تک اس شعبہ کے مہتمم رہے۔ اس کے امتحان میں اردو اور فارسی کی استعداد رکھنے والے وہ طلبہ شرکت کے اہل تھے، جنھوں نے کسی مدرسہ سے طب پڑھی ہو یا کم از کم ایک سال کسی مستند طبیب کے مطب سے وابستہ رہے ہوں۔ یہاں تین پرچوں کا امتحان ہوتا تھا۔ کامیابی کے لئے ان میں سے ہر ایک میں 33 فی صد نمبر لانا ضروری تھا۔ یہ تینوں پرچے درج ذیل کتابوں کے سوالات پر مشتمل ہوتے تھے۔

1۔ میزان الطب　　2۔ مخزن حکمت (باب فن جراحی)　　3۔ قانونچہ

4۔ کفایہ منصوری　　5۔ طب اکبر　　6۔ تشریح الابدان

16 رجنوری 1927 کو رواں سال کے لئے امتحان بورڈ کے درج ذیل اراکین منتخب ہوئے۔

1۔ زبدۃ الحکماء مولوی حسام الدین (صدر)

2۔ زبدۃ الحکماء حکیم عبدالقادر شاہی طبیب (نائب صدر)

3۔ فاضل طب حکیم محمد چراغ۔ طبیب سرکاری و میونسپل کمشنر

4۔ زبدۃ الحکماء حکیم فیض　　5۔ عمدۃ الحکماء حکیم سلطان بخش خواجپوری

6۔ عمدۃ الحکماء حکیم عبدالرحمٰن دارپوری

7۔ مولوی خیر محمد

8۔ ڈاکٹر عبدالحمید حکیم حاذق

9۔ زبدۃ الحکماء حکیم عبدالحق طبیب سرکاری و میونسپل کمشنر

10۔ زبدۃ الحکماء مولوی محمد عالم 11۔ عمدۃ الحکماء حکیم نذر محمد

امتحان پاس کرنے والے طلبہ کو طبیب حاذق کی سند دی جاتی تھی۔ 1

حوالہ

1۔ الحکیم، جلد 12، شمارہ 6، اپریل 1927، ص 38-37

چھاچھی طبیہ کالج۔ ڈنگہ، گجرات

چھاچھی طبیہ کالج کا قیام ڈنگہ، ضلع گجرات (پنجاب) میں اپریل 1936 میں ہوا تھا۔ یہ بھوپندر طبیہ کالج پٹیالہ سے ملحق تھا۔ حکیم ڈاکٹر سید محمد اکبر علی زیدی یہاں تقریباً دو برس پرنسپل رہے۔ [1]

سید محمد اکبر علی زیدی کا سلسلۂ نسب سلطان الاولیاء سید محمد گیسو دراز گلبرگہ شریف حیدر آباد دکن سے ملتا ہے۔ ان کے بزرگ مغلیہ عہد میں حیدر آباد سے سیالکوٹ، پنجاب آئے تھے۔ سید محمد اکبر علی زیدی طبیہ کالج دہلی کے فارغ تھے۔ ان کے برادر بزرگ حکیم سید محمد مظفر علی، رسالہ معین الصحت، دہلی کے ایڈیٹر تھے۔ [2]

حوالہ جات

1۔ الطبیب لاہور، جلد 7، شمارہ 1، 2، جنوری۔ فروری 1940، ص 193

2۔ رموز حکمت مؤلفہ حکیم محمد عبدالرحیم جمیل، اقبال اسٹیم پریس گجرات، 1937، ص 41

دارالعلوم طبیہ۔ بٹالہ

ڈسٹرکٹ ویدک اینڈ یونانی طبیہ کمیٹی بٹالہ کے اجلاس منعقدہ دس مئی 1939 کو اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ بٹالہ میں ایک طبی اسکول کھولا جائے۔ اس کا نام دارالعلوم طبیہ بٹالہ رکھا جائے اور اس کا الحاق ویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج امرتسر سے ہو۔ یہ میٹنگ حکیم مولوی عبدالشکور کے دولت کدہ پر منعقد ہوئی تھی۔[1]

اس سلسلہ کی دوسری میٹنگ خان بہادر صوبیدار میجر ولی محمد خاں میونسپل کمشنر بٹالہ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میں کالج کے اراکین اور ڈسٹرکٹ ویدک اینڈ یونانی طبیہ کمیٹی نے، سب کمیٹی کے ذریعہ مرتب کردہ کالج کے اصول وضوابط پر بحث ومباحثہ کے بعد اسے حتمی شکل دی۔ ڈسٹرکٹ ویدک اینڈ یونانی طبیہ کمیٹی بٹالہ کی ایک میٹنگ کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم مولوی محمد ابراہیم طبیہ کالج بٹالہ میں علم تشریح کے پروفیسر تھے۔[2]

یہ کالج قیام کے کچھ دنوں بعد بند ہوگیا تھا۔ 27/اپریل 1940 کو ڈسٹرکٹ ویدک اینڈ یونانی طبیہ کمیٹی بٹالہ کے تیسرے سالانہ اجلاس میں کمیٹی کے ذمہ داروں نے اعلان کیا تھا کہ بعض وجوہات کی بنا پر دارالعلوم طبیہ بٹالہ کو بند کردیا گیا ہے۔[3]

حوالہ جات

1۔ الحکیم، جلد 25، شمارہ 8، جون 1939، ص 41

2۔ الطبیب لاہور، جلد 7، شمارہ 9، ستمبر 1940، ص 40

3۔ الطبیب لاہور، جلد 7، شمارہ 4، ستمبر 1940، ص 42

قدوسیہ طبیہ کالج۔ مدراس

قدوسیہ طبیہ کالج کا قیام 1913 میں ہوا تھا۔اس کی وجہ سے ہندوستان کے ایک ایسے علاقہ میں یونانی طب کی اشاعت ممکن ہوئی، جہاں اس کی روایتیں بہت مستحکم نہیں تھیں۔اپنے اس خاص کردار کی وجہ سے یہ کالج ہندوستان کی طبی تاریخ میں اہمیت کا مقام رکھتا ہے۔اس کالج کے قیام اور اس کے انتظام وانصرام کے باب میں انجمن مشرقی اطباء جنوبی ہند، مدراس کی مساعی کافی اہم ہیں۔جنوبی ہندوستان میں اس تنظیم کا، طبیبوں کی بیداری، ان کے حقوق کی بازیابی اور طب کی اشاعت میں بڑا اہم کردار رہا ہے۔جب اس کالج کی بنیاد پڑی تھی، اس وقت تعلیم کے ساتھ یونانی طب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کی تحریک زوروں پر تھی۔یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں طبی تعلیم کے جتنے ادارے قائم ہوئے، ان سبھی کے نصاب میں جدید مضامین کی تعلیم کا اہتمام ملتا ہے۔قدوسیہ طبیہ کالج میں بھی یونانی طب کے ساتھ مغربی طب کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔اسی لئے یہاں کے تدریسی عملہ میں اطباء اور ڈاکٹر دونوں شامل تھے۔

اس کالج میں دو طرح کا نصاب رائج تھا۔ایک نصاب مدرسہ سطح کا تھا، جس کی مدت تین سال تھی اور اس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔دوسرا نصاب کالج سطح کا تھا، اس کی تعلیمی مدت چار برس تھی، اس کی تعلیم عربی زبان میں ہوتی تھی۔اس کالج میں کوئی تعلیمی فیس نہیں تھی۔علاوہ بریں مستحق طلباء کو وظائف دیئے جاتے تھے۔بیرونی طالب علموں کی رہائش کے لئے دارالاقامہ کا نظم تھا۔

کالج سے ملحق ''دارالشفاء یونانی'' کے نام سے ایک شفاخانہ قائم تھا۔ یہاں غریبوں کا علاج مفت ہوتا تھا۔ یہ شفاخانہ عوامی چندہ اور مدراس کارپوریشن کی گرانٹ سے چلتا تھا۔ شفاخانہ کی ہشت ماہی رپورٹ (یکم مئی 1922 سے 31/دسمبر 1922) کے مطابق اس مدت میں پینتیس ہزار چھ سو اٹھاسی غریب مریضوں کا علاج مفت کیا گیا تھا اور انہیں بلاقیمت دوائیں دی گئی تھیں۔ اس شفاخانہ سے مستفید ہونے والوں میں بلاامتیاز ہندو، مسلم، عیسائی ہر مذہب وملت کے لوگ شامل تھے۔ دارالشفاء یونانی کے اس بڑے مرجوعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس علاقہ کے لوگوں کو یونانی علاج پر کس قدر اعتماد تھا۔ مذکورہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شفاخانہ میں دوسرے عملہ کے علاوہ دو تنخواہ دار اور دو اعزازی طبیب مامور تھے۔[1]

قدوسیہ طبیہ کالج میں جدید مضامین مثلاً تشریح، منافع الاعضاء اور جراحیات وغیرہ کی تعلیم انگریزی زبان میں ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے یہاں داخلہ کے شرائط میں انگریزی زبان کا جاننا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ چونکہ شمالی ہندوستان کی طبی درسگاہوں میں ان مضامین کی تعلیم اردو زبان میں ہوتی تھی اس لئے یہاں کے طبیبوں نے قدوسیہ طبیہ کالج کی اس روش کو ہدف ملامت بنایا اور ان مضامین کی انگریزی زبان میں تدریس کو طلبہ پر ایک غیر ضروری بوجھ خیال کرتے ہوئے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔[2] شمالی ہند کے اطباء کا یہ عمل غیر منصفانہ معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ شمالی ہندوستان کی طرح، جنوبی ہندوستان کا اپنا مخصوص لسانی مزاج ہے، ان کے لئے انگریزی زبان اس طرح غیر مانوس نہیں ہے جس طرح یہ اتر بھارت کے لوگوں کے لئے ہے۔ لہٰذا وہاں کے لئے انگریزی ذریعہ تعلیم کو معیوب قرار دے کر اس کی تنقیص مناسب نہیں تھی۔ بلکہ تعلیم کے سلسلہ میں علاقائی لسانی تقاضوں کی رعایت ایک مستحسن طرز عمل ہے، لہٰذا اس کی پذیرائی ہونی چاہیے تھی، اس لئے کہ مانوس زبان میں تعلیم زیادہ بہتر نتائج کی حامل ہوتی ہے اور جنوبی ہندوستان انگریزی زبان سے مانوس رہا ہے۔ چونکہ اس کالج کے طلبہ کی اکثریت اسی علاقہ کی تھی اس لئے وہاں ذریعہ تعلیم کے طور پر انگریزی زبان کا انتخاب بالکل درست تھا۔

انجمن مشرقی اطباء جنوبی ہند، مدراس کے بارہویں سالانہ اجلاس بابت 1924 کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ خان بہادر محمد عبدالقدوس، جو انجمن مشرقی اطباء جنوبی ہند اور قدوسیہ

طبیہ کالج کے بانی تھے، وہی اس کے بیشتر اخراجات کی کفالت کرتے تھے۔ جب مصارف بڑھنے لگے تو طب کے دوسرے بہی خواہوں سے آگے آ کر کالج کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے کی درخواست کی گئی۔ اس رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ درج ذیل اساتذہ تعلیم و تدریس کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ حکیم ابوالخیر عبدالقادر افضل العلماء جو تکمیل الطب کالج، لکھنؤ کے سند یافتہ تھے، کلیات پڑھایا کرتے تھے، حکیم سید شاہ ابو محمد مظہر اللہ مدنی (سند یافتہ تکمیل الطب کالج، لکھنو) معالجات کی تدریس پر مامور تھے، حکیم و ڈاکٹر سید نعمت اللہ تشریح، افعال الاعضاء، جراحی، علم القابلہ اور علم الجراثیم جیسے جدید مضامین پڑھاتے تھے۔ حکیم سید مخدوم اشرف حمیات، علم الادویہ، معالجات مخصوصہ کی تعلیم دیتے تھے۔ طلبہ دارالشفاء میں جا کر مطب عملی، تشخیص و تجویز اور دوا سازی کی مشق حاصل کرتے تھے۔[3]

جب حکومت مدراس نے دیسی طبوں کی تعلیم کے لئے انٹگریٹڈ اسکول قائم کیا تو قدوسیہ طبیہ کالج اس میں ضم کر دیا گیا۔

حوالہ جات

1۔ المسیح (دفتر المسیح دہلی)، جلد 3، شمارہ 3، نومبر 1923، ص 58 تا 62

2۔ المسیح (دفتر المسیح دہلی)، جلد 6، شمارہ 1، ستمبر 1926، ص 7

3۔ حامی الصحت لاہور، جلد 5، شمارہ 3، جنوری 1926، ص 6

گورنمنٹ اسکول آف انڈین میڈیسن۔ کیلپاک، مدراس

انجمن مشرقی اطباء جنوبی ہند، مدراس کی بارہویں سالانہ رپورٹ بابت 1924 سے معلوم ہوتا ہے کہ مدراس گورنمنٹ نے حکیم محمد عثمان بہادر اور سکریٹری مسٹر جی سرنیواسا مورتی کی صدارت میں دیسی طبوں کی صورت حال کے جائزہ کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ اس میں سبھی دیسی طبوں کے حاملین کو نمائندگی کا موقع دیا گیا، طویل جائزہ کے بعد کمیٹی نے مدراس میں دیسی طبوں کی فلاح و بہبود سے متعلق تجاویز پیش کیں، جسے آنریبل راجہ صاحب پنگل بالقابہ وزیر اعظم گورنمنٹ آف مدراس نے قبول کرتے ہوئے دیسی طبوں کی ترقی کے لئے اقدامات کئے۔ گورنمنٹ اسکول آف انڈین میڈیسن کا قیام بھی کمیٹی کی سفارشات کا حصہ تھا۔ [1]

اس اسکول کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہاں یونانی، آیورویدک، سدھا نیز ڈاکٹری کی تعلیم کا انتظام تھا۔ کامیاب طلبہ کو گورنمنٹ کی طرف سے ایل آئی ایم کی ڈگری عطا ہوتی تھی۔ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے شفا خانوں میں یہاں کے فارغین سرکاری طبیب مقرر ہونے کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ یہاں یونانی طلبہ کے داخلہ کے لئے اردو لیاقت کے ساتھ کسی قدر انگریزی کی استعداد ضروری تھی۔ [2]

سرکاری اہتمام میں ہونے کے ساتھ اس اسکول کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ساری ہندوستانی طبوں کی تعلیم کا انتظام تھا۔ حکیم سید ظل الرحمان کی اطلاع کے مطابق اس اسکول کو

1926 میں ترقی دے کر کالج کا درجہ دیا گیا اور 1961 تک یہاں تعلیم ہوتی رہی۔[3] ماہنامہ الحکیم جولائی 1928 کے شمارہ میں داخلہ کا اشتہار شائع ہوا ہے۔ اس میں گورنمنٹ اسکول آف انڈین میڈیسن۔ کیلپاک مدراس تحریر ہے۔ اس لئے 1926 میں اسکول سے ترقی دے کر کالج کا درجہ دیئے جانے کی بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی اور پتہ چلتا ہے کہ کم ازکم جولائی 1928 تک اسے کالج کا درجہ نہیں مل سکا تھا۔

الحکیم کے شذرات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قدیم طبوں کے ساتھ جدید تشریح اور جراحی کی تعلیم کا خاص اہتمام تھا۔ مسٹر جی سرینواسا مورتی اس اسکول کے پہلے پرنسپل منتخب ہوئے تھے۔[4]

حوالہ جات

1۔ حامئ الصحت لاہور، جلد 5، شمارہ 3، جنوری 1926، ص 8-7

2۔ الحکیم، جلد 13، شمارہ 9، جولائی 1928، ص 33

3۔ آئینہ تاریخ طب، مرتبہ حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 2001، ص 388

4۔ الحکیم، جلد 11، شمارہ 6، اپریل 1926، ص 31

گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج۔ چنئی

1961 میں مدراس (چنئی) کا انٹگریٹڈ کالج کے بند ہونے کے بعد یہاں طبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں رہا۔ جب 1975 میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کا دسواں اجلاس مدراس میں منعقد ہوا تو حکیم عبدالحمید نے صدارتی خطبہ میں ذمہ داران ریاست کی توجہ طبی تعلیم کی ضرورت کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا تھا:

> "کسی بھی علم یا فن کے وجود کو قائم رکھنے کے لئے اس کی درسگاہ کا قیام اولین ضرورت ہے۔ مدراس میں انٹگریٹڈ میڈیسن کا ایک کالج قائم تھا، لیکن 1961 میں وہ بند ہوگیا تب سے یہاں یونانی طب کی تعلیم کے لئے کوئی درسگاہ نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ریاستی حکومت یہاں ایک یونانی کالج تعلیمی سال 1975 سے شروع کرے گی۔"[1]

مدراس میں کانفرنس کے اس اجلاس سے وہاں کے طبیبوں میں ایک نئی توانائی پیدا ہوئی۔ انھوں نے کانفرنس کے اس مطالبہ کو نہایت پرزور انداز میں اٹھایا، ان کی جدوجہد رنگ لائی اور تمل ناڈو حکومت کی جانب سے 1979 میں گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج، چنئی کا قیام عمل میں آیا۔ اس سلسلہ میں حکیم سید خلیفۃ اللہ، حکیم سید خلیل اللہ قادری اور حکیم سید حبیب اللہ کی مساعی نہایت اہم ہیں۔ کالج کے قیام کے بعد اس کے بندوبست کے لئے حکومت نے حکیم سید حبیب اللہ کو خصوصی آفیسر مقرر کیا۔ 1987 تک وہی اس کالج کے جملہ امور کے نگراں تھے اور انہی کے پاس

پرنسپل شپ کا چارج تھا۔ یہاں 1979 میں پری طب سے تعلیم کا آغاز ہوا تھا۔ مگر 1990 کے بعد پری طب ختم کر کے براہ راست بی یو ایم ایس کی تعلیم ہونے لگی۔

1987 میں حکیم سید حبیب اللہ کی سبکدوشی کے بعد حکیم امام الدین جو علی گڑھ کے فارغ تھے، پرنسپل مقرر ہوئے۔ 2006 تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے۔ ان کے بعد 2006 سے 2008 تک حکیم قاضی رضی الدین احمد اور عزیز باشا حسینی وغیرہ کے پاس عارضی طور پر پرنسپل شپ کا چارج رہا پھر 2009 میں حکیم شاہ الحمید پرنسپل مقرر ہوئے۔ تا حال وہی اس عہدہ پر فائز ہیں۔

قیام کے وقت گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج، چنئی کا الحاق یونیورسٹی آف مدراس سے تھا۔ 1988 سے یہ تمل ناڈو ڈاکٹر ایم جی آر میڈیکل یونیورسٹی سے ملحق ہے۔ یہ صوبہ کا تنہا کالج ہے، اس میں اس وقت 26 طلبہ کے داخلہ کی گنجائش ہے جو صوبہ کی بڑی تعلیمی ضرورت کے لحاظ سے ناکافی ہے۔ اس لئے کم از کم پچاس نشستیں کئے جانے کا مطالبہ ہے۔

یہ کالج ارگنرانا گورنمنٹ ہاسپٹل آف انڈین میڈیسن کے کیمپس میں واقع ہے۔ اس ہاسپٹل میں سبھی دیسی طبوں سے علاج کی سہولت دستیاب ہے۔ اس کا ایک حصہ یونانی طب کے لئے مختص ہے۔ اس میں سو بستروں کی گنجائش ہے۔ ہاسپٹل کا یہ حصہ گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج کے تصرف میں ہے۔ ہاسپٹل سے ملحق دیسی ادویات کی فارمیسی ہے، جس میں ہاسپٹل میں استعمال ہونے والی دوائیں تیار ہوتی ہیں۔ یہیں کالج کے طلبہ دواشناسی اور صیدلاتی مشق حاصل کرتے ہیں۔ یونانی ہاسپٹل میں روزانہ ڈھائی تین سو مریضوں کا مرجوعہ رہتا ہے۔ اس کالج میں طالبات کے لئے ہوسٹل کی بھی سہولت ہے جس میں 72 طالبات کے رہنے کا انتظام ہے۔

حوالہ

1۔ خطبات حمید از حکیم عبدالحمید، مرتبہ ڈاکٹر خاور ہاشمی، خواجہ پریس، دہلی، 1995 ص 240-239

گورنمنٹ یونانی طبیہ کالج۔ سری نگر

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں کشمیر یونانی طبی کانفرنس، صوبہ کی ایک نمائندہ تنظیم کے طور پر سامنے آئی۔ اس کی تحریک پر یہاں کی حکومت کو طبی تعلیم کی ضرورت کا احساس ہوا۔ شیخ محمد عبداللہ کے وزارت عظمیٰ کے منصب پر متمکن ہونے کے بعد کانفرنس نے ان کے سامنے یہ مطالبہ رکھا کہ کشمیر میں یونانی طب ایک اہم عوامی ضرورت ہے، اس لئے اسے منظم اور منضبط کرنے کے لئے یہاں طبی کالج کا قیام بے حد ضروری ہے۔ اس مطالبہ کے نتیجہ میں مجوزہ آئین ''نیا کشمیر'' میں وعدہ کیا گیا کہ یونانی اور آیورویدک کو ان کا جائز حق دیا جائے گا، لیکن اس وعدہ کے ایفا کی نوبت بہت دیر میں آئی۔ کانفرنس نے ہمت ہارے بغیر تگ ودو کا سلسلہ جاری رکھا، اس کی کوششیں اس وقت ثمر بار ہوئیں جب شیخ صاحب کے جانشین بخشی غلام محمد وزیر اعظم بنے۔ ان کے دور حکومت میں یونانی طبیہ کالج سری نگر اور آیورویدک کالج جموں کی منظوری ملی۔ گورنمنٹ یونانی طبیہ کالج، سری نگر کا قیام اطباء کشمیر کی مشترکہ جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ انفرادی حیثیت میں سید محمد شاہ کاظمی (منور آباد، سری نگر) کا نام بہت نمایاں ہے، وہ منبع الطب کالج لکھنؤ کے فارغ التحصیل تھے۔

حکومت کی منظوری کے بعد 1961 میں گورنمنٹ یونانی طبیہ کالج، سری نگر، نواح شہر میں قمرداری محلہ میں ایک کرایہ کی بلڈنگ میں شروع ہوا، جو کچھ مدت بعد قلب شہر میں امیراکدل علاقہ کی ایک سرکاری عمارت میں منتقل ہوگیا۔ بخشی غلام محمد (وزیر اعظم جموں کشمیر) کی دعوت پر

وید جانکی ناتھ حکیم نے اولین پرنسپل کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی۔ ان کے زمانہ پرنسپلی میں کالج کا نصاب طے پایا، اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا اور تعلیم وتدریس کا آغاز ہوا۔ یہاں ملازمت سے پہلے وید جانکی ناتھ حکیم، بنارس میں بطور پرنسپل خدمت انجام دے چکے تھے۔ اس کے علاوہ وہ صدر جمہوریہ ہند کے اعزازی معالج بھی تھے۔

جانکی ناتھ کی سربراہی میں داخلہ کے اصول وضوابط اور معیار طے پائے۔ دہلی اور علی گڑھ کے طرز کا نصاب پڑھائے جانے کی تجویز ہوئی۔ بارہویں پاس طلبہ کو براہ راست BUMS میں جبکہ میٹرک اور اس کے مساوی اہلیت رکھنے والوں کو پری طب میں داخلہ دیا جاتا تھا۔ پری طب کا اضافی نصاب عربی، انگریزی، بائیولاجی، فزکس اور کیمسٹری پر مشتمل تھا۔ اسے پڑھانے کے لئے پروفیسر سید محمد سعید اندرابی، سومناتھ کول، موہن لال ناظر، مختار احمد، عبدالرشید وغیرہ اور طبی مضامین کی تدریس کے لئے پروفیسر حکیم قدرت اللہ وائس پرنسپل (سند یافتہ دہلی)، پروفیسر حکیم ابوالحسن عبیداللہ (سند یافتہ لکھنؤ)، پروفیسر حکیم محمد قیام الدین (سند یافتہ لکھنؤ)، حکیم محمد امین قریشی، حکیم محمد شریف قریشی، حکیم مفتی محمد طاہر، پران ناتھ کول (سند یافتہ علی گڑھ) مامور ہوئے۔ بعد میں محمد امین مسعودی، بال کرشن بھٹ (سند یافتگان دہلی)، غلام محمد رینہ، مدھوسدھن رینہ (سند یافتگان دہلی) زمرۂ اساتذہ میں شامل ہوئے۔ ان کے علاوہ جدید مضامین کی تعلیم کے لئے گورنمنٹ میڈیکل کالج کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔

گورنمنٹ یونانی طبیہ کالج کے پہلے پرنسپل وید جانکی ناتھ حکیم تھے۔ ان کے بعد ڈاکٹر موہن لال قاضی بعد ازآں ڈاکٹر غلام محمد اور آخر میں پروفیسر حکیم محمد قیام الدین پرنسپل ہوئے۔ امتحانات کے انعقاد اور تعلیمی امور کی نگرانی کے لئے جموں کشمیر ہیلتھ سروسز کے ڈائرکٹر کی طرف سے ایک بورڈ بنایا گیا تھا جو تعلیم اور امتحان سے جڑے معاملات کی نگرانی کر رہا تھا۔ جب طلبہ کی فراغت کا وقت آیا تو سوال کھڑا ہوا کہ انہیں ڈگری کون دے۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے کشمیر یونیورسٹی میں فیکلٹی آف یونانی میڈیسن قائم کی گئی۔ پروفیسر حکیم محمد قیام الدین اس کے ڈین مقرر ہوئے۔ فیکلٹی کا قیام پروفیسر حکیم محمد قیام الدین کا بڑا کارنامہ ہے۔ 1965 میں اس کے وجود میں آنے کے بعد داخلہ، تعلیم اور اسناد عطا کرنے کا کام فیکلٹی کے ذریعہ انجام پانے لگا۔

کشمیر یونانی طبی کانفرنس ریاست میں طبی کاز کے لئے جدوجہد کرنے والی نمائندہ تنظیم تھی۔ گورنمنٹ یونانی طبی کالج، سری نگر کے قیام میں اس کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ امتداد وقت کے ساتھ اس کی فعالیت میں کمی آنے لگی، اسی کے ساتھ طب کے لئے بلند ہونے والی صدائے احتجاج بھی دھیرے دھیرے مدھم پڑنے لگی۔ سربراہان حکومت کی دلچسپی جو پہلے بھی نہیں تھی، عوامی آواز کمزور پڑنے کے بعد بالکل ختم ہوگئی۔ غلام محمد صادق (وزیر اعلیٰ) کے زمانۂ حکومت میں داخلے عملاً رک گئے۔ جب 1975 میں شیخ محمد عبداللہ وزارت اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے تو انھوں نے حکم امتناعی کے ذریعہ کالج اور ہاسپٹل کو بند کردیا اور یہاں کے ملازمین کو صوبہ کی ڈسپنسریوں پر تعینات کردیا۔ حکومت کے معاندانہ رویہ کی وجہ سے یہ کالج بہت کم عرصہ جاری رہ پایا۔ آزادی کے بعد کشمیر جیسی ریاستوں سے طبی تعلیم کے اہتمام کے سلسلہ میں بڑی امیدیں تھیں۔ توقعات کے برعکس یہاں یہ سلسلہ بہت دیر سے شروع ہوا اور تھوڑے ہی دنوں جاری رہ کر بند ہوگیا۔ چونکہ اس کا عرصۂ حیات بہت مختصر رہا اس لئے مفید نتائج کے تناظر میں اس کا کردار کچھ زیادہ نہیں ہے۔ مگر بند ہوکر اس نے اپنے پیچھے طبی تعلیم کی ضرورت کا جو احساس چھوڑا ہے، وہ اس کا بے حد اہم پہلو ہے۔

یونانی میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل، انسٹی ٹیوٹ آف ایشین میڈیکل سائنسز۔سری نگر

اس کالج کا قیام انسٹی ٹیوٹ آف ایشین میڈیکل سائنسز ٹرسٹ جموں اینڈ کشمیر کے تحت اکتوبر 1993 میں ہوا تھا۔حکومت جموں اینڈ کشمیر سے منظوری اور یونیورسٹی آف کشمیر سے الحاق کے بعد 1994 میں سی سی آئی ایم نے داخلہ کی اجازت عطا کی،تب سے یہاں درس وتدریس کا سلسلہ ہے۔حکیم میاں خورشید احمد بخش ٹرسٹ کے اساسی رکن اور کالج کے بانی پرنسپل ہیں۔ 1980 میں جامعہ ہمدرد سے فراغت کے بعد وہ تقریباً دس برس جموں اینڈ کشمیر میں میڈیکل آفیسر رہے۔صوبہ میں طبی تعلیم کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے انھوں نے ملازمت سے مستعفی ہوکر دو بہی خواہان طب محمد اشرف خاں اور محمد یوسف خاں کے ساتھ مذکورہ ٹرسٹ کی تشکیل کی اور اس کے تحت یہ یونانی کالج قائم کیا۔محمد اشرف خان شعبۂ مالیات کے اور محمد یوسف خان انتظامی امور کے نگراں ہیں۔

سری نگر سے چند کلومیٹر کے فاصلہ پر کالج کا کیمپس ہے جو درسگاہ، فارمیسی، ہربل گارڈن

اور جدید سہولیات سے آراستہ سو بستروں کے ہاسپٹل پر مشتمل ہے۔

کالج کو قائم ہوئے ابھی صرف دو دہائی ہوئی ہے اور یہ ہنوز استحکام کے مرحلہ میں ہے، لیکن یہاں تعلیم و تدریس کا معیار اطمینان بخش ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں بیرون صوبہ ایم ڈی کے مقابلہ جاتی امتحانوں میں یہاں کے طلبہ نے جس عمدہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے اس سے یہاں کے اچھے تعلیمی ماحول کا اندازہ ہوتا ہے۔ توقع ہے کہ مستقبل میں یہ کشمیر میں طبی تعلیم کا ایک بہتر ادارہ ثابت ہوگا۔

کشمیر طبیہ کالج، ہاسپٹل اینڈ ریسرچ سینٹر۔ سری نگر

سید محمد رضا صفوی (وفات 2010) نے بعض اصحاب خیر کے تعاون سے علاقہ میں تعلیمی اور رفاہی کاموں کے لئے 1994 میں نیو کشمیر ایجوکیشنل سوسائٹی کی تشکیل کی تھی۔ اس تنظیم نے ریاستی حکومت کی اجازت سے ٹنگہ پورہ سری نگر سے اپنے منصوبوں کا آغاز کیا اور صحتی مسائل کی اہمیت وضرورت کے پیش نظر انہیں سوسائٹی کی توجہات کا محور بنایا اور ٹنگہ پورہ سری نگر میں ایک شفاخانہ اوراس سے ملحق لیبوریٹری اور فارمیسی قائم کی پھر طبی تعلیم کا منصوبہ بنایا۔ 23/ مارچ 1995 کو ریاستی حکومت کی اجازت اور سی سی آئی ایم کی منظوری سے سوسائٹی کے زیر اہتمام طبی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ کالج کا قیام ایک بڑا منصوبہ تھا، جب کہ سوسائٹی کے وسائل محدود تھے۔ لہٰذا اس نے حکومت سے تعاون کی درخواست کی، ساتھ ہی اس کے اراکین نے اپنی بساط کے مطابق کالج کے لئے مطلوبہ اسباب ووسائل کی فراہمی کے لئے جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ انھوں نے دھیرے دھیرے ان سبھی چیزوں کا بندوبست کرلیا جو سی سی آئی ایم کے تقاضوں کے لحاظ سے ضروری تھیں۔ نگران کا انتظام کرنے میں سوسائٹی کو سخت پریشانوں سے دوچار ہونا پڑا اور سوسائٹی تنگ حال ہوگئی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ آئندہ کی ضرورتوں کا سامان کس طرح ہو۔ حالات کی تنگی نے سوسائٹی کے حوصلے توڑ دیئے۔ مالی دشواریوں کے ساتھ سوسائٹی میں اختلافات ابھرنے لگے اور

حالات اتنے خراب ہو گئے کہ کالج میں داخلہ اور تعلیم کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔

اس کالج کو نئے سرے سے شروع کرنے کے لئے 2005 میں ایک نئی انتظامیہ سامنے آئی، اس نے کالج کو اپنی تحویل میں لیا۔ محمد ابراہیم بیگ نئی انتظامیہ کے چیئر مین ہیں، ان کے اہتمام میں آنے کے بعد یہ کالج سعدہ کدل منتقل ہوا۔ یہاں 2007 سے داخلہ اور تعلیم کا دوبارہ سلسلہ شروع ہوا، اس مجلس منتظمہ نے 2009 میں سری نگر سے تقریباً اٹھارہ کلومیٹر کے فاصلہ پر شلوت (سوناواری) ضلع بانڈی پورہ میں کالج کا نیا کیمپس تعمیر کر کے اسے مستحکم شکل دینے کی سمت میں ایک اہم پیش رفت کی ہے۔ موجودہ انتظامیہ ایک توسیعی منصوبہ کے تحت طب کے ساتھ یونانی دواسازی کا دو سالہ کورس بھی شروع کرنے جا رہی ہے۔

کالج کی ترقی کے سلسلہ میں افرادی وسائل کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے موجودہ ذمہ داروں نے ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن کشمیر کے سبکدوش ڈپٹی ڈائرکٹر حکیم محمد اقبال کی خدمت حاصل کی ہے۔ ان کے انتظامی تجربات سے فائدہ اٹھانے کے لئے انہیں پرنسپل کی ذمہ داری تفویض کی ہے۔

یہ کالج قیام کے بعد سے مستقل مالی مسائل سے دوچار ہے۔ اگر چہ نئے ذمہ داروں کی نگرانی میں آنے سے اس کے حالات کسی قدر بہتر ضرور ہوئے ہیں، لیکن جدوجہد کا دور ابھی پورے طور پر ختم نہیں ہو پایا ہے۔ امید ہے کہ آزمائشوں کے اس دور سے نکلنے کے بعد یہاں تعلیم وتدریس کے بہتر مواقع پیدا ہوں گے اور یہ کالج صوبۂ کشمیر میں طب کی اشاعت کا ذریعہ بن سکے گا۔

محسن ملت یونانی میڈیکل کالج۔رائے پور

یہ طبی درسگاہ 2002 میں معرض وجود میں آئی ہے۔ابھی اس کے قیام کو محض دس برس ہوئے ہیں۔اداروں کے لحاظ سے اس مدت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔اگر ادارے کا وجود سماجی سہارے پر منحصر ہو تو پھر اس مدت کی حیثیت اور بھی کم ہو جاتی ہے۔لہٰذا حصولیابیوں کے تناظر میں اس کالج کے متعلق کسی قسم کی رائے زنی ابھی بے معنیٰ ہے۔لیکن ان صالح جذبوں کی تحسین ضروری ہے،جس کے نتیجہ میں ایسا گرانقدر ملی اور سماجی کام انجام پایا ہے۔محسن ملت یونانی میڈیکل کالج کا قیام ملی اور سماجی لحاظ سے واقعی ایک اہم خدمت ہے۔اس کے قیام سے جہاں صوبہ کے لوگوں کو طب کی تحصیل کے مواقع فراہم ہوئے ہیں،وہیں اس سے صوبہ کے اندر یونانی طب کے فروغ اور نشرواشاعت کی امید پیدا ہوئی ہے۔

مولانا اکبر علی فاروقی اس کالج کے بانی اور روح رواں ہیں۔انھوں نے 1990 میں محسن ملت یونانی طب ایجوکیشن سوسائٹی کی تشکیل کی تھی۔مولانا اس کے بانی چیئرمین ہیں۔ان کی قیادت میں یہ سوسائٹی چھتیس گڑھ کے اندر طبی کاز کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔محمود علی فاروقی (ریٹائرڈ سیشن جج)، حاجی قطب الدین، معین الدین فاروقی (ریٹائرڈ فوڈ کنٹرولر)، ڈاکٹر فریدالدین (یونانی میڈیکل آفیسر) اس سوسائٹی میں بحیثیت رکن مولانا کو تعاون پیش کر رہے

ہیں۔ محسن ملت یونانی طب ایجوکیشن سوسائٹی ایک رجسٹرڈ تنظیم ہے، 1990 میں اس کا رجسٹریشن عمل میں آیا تھا، اس کے زیر اہتمام محسن ملت یونانی میڈیکل کالج کا 2002 میں قیام عمل میں آیا۔ یہی سوسائٹی اس کالج کی نگراں ہے۔ یہ کالج مجاہد آزادی محسن ملت مولانا حامد علی فاروقی کے نام موسوم ہے۔ اس علاقہ میں مولانا حامد علی فاروقی کی سماجی، ملی اور مذہبی معاملات میں بڑی اہم خدمات رہی ہیں۔ انہیں جہد آزادی کی پاداش میں 1922 میں جیل بھی جانا پڑا تھا۔

مولانا حامد علی فاروقی نہایت بلند سیاسی قد کے مالک تھے، وہ پنڈت جواہر لال نہرو کے معتمدین میں تھے۔ پنڈت جی کا الیکشن، جوانھوں نے پھولپور الٰہ آباد سے لڑا تھا، اس انتخابی مہم کا انچارج فاروقی صاحب کو بنایا تھا۔ روزنامہ ''مدھیہ بھارت''، الٰہ آباد کی 1952 کی اشاعت سے معلوم ہوتا ہے کہ منہاج پور، الٰہ آباد میں منعقد ایک سبھا کو اندرا گاندھی اور لال بہادر شاستری کے ساتھ فاروقی صاحب نے بھی خطاب کیا تھا۔ ان کی اعلیٰ سیاسی خدمات کے اعتراف میں 1964 میں انہیں راجیہ سبھا کی رکنیت پیش کی گئی تھی، لیکن انھوں نے اسے قبول کرنے سے منع کر دیا تھا۔ 25/اپریل 1968 کو مولانا حامد علی فاروقی نے وفات پائی۔ بانی کالج اکبر علی فاروقی نے یہ طبی درسگاہ اپنے دادا مرحوم کے نام موسوم کر کے نہ صرف ان کے نام کو زندہ کیا ہے، بلکہ خود قومی اور ملی خدمات میں حصہ لے کر خلف رشید ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔

محسن ملت یونانی میڈیکل کالج، صوبہ کی پنڈت روی شنکر شکلا یونیورسٹی، چھتیس گڑھ سے ملحق ہے اور اسے سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن (سی سی آئی ایم، نئی دہلی) کی منظوری حاصل ہے۔ کونسل کے مجوزہ نصاب اور ضابطوں کے مطابق یہاں تعلیم ہوتی ہے۔ یونیورسٹی اور کونسل کی عطا کردہ اجازت کے مطابق ہر سال چالیس طلبہ کا داخلہ ہوتا ہے۔ چھتیس گڑھ کے علاوہ دوسرے کئی صوبوں کے طلبہ یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ 2010 میں پبلک سروس کمیشن، چھتیس گڑھ کے ذریعہ بارہ یونانی طبیبوں کی صوبہ میں تقرری عمل میں آئی۔ ان منتخب اطباء میں کالج کے فارغ التحصیل بھی شامل ہیں۔ اس کامیابی سے یہاں زیر تعلیم طلبہ کے حوصلے بلند ہوئے ہیں اور کالج کے تئیں عوامی اعتماد میں اضافہ ہوا ہے۔

ہنوز یہ کالج تعمیر و ترقی کے مرحلہ میں ہے، ابھی بہت سی دشواریوں کو عبور کرنا باقی ہے۔

عارضی بندوبست کے ذریعہ تعلیم کا انتظام ہے۔ کالج کے مستقل کیمپس کے لئے سوسائٹی نے ساتا ایکڑ زمین خرید لی ہے، جس میں کالج، ہسپتال اور طلبہ وطالبات کی رہائش گاہ تعمیر کرنے کا منصوبہ ہے۔ 25 نومبر 2006 سے عمارتوں کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔

اس کالج کو بہتر شکل عطا کرنے کے لئے کئی چیزوں کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں ایک اہم چیز باصلاحیت اساتذہ کا انتظام ہے، اس مسئلہ پر کالج انتظامیہ کو خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر تدریسی عملہ صرف قرب وجوار کے اساتذہ پر مشتمل رہا تو ایسی صورت میں بہت اچھے اساتذہ حاصل نہیں ہوسکتے اور یہاں دوسرے صوبوں کے اساتذہ اسی شرط پر آئیں گے جب انہیں بہتر سہولت اور معقول مشاہرہ دیا جائے۔

کالج کے ذمہ داروں کی ایک قابل قدر کوشش یہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ یونانی علاج و معالجہ سے بھی صوبہ کے عوام کو متعارف کروایا جائے۔ چنانچہ یہاں کے اساتذہ کیمپ اور موبائل کلینک کے ذریعہ قرب وجوار کے علاقوں میں طبی سہولیات فراہم کرتے ہیں، اس سے خاص طور پر غریب مریضوں کو یونانی علاج سے مستفید ہونے کا موقع مل رہا ہے۔

اس وقت حکیم زماں (پرتاپ گڑھ) کالج کے پرنسپل ہیں۔ اس کے پہلے پرنسپل حکیم سعید حسن (پونہ) تھے۔ کالج کی تعمیر وترقی میں حکیم احمد رضا نظامی، حکیم ضرار قادری اور قمرالزماں مصباحی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

مدرسہ طبیہ۔ دہلی

مدرسہ طبیہ، دہلی ہندوستان میں طبی تعلیم کا اولین ادارہ ہے، اس کے قیام سے پہلے یہاں کوئی طبی درسگاہ نہیں تھی۔ حصول طب کا کسی قدر ذریعہ اس عہد کے مدارس میں پڑھائی جانے والی طبی کتابیں تھیں، عملی مشق کے لئے طلبہ نامور اطباء کی خدمت میں حاضر ہو کر مطب و معالجہ کی تربیت حاصل کرتے تھے۔

مدرسہ طبیہ کے قیام سے پہلے دہلی میں طبی تعلیم کے سلسلہ میں شریف خانی اطباء کے مطبوں کو مرجعیت کا درجہ حاصل تھا، طبی تعلیم کا یہی طریقہ ہندستان کے دوسرے شہروں میں بھی رائج تھا، مگر اس تعلیمی نظام کا دائرہ نہایت محدود تھا۔ محض کچھ کتابوں کی تعلیم اور کسی قدر مطب کی مشق پر یہ سلسلہ ختم ہو جاتا تھا۔ مزید برآں اس طریقۂ تعلیم سے صرف خاندان کے افراد یا مخصوص تلامذہ ہی مستفید ہو سکتے تھے۔

مدرسہ طبیہ کے قیام سے پہلے حکیم محمود خاں کے مطب میں بھی طبی تعلیم کا اہتمام تھا، وہ خود طلبہ کو درس دیتے تھے، اس کے علاوہ اپنے بڑے بیٹے حکیم عبدالمجید خاں کی علمی لیاقت اور فنی ذوق کو دیکھتے ہوئے طلبہ کو پڑھانے کی ذمہ داری انہیں بھی تفویض کر رکھی تھی۔

حکیم عبدالمجید خاں نے تعلیم کے اس روایتی طریقہ کو منظم اور مربوط کرنے کی غرض سے

مدرسہ طبیہ کی بناء ڈالی اور گلی قاسم جان میں ایک مکان کرایہ پر لے کر اس مدرسہ کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس کے اجرا کے وقت حکیم محمود خاں، نواب عبداللطیف خاں کے علاج کے لئے کلکتہ گئے ہوئے تھے، حکیم عبدالمجید خاں نے انہیں اس بابت اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا: ''دست بستہ گزارش است کہ فدوی مدرسہ طبیہ توکل علی اللہ جاری کردہ است'' یہ خط 1308ھ میں لکھا گیا ہے۔[1]

اس مدرسہ کی ابتداء 1883 میں ہوئی، مگر باقاعدہ افتتاح 23 جولائی 1889 میں ہوا اور ڈپٹی کمشنر دہلی کے ہاتھوں یہ رسم انجام پائی۔ حکیم عبدالمجید خاں نے تعلیمی نظام کی تنظیم کے لئے پہلا کام یہ کیا کہ جماعتوں کے قواعد و ضوابط وضع کرکے الگ الگ سشن مقرر کئے اور کتابوں کے نام کے بجائے جدید طرز پر درجات کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتداء شوال سے لے کر آخر شعبان تعلیمی میقات قرار پائی۔ مدرسہ طبیہ میں فارسی اور عربی کی دو الگ جماعتیں قائم تھیں اور مدت تعلیم دو سال تھی، پھر بڑھا کر تین سال کردی گئی۔ وقتاً فوقتاً نصاب تعلیم میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ علم تشریح کی کمی محسوس کرتے ہوئے حکیم صادق کی ''شرح تشریح اعضاء مرکبہ'' داخل نصاب کی گئی۔ حکیم عبدالمجید خاں، حکیم واصل خاں اور حکیم اجمل خاں تدریسی فرائض انجام دیتے تھے۔ فارسی کی تمام کتابیں حکیم جمیل الدین پڑھاتے تھے۔ حکیم محمد احمد خاں مدرسہ طبیہ میں کلیات نفیسی اور شرح اسباب کے استاذ تھے، انھوں نے حکیم واصل خاں کے انتقال کے بعد ایک عرصہ تک اعلیٰ جماعت کے طلبہ کو درس دیا۔[2]

حکیم عبدالمجید خاں کی یہ طبی تحریک سرسید کی تعلیمی تحریک کی معاصر ہونے کے ساتھ بالکل اس کے شانہ بہ شانہ بڑھ رہی تھی۔ 1892 میں جب دہلی میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ساتواں اجلاس منعقد ہوا تو حکیم اجمل خاں اس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ کانفرنس کے اجلاس میں نواب سعیدالدین احمد خاں نے ایک تجویز پیش کی کہ مدرسہ طبیہ کو دارالعلوم، علی گڑھ کی شاخ بنادیا جائے، مگر یہ تجویز منظور نہیں ہوئی۔[3]

مدرسہ طبیہ کے قیام کا اہم مقصد طبی تعلیم کی تنظیم اور یونانی طب کو اس کے روایتی خول سے باہر نکالنا تھا۔ دراصل 1857 کے بعد پیدا ہونے والے حالات میں یونانی طب کا روایتی وجود اندیشوں کے دائرہ میں تھا، ایسے حالات میں تعلیمی تنظیم کے ساتھ ایک اہم داعیہ یہ تھا کہ اسے

ایسے قالب اور اسلوب میں پیش کیا جائے جو جدید علمی دنیا کے لئے قابل فہم ہو، اس ضرورت کی تکمیل کے لئے یونانی طب کو نئے تعبیراتی اسلوب میں پیش کئے جانے کی ضرورت تھی، ایک اہم مقتضا یہ بھی تھا کہ طلبہ یونانی طب کے ساتھ مغربی طب سے اس قدر واقف ہوں کہ وہ طبی میدان میں ہو رہی نت نئی دریافتوں سے استفادہ کر سکیں۔ اس ضرورت کے تحت مدرسہ طبیہ میں مغربی طب کی تعلیم کو شروع سے اہمیت دی گئی۔

حکیم اجمل خاں نے اکمل الاخبار میں اس مدرسہ کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا تھا ''یہاں طلبہ کے لئے ڈاکٹری کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اور نعشوں کی تشریح اور مختلف قسم کے آپریشن دیکھنے کے لئے سول ہسپتال سے اجازت حاصل کر لی گئی ہے اور ہسپتالوں کی حاضری کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ علم طبیعی اور جدید سائنس کے لکچروں کو سننے اور طبعیات کے تجربے دیکھنے کا بھی ذریعہ پیدا کیا گیا ہے''۔ [4]

حکیم عبدالمجید خاں، حکیم واصل خاں اور حکیم اجمل خاں نے یہاں طبی تعلیم کا جو منہج اختیار کیا تھا، اس کے محرک وہ مخصوص عوامل تھے، جو ہندوستان میں مغربی علوم وفنون اور مغربی نظام تعلیم کی آمد کے بعد یہاں پیدا ہوئے تھے۔ ان تقاضوں اور طب کی تعلیمی بدحالی اور فنی پسماندگی کے اسباب کو شریفی خاندان کے ان طبیبوں نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا اور انہوں نے یہ بھانپ لیا تھا کہ اب محض قدیم طبی سرمایہ کی تعلیم وتعلم پر تکیہ ناکافی ہے۔ اس لئے اس مدرسہ کے یہ بانیان اس رجحان کے حامی تھے کہ اطباء اپنے اسلاف کی روایات اور ان کے عظیم ورثہ کی پاسبانی کے ساتھ بقدر ضرورت جدید طبی سائنس سے بھی واقف ہوں، تا کہ وہ قدیم صداقتوں کو جدید زاویوں سے پرکھنے کے لائق ہو سکیں۔

حکیم اجمل خاں مدرسہ طبیہ کو محض ایک تعلیم گاہ کے بجائے، اسے طب کی ایک تحریک سمجھتے تھے۔ لہٰذا اس کے تحریکی دائرہ کو وسیع کرنے کے لئے ایک ایسے آرگن کی ضرورت تھی، جو حلقۂ اطباء سے رابطہ کا ذریعہ ہو۔ چنانچہ 1902 میں جب حکیم اجمل خاں رامپور سے دہلی آئے تو انہوں نے ''مجلہ طبیہ'' کے نام سے مدرسہ کا آرگن جاری کیا۔ یہ ایک ماہانہ رسالہ تھا، جس میں مدرسہ کی خبروں کے علاوہ طبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ [5]

1911 میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں شہنشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے موقع پر نواب صاحب رامپور کے قائم مقام کی حیثیت سے انگلستان تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی پر فرانس، جرمنی، آسٹریلیا اور ترکی کی سیر کے ساتھ ان ممالک میں طب کی ترقیوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ یہاں کے مشاہدات سے جو تجربے حاصل کئے تھے، اس کی روشنی میں انہوں نے طبِ قدیم کی اصلاح وتجدید اور ترقی کے لئے مدرسہ طبیہ میں بہت سے اقدامات کئے۔ مسیح الملک کا یہ سفر طبی ریفارم کے حوالہ سے تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔[6]

اس سفر سے واپسی پر مسیح الملک نے مدرسہ طبیہ کی توسیع اور اس کے تعلیمی نظام کو جدید اسلوب عطا کرنے کا ایک خاکہ تیار کیا۔ 15 اکتوبر 1912 کو انجمن طبیہ کے سالانہ جلسہ میں انہوں نے ایک مفصل رپورٹ پیش کی اور انجمن کے ممبران کے سامنے اپنے توسیعی منصوبوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "مدرسہ طبیہ کی تاسیس کے جو مقاصد تھے وہ مدرسہ طبیہ سے پورے نہیں ہو سکتے، ان کی تکمیل کے لئے ایک ایسی درسگاہ کی ضرورت ہے جس سے یونانی اور ویدک کی مکمل تعلیم کا مقصد حل ہو سکے۔ جس میں طلبہ کو نہ صرف کتابی بلکہ عملی طبی تعلیم دی جاسکے اور اس درسگاہ سے ایسے فارغین نکلیں جو یونانی اور ویدک کی نہایت اعلیٰ اور مکمل تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ جراحی اور ڈاکٹری کے مسلمہ مفید حصہ تک دسترس رکھتے ہوں، جنہیں انسانی مشین کے متعلق قدیم اطباء کے اقوال ہی یاد نہ ہوں بلکہ انہیں خود اس کی بصیرت حاصل ہو"۔[7]

مدرسہ طبیہ کو کالج کی شکل عطا کرنے کے منصوبہ کا یہ پہلا اظہار تھا۔ مدرسہ طبیہ کو کالج کا درجہ دینے کے منصوبہ کو نواب رامپور کی تائید اور تعاون حاصل تھا۔ 13 فروری 1921 کو کالج کی بلڈنگ کی رسم افتتاح کے موقع پر مسیح الملک نے سالانہ رپورٹ میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا "مجھے اس موقع پر ہز ہائنس جناب نواب صاحب والی ریاست رامپور کا ذکر خیر کرنا چاہئے، جنہوں نے سب سے پہلے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ طبی اسکول کو کالج بنا دیا جائے اور موجودہ ضروریات طب کو پیش نظر رکھ کر کالج کے لئے ایک وسیع عمارت تعمیر کی جائے۔ اس غرض کے لئے انہوں نے ان بارہ سو روپیہ کے علاوہ جو وہ پہلے سے عطا فرما رہے تھے، پچاس ہزار روپیہ کی گراں قدر رقم عطا فرمائی"۔[8]

اس توسیعی منصوبہ کے لئے مدرسہ طبیہ کی قدیم عمارت ناکافی تھی۔لہٰذا مسیح الملک نے قرولباغ میں ایک وسیع قطعۂ آراضی خریدنے کا منصوبہ بنایا۔چیف کمشنر نے اس زمین کی جو قیمت مقرر کی وہ بہت زیادہ تھی، مگر لارڈ ہارڈنگ کے ایماء پر کمشنر نے یہ زمین حکیم صاحب کو ان کے حسب منشا قیمت پر عطا کی۔ [9]

مسیح الملک کی دعوت پر 19 مارچ 1916 کو لارڈ ہارڈنگ نے قرولباغ میں کالج کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔اس عمارت کی تعمیر پر اس وقت سات آٹھ لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ [10]

رسم تنصیب کے موقع پر حکیم اجمل خاں نے وائس رائے لارڈ ہارڈنگ کی خدمت میں پیش کردہ ایڈرس میں کالج کے نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا ''گو کہ ہمارے ملک میں ویدک اور یونانی کی تعلیم پرائیوٹ طریقہ پر ہو رہی ہے اور کئی مدرسے ان علوم کی اشاعت کر رہے ہیں، لیکن ان کے معیار تعلیم کو بلند کرنے اور مغربی طب کے بعض ضروری حصوں سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے ہم کو ضرورت تھی کہ ہم ایک ایسا کالج بنائیں جو ہماری ضرورتوں کے لئے کافی ہو سکے اور جس میں باقاعدہ دیسی طب کی تعلیم اناٹومی اور سرجری کے ساتھ دی جائے''۔ [11]

حکیم رشید احمد لکھتے ہیں ''کالج کی اس پرشکوہ عمارت کو دیکھ کر سر آغا خاں نے کہا تھا'' یہ کالج ہندوستان کا نہیں بلکہ یورپ کا طبی کالج معلوم ہوتا ہے''۔مزید لکھتے ہیں ''جب کالج کے افتتاح کا وقت آیا تو ترک موالات کا زمانہ تھا لہٰذا حکیم صاحب نے وائس رائے کے بجائے گاندھی جی کے ہاتھوں یہ رسم انجام دلوائی۔اگر اس وقت حکیم صاحب وائس رائے کو افتتاح کی دعوت دیتے تو یہ بخوشی منظور کر لی جاتی اور امید تھی کہ کالج کے لئے پانچ لاکھ روپے نقد اور پانچ ہزار روپیہ ماہانہ اعانت کا اعلان ہو جاتا اور حکومت کے اس اقدام کے بعد ہندوستان کی ریاستوں سے گرانقدر اعانتوں کی توقع تھی اور کالج کے فارغین کی حکومت کی نگاہ میں زیادہ وقعت ہوتی''۔ [12]

13 رفروری 1921 کو گاندھی جی کے ہاتھوں اس عمارت کا افتتاح عمل میں آیا۔مسیح الملک نے افتتاحی تقریب میں نواب رامپور، سیٹھ جمال رنگون، مہاراجہ پٹیالہ، بیگم بھوپال، مہاراجہ گوالیار، مہاراجہ اندور اور سلطان رئیس دہلی کا بطور خاص ذکر اور شکریہ ادا کیا۔اس عمارت کی تعمیر

کے لئے سیٹھ جمال رنگون نے پچاس ہزار کی رقم خود پیش کرنے کے علاوہ دوسرے لوگوں سے چندہ دلوایا تھا۔ ان کی کوششوں سے رنگون سے ڈھائی لاکھ کا چندہ ہوا تھا۔ [13]

1912 میں مسیح الملک نے مدرسہ طبیہ کو کالج میں تبدیل کرنے کی اسکیم تیار کی اور طبی تعلیم کے متوازی ویدک تعلیم کا بھی اہتمام کیا۔ 1914 سے کالج میں ویدک تعلیم کا آغاز ہوا، ساتھ ہی بورڈ آف ٹرسٹیز میں ہندوؤں کو کافی تعداد میں شامل کیا۔ کالج سے آیوروید اور ہندوؤں کو جوڑنے کے پیچھے کچھ سیاسی مصلحتیں معلوم ہوتی ہیں، اس لئے کہ اس زمانہ میں مسیح الملک سیاست سے وابستہ ہو چکے تھے اور سیاسی دنیا میں سیکولر شبیہ کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ ممکن ہے وہ طبیہ کالج سے آیورویداور ہندوؤں کو جوڑ کر اپنی سیاسی امیج اور تعلیمی مشن میں سیکولر رنگ پیدا کرنا چاہ رہے ہوں۔ اس کی ایک ممکنہ وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس زمانہ میں تحریک آزادی کا بگل بج چکا تھا اور دیر سویر ملک کو آزاد ہونا تھا، آزادی کے بعد قائم ہونے والے جمہوری نظام حکومت میں مسلمان اس ملک میں اقلیت میں ہوتا، ان حالات میں یونانی طب کو بہر کیف آیوروید کے تابع ہونا تھا۔ مسیح الملک کی دوررس سیاسی بصیرت نے ان پیش آنے والے حالات کا اندازہ کر کے ان کی پیش بندی کے طور پر پہلے ہی آیوروید اور یونانی کو جوڑنے کی تدبیر کر لی تھی۔ لیکن آیوروید اور ہندوؤں کو اس ادارہ سے جوڑنے کی اس وقت بظاہر وجہ یہ تھی کہ میڈیکل رجسٹریشن ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن اور دیسی طبوں کے حقوق کے تحفظ اور بازیابی کے سلسلہ میں مشترکہ جدوجہد کے لئے ویدوں اور ہندوؤں کو ساتھ لینا ضروری تھا۔

مسیح الملک نے سیاحت فرنگ کے بعد نصاب کی اصلاح اور اس کی تجدید و تدوین کے مسائل کی طرف خاص توجہ فرمائی اور عملی اقدامات کئے اور ایک اہم قدم اٹھاتے ہوئے یونانی اور ویدک دونوں کے نصاب میں فزیالوجی اور کیمسٹری کی تعلیم کو لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کیا، ان کے اس اقدام سے طلبہ میں شورش بھی پیدا ہوئی، مگر انہوں نے اسے حسن تدبیر کے ساتھ فرو کر دیا۔ [14]

مسیح الملک کا خیال تھا کہ اجنبی اور غیر مانوس زبان میں تعلیم سے طلبہ پر دوہرا بوجھ پڑتا ہے اور فنی مسئلوں کے ساتھ لسانی پیچیدگیوں کو سلجھانے میں ایک مدت صرف ہو جاتی ہے، اس لئے

وہ ایسی زبان میں تعلیم کے حامی تھی، جو طلبہ کے لئے مانوس ہو۔اس لئے اردو کو تعلیمی زبان کا درجہ دیا اور اردو زبان میں درسیات کی تیاری کے لئے اہتمام اور عملی اقدام کئے۔[15]

مسیح الملک کے ذہن میں اس کالج کی بابت نہایت وسیع منصوبے تھے، وہ اس کے کردار کو صرف ایک درسگاہ تک محدود کرنے کے بجائے، اسے طب کا ایک مرکزی ادارہ بنانا چاہتے تھے، تا کہ یہ کالج طب کی تعلیم گاہ کے ساتھ ہندوستان میں طب کا پالیسی ساز ادارہ بنے، اور طب کے ایک مرکزی ادارہ کے بطور طبی تعلیم کے میدان میں قیادت کے فرائض ادا کرے۔اس کالج کو دوسری طبی تعلیم گاہوں کے لئے ماڈل اور نمونہ بنانے اور اسے طبی دنیا میں رہنما اور مشعل بردار کا مرتبہ عطا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ یہ کالج اس وقت کے تعلیمی مسئلوں کا حل پیش کرتا اور قائدانہ اہلیت کا ثبوت دیتا۔اس عہد کا سب سے اہم مسئلہ تعلیمی نصاب تھا۔حکیم اجمل خاں نے وقت کے اس اہم داعیہ کو محسوس کرتے ہوئے جولائی 1926 میں کالج سے ملحق شعبۂ تحقیقات کی بنیاد ڈالی، علمی و عملی تحقیقات، اس شعبہ کا مطمح نظر قرار پائیں۔مسیح الملک چاہتے تھے کہ علمی شعبہ میں طب کے ماہرین، قدیم نصاب پر جدید معلومات کی روشنی میں تنقید و تنقیح کر کے طب کا ایک بہتر نصاب تیار کریں۔اس کے لئے انہوں نے ایک کمیٹی بنائی تھی، جس کے ساتھ وہ خود بھی کام کرتے تھے۔حالانکہ اس زمانہ میں وہ رامپور اور مسوری میں مقیم تھے، مگر کمیٹی کے اجلاس میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔[16]

مسیح الملک نے مسوری کے زمانہ قیام میں علمی شعبہ کے اراکین کو پابند عہد کرنے کے لئے ایک عہد نامہ پر کمیٹی کے دستخط لئے۔دستخط کنندگان میں ان کے علاوہ حکیم محمد الیاس خاں، حکیم محمد کبیر الدین، حکیم فضل الرحمان، حکیم عبد الحفیظ، ڈاکٹر سید ناصر عباس کے نام شامل ہیں۔[17]

تحقیقات کا دوسرا شعبہ ادویات سے متعلق تھا۔اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ یونانی مفردات کا جدید سائنسی تناظر میں مطالعہ کیا جائے، ادویۂ معلومہ کی فہرست میں نئے مفردات کا اضافہ کیا جائے اور مرکبات کو تحلیل و تجزیہ کے ذریعہ پرکھ کر، حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں ان کی اس طرح اصلاح کی جائے کہ ان کی خصوصیات تو برقرار رہیں، لیکن ان میں ندرت پیدا ہو جائے اور وہ موجودہ سائنٹیفک دنیا میں قبولیت کا مرتبہ حاصل کر سکیں۔اس کے لئے ایک ماہر فن

کی ضرورت تھی، چنانچہ شعبہ کی طرف سے ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کو فنی تربیت کے لئے جرمنی بھیجا گیا، انہوں نے جرمنی سے تربیت حاصل کر کے ریسرچ ڈاکٹر کی حیثیت سے شعبۂ تحقیقات کی ذمہ داری سنبھالی۔ [18]

کالج اور اس کے ذیلی شعبوں کے انتظامی امور، شریفی خاندان کے کسی مخصوص فرد کے بجائے انجمن طبیہ نام کی مجلس منتظمہ کے سپرد تھے۔ حکیم اجمل خاں اس کے صدر تھے، جب انجمن کی جگہ بورڈ آف ٹرسٹیز قائم ہوا تو وہ اس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ان دونوں عہدوں کے اختیارات یکساں تھے۔ بورڈ کا سکریٹری منتخب ہونے کے بعد حکیم اجمل خاں کو انتظامی امور میں معاونت کے لئے ایک جوائنٹ سکریٹری کی ضرورت تھی، انہوں نے اس عہدہ پر پیرزادہ محمد حسین (سابق سشن جج) کو ایک معقول مشاہرہ پر مامور کیا۔ [19]

12 / اگست 1911 کو دفعہ 21، 1860 کے تحت انجمن طبیہ کا رجسٹریشن ہوا۔ 15 اکتوبر 1915 کو یہ انجمن دی بورڈ آف ٹرسٹیز آف دی آیورویدک اینڈ یونانی کے نام سے موسوم ہوئی اور انجمن کے تمام اختیارات اور منصبی فرائض اور اس کی تحویل کی تمام جائدادیں بورڈ کے ٹرسٹیوں کے حق میں منتقل کر دی گئیں۔ بورڈ نے 35 ٹرسٹیوں پر مشتمل ایک منتظمہ کمیٹی تشکیل دی، جس میں حکیموں اور ویدوں کی تعداد مساوی رکھی گئی تھی۔

مختلف شعبوں کی نگرانی اور ان کے انتظام و انصرام کے لئے مندرجہ ذیل چھ کمیٹیاں قائم کی گئیں:

1۔ سب کمیٹی برائے ہندوستانی دواخانہ
2۔ سب کمیٹی برائے رسائن شالہ
3۔ تعلیمی سب کمیٹی
4۔ سب کمیٹی ہسپتال
5۔ سب کمیٹی برائے تعمیرات واسٹور
6۔ ریسرچ (علمی وعملی) سب کمیٹی

کالج کی ریسرچ سب کمیٹی میں حکیم محمد احمد خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، نواب ابوالحسن خاں،

لالہ رام پرشاد، سردار مہتاب سنگھ، ڈاکٹر سید محمد جنید قریشی، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، قاضی عبدالغفار، حکیم محمد الیاس خاں، حکیم محمد ظفر احمد خاں، پنڈت ہری رنجن ممبر تھے۔[20]

دسمبر 1927 میں مسیح الملک کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حکیم محمد جمیل خاں بورڈ آف ٹرسٹیز کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ حکیم محمد احمد خاں سے اختلاف کی وجہ سے انتظامی کشمکش کا سلسلہ رہا، تقریباً ایک ماہ تک ان کے خلاف کالج میں اسٹرائک رہی۔ 1929 میں انہیں اس عہدہ سے علاحدہ کر کے بورڈ نے حکیم محمد احمد خاں کو سکریٹری مقرر کیا۔ 1937 میں حکیم محمد جمیل خاں دوبارہ سکریٹری بنے اور 1949 تک طبیہ کالج ان کے زیر نگرانی رہا۔ 10/ اکتوبر 1949 کو حکومت نے جمیل خاں کی جگہ کالج پر ریسیور مقرر کر دیا۔[21]

1952 میں دہلی اسمبلی نے طبیہ کالج ایکٹ منظور کیا۔ اس کے مطابق 27 اپریل 1953 کو طبیہ کالج بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی۔ کرنل بشیر حسین زیدی اس بورڈ کے چیرمین بنائے گئے۔ بورڈ کے قیام کے بعد کالج کے انتظام میں کسی قدر سدھار ہوا، لیکن پھر 1963 سے بدنظمی شروع ہوگئی اور یہ سلسلہ چھ سال تک قائم رہا۔ 1967 میں ہر دیال دیوگن طبیہ کالج بورڈ کے چیرمین منتخب ہوئے، انہوں نے بدنظمی کے دور سے کالج کو نکالنے کی کوشش کی۔ 1963 میں حکومت ہند کے ذریعہ ویاس کمیٹی کی تشکیل ہوئی، جس نے طبیہ کالج کے نصاب کو مفید اور موثر بنانے کے لئے کئی اہم تبدیلیاں کیں، حکومت کے سرکلر سے ایک نیا نصاب جاری ہوا، سابقہ نصاب کی طرح اس کی مدت تعلیم پانچ سال تھی۔ ہائر سکنڈری داخلہ کی اہلیت قرار پائی، جس میں سنسکرت اور عربی داں طلبہ کو ترجیح دی جاتی تھی۔ 1970 میں کالج کی طرف سے مستقبل کے لائحہ عمل کے تحت حکومت کو ایک تین نکاتی اسکیم ارسال کی گئی تھی، جس میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا منصوبہ بھی شامل تھا۔[22]

اس کالج میں 1970 سے پی۔جی تعلیم کا منصوبہ تھا، مگر یہ اسکیم بہت دیر سے روبہ عمل ہوئی اور شروع ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد کالج میں اساتذہ کی مطلوبہ تعداد اور ضروری انفرا اسٹرکچر کی کمی جیسے مسائل سے دوچار ہو کر التواء کا شکار ہوگئی۔

یہ کالج برطانوی عہد حکومت میں قائم ہونے والا طبی تعلیم کا پہلا منظم ادارہ تھا، اس نے طبی تعلیم کے میدان میں جو نقوش ثبت کئے تھے، وہ اتنے دوررس اور دیرپا تھے کہ اس عہد کے

دوسرے تعلیمی اداروں میں اس کی تقلید کی گئی، نصاب تعلیم کے حوالے سے اس کالج کے قائم کردہ خطوط کی اب تک پیروی کی جارہی ہے۔

1927 کے بعد اس کالج پر انحطاط کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اب تک قائم ہے۔اس کالج نے اپنے قیام کے ابتدائی زمانہ میں طبی تعلیم کے میدان میں رہنمائی اور مشعل برداری کا کردار ادا کیا تھا، مگر روشن ماضی کا یہ واقعہ اب محض ایک یاد بن کر رہ گیا ہے۔اس وقت یہ ادارہ صوبہ دہلی کے زیر انصرام ہے۔اور اس کی وہی حالت ہے جو ہندوستان میں دوسرے صوبائی سرکاری اداروں کی ہے۔

حوالہ جات

1۔ اجمل اعظم، انتظار حسین، ص 76

2۔ تذکرۃ الخواجگان، ص 96، 99، 110

3۔ حیات اجمل، قاضی عبدالغفار، ص 23 تا 27

4۔ اجمل اعظم، انتظار حسین، 76

5۔ تذکرۂ مسیح الملک، حکیم محمد حسن قرشی۔ص 21، 22

6۔ ایضاً ص 36 تا 40

7۔ سیرت اجمل، حکیم جمیل خاں، ص 72، 73

8۔ آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج، دہلی کی سہ سالہ رپورٹ 1918 تا 1920

9۔ حکیم اجمل خاں، کوثر چاندپوری، 155

10۔ تذکرۂ مسیح الملک، حکیم محمد حسن قرشی۔ص 58

11۔ سیرت اجمل، حکیم جمیل خاں، ص 96، 97

12۔ حیات اجمل، حکیم رشید احمد خاں، ص 65، 66، 75

13۔ آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج، دہلی کی سہ سالہ رپورٹ 1918 تا 1920

14 تذکرۂ مسیح الملک، حکیم محمد حسن قرشی۔ص 39، 40

15۔ ماہنامہ حامی الشفا (اجمل اعظم نمبر) ص 63 اور حیات اجمل مؤلفہ حکیم رشید احمد خاں، ص 44، 45

16۔ حیات اجمل، قاضی عبدالغفار، ص 410۔411 اور قانون عصری، حکیم محمد الیاس خاں، ص 23، 24

17۔ اے جرنی آف ریسرچ ان یونانی میڈیسن، ص 11

18۔ حیات اجمل، قاضی عبدالغفار، ص 410، 411

19۔ حیات اجمل، حکیم رشید احمد خاں، ص 115

20۔ دستورالعمل برائے بورڈ آف ٹرسٹیز

21۔ دلی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمٰن، ص 37، 38

22۔ بیاض اجمل، انور علی دہلوی، ص 19، 20

کتابیات

☆ اجمل اعظم، انتظار حسین، ناشر یادگار اجمل، گلبرگ، لاہور، 1995

☆ اے جرنی آف ریسرچ ان یونانی میڈیسن، شائع کردہ سی سی آر یو ایم، نئی دہلی 2005

☆ آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج کی سہ سالہ رپورٹ (1918 تا 1920) جو مہاتما گاندھی کے سامنے اس کی رسم افتتاح کے موقع پر 13 رفروری 1921 کو پڑھی گئی، مطبوعہ غنی المطابع، دہلی

☆ بیاض اجمل، انور علی دہلوی، (آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج کی سالانہ رپورٹ، پیش کردہ برہم دت شرما بتاریخ 29 رمارچ 1970) پیش کش آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج، بورڈ

☆ تذکرۃ الخواجگان، حکیم خواجہ احسان اللہ، شائع کردہ یونانی شفاخانہ لشکر، 1941

☆ تذکرۂ مسیح الملک، حکیم محمد حسن قرشی، ناشر ناظم مشیر الاطباء، چشمۂ زندگی، حویلی کابلی مل، لاہور 1928

☆ حکیم اجمل خاں، کوثر چاندپوری، ناشر نسیم بکڈپو، لکھنؤ، اشاعت 1973

☆ حیات اجمل، حکیم رشید احمد خاں، ناشر عالمی اردو مرکز، دہلی، اشاعت دوم، 2002

☆ حیات اجمل، قاضی عبدالغفار، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، اشاعت 1950

☆ دستورالعمل برائے بورڈ آف ٹرسٹیز آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج دہلی جو 15 اکتوبر 1915 کو وضع ہو کر نافذ العمل ہوا۔ ترمیم شدہ 26 اکتوبر 1925

☆ دلی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمٰن، اردو اکادمی، دہلی، اشاعت ثانی 2011

☆ سیرت اجمل، حکیم جمیل خاں، ہندوستانی دواخانہ دہلی، غیر مورخ

☆ ماہنامہ حامی الشفا (اجمل اعظم نمبر) جنوری، فروری 1963 مقام اشاعت باب الشفاء، میرٹھ

مدرسہ طبیہ زنانہ۔ دہلی

مدرسہ طبیہ کے ذیل میں قائم مختلف اداروں میں مدرسہ طبیہ زنانہ کا ایک امتیاز یہ تھا کہ دوسرے اداروں کا قیام، فنی ضرورت کے تحت ہوا تھا، لیکن اس کے قیام کے محرک صرف سماجی داعئے تھے۔ حکیم اجمل خاں نے محسوس کیا کہ دوسرے سماجی حقوق کی طرح عورتیں اپنی صحت کے جائز حق سے بھی محروم ہیں۔ تہذیب اور شرافت جیسے ناموں پر عورتوں کا یہ بنیادی حق ان سے سلب کر لیا گیا ہے۔ اس لاپرواہی کے نتیجہ میں زچگی کے دوران وہ بڑی تعداد میں لقمۂ اجل بن جاتی ہیں۔ زچہ بچہ کے تمام معاملات ناخواندہ دائیوں کے سپرد ہیں، اس افسوس ناک صورتحال کو دیکھتے ہوئے حکیم اجمل خاں نے ایک زنانہ مدرسہ کے قیام کی تحریک شروع کی، ان کی کوششوں سے تھوڑے ہی عرصہ میں چالیس ہزار کی خطیر رقم جمع ہوگئی۔ مالی فراہمی کے بعد مسیح الملک نے محلہ چوڑی والان میں ایک وسیع مکان کرایہ پر لے کر زنانہ طبی مدرسہ اور زنانہ طبی شفا خانہ کی شروعات کی۔[1]

مدرسہ طبیہ زنانہ کے ذریعہ یونانی طریقۂ علاج کو ہر سطح پر معاصر تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے علاوہ اسے سماجی داعیوں سے جوڑنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے قیام سے طبی تعلیم ایک نئی جہت سے روشناس ہوئی اور ایک نئی ضرورت کا احساس سامنے آیا۔

13 رجنوری 1909 کو لوئی ڈین بہادر لفٹنٹ گورنر، پنجاب کی بیگم کے ہاتھوں اس

مدرسہ کا افتتاح ہوا اور یکم مئی 1909 کو باقاعدہ تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔ لیڈی سرلوئی ڈین حکیم اجمل خاں کے اس منصوبہ کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئیں اور انہوں نے حکیم صاحب کے اس جذبہ کو بیحد سراہا۔[2]

کالج کا ایک سال مکمل ہونے پر 16 اپریل 1910 کو چوڑی والان میں واقع مدرسہ زنانہ وشفاخانہ کے کیمپس میں ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام کیا گیا اس جلسہ میں مردوں اور عورتوں کے لئے تقریبوں کا علاحدہ انتظام تھا، نواب احمد علی خاں بہادر فرمانروا ریاست مالیر کوٹلہ نے مردانہ تقریب کی صدارت فرمائی، زنانہ جلسہ کی صدارت کے لئے مہارانی نرسنگھ گڑھ کا نام طے تھا، مگر طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے وہ تشریف نہیں لاسکیں اس لئے ان کی جگہ لالہ لال سنگھ کی بیگم نے تقریب کی صدارت فرمائی۔[3]

یہ کالج اپنی وضع کا پہلا ادارہ اور تعلیمی میدان میں ایک نیا تجربہ تھا۔ حکیم اجمل خاں نے یہ تجربہ ایسے دور میں کیا تھا، جب ہندوستان جیسے روایت پسند ملک میں عورتوں کے لئے اس قسم کی پیشہ ورانہ تعلیم تو کجا عام تعلیم کا تصور بھی بہت کم تھا۔ یہ واقعہ حکیم اجمل خاں کی جدت پسندانہ اور انقلابی سوچ کا غماز ہے۔

حکیم اجمل خاں نے مدرسہ طبیہ کی بنیاد ڈال کر ہندوستانی مسلمانوں کو عورتوں کے باب میں عام تعلیم سے آگے، عصری تعلیم کی ضرورت کے تیئں بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جس وقت حکیم اجمل خاں نے زنانہ طبی مدرسہ کی تحریک شروع کی تھی، وہ انہی جیسا شخص کر سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے احباب کو اس کاز کے لئے آمادہ کر کے دراصل اپنی ذہن ساز صلاحیتوں کا ثبوت دیا تھا۔

ابتداء میں یہ مدرسہ "مدرسہ دائیان" کے نام سے موسوم تھا، کچھ دنوں تک اسی نام سے جاری رہا، لیکن اس لفظ سے اس کی عظمت کا مفہوم متاثر ہو رہا تھا، دائی کے لفظ سے لوگوں کا ذہن اس پیشہ کی طرف منتقل ہو جاتا، جو دائیوں سے منسوب تھا، جسے سماج میں مبتذل سمجھا جا رہا تھا۔ یہ غلط فہمی مدرسہ سے استفادہ کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ لہٰذا اس کے ذمہ داروں نے اس کا نام بدل کر مدرسہ طبیہ زنانہ تجویز کیا۔[4]

کالج میں لڑکیوں کو یونانی، آیورویدا اور ایلوپیتھی کی نظری اور عملی تعلیم دی جاتی اور زنانہ

ہاسپٹل میں بیمار خواتین کا ان تینوں طریقوں سے علاج کیا جاتا، تا کہ طالبات کی عملی تربیت ہو سکے اور خواتین کو علاجی سہولت مل سکے۔

اس کالج میں دو جماعتیں قائم تھیں، جماعت ''الف'' کا نصاب چار سال پر مشتمل تھا، اس میں طالبات کو یونانی اور آیورویدک کی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید طب کے ضروری مباحث اور شفاخانہ کی عملی مشق کرائی جاتی تھی۔ اس نصاب کی تکمیل کے بعد یونانی طالبات کو 'طبیبہ قابلہ' اور ویدک طالبات کو 'وید دھانتری' کی سند دی جاتی۔ جماعت ''ب'' کا نصاب دو سال پر مشتمل تھا، اس جماعت کی طالبات کو زبانی اور عملی طور پر دائی گیری سکھائی جاتی تھی، دو سالہ تربیت کے بعد ان طالبات کو 'قابلہ' یعنی دائی کا سرٹیفکٹ دیا جاتا۔ اس جماعت کے لئے ایک رعایت تھی کہ اگر کسی طالبہ کے بارے میں لیڈی ڈاکٹر کو اطمینان ہو جائے کہ اس نے دو سال سے پہلے ہی دائی کا کام سیکھ لیا ہے تو اسے مقررہ مدت سے پہلے ہی قابلہ کا سرٹیفکٹ مل سکتا تھا۔ [5]

زنانہ طبی کالج میں مذہبی تفریق کے بغیر وہ تمام لڑکیاں داخلہ کی اہل تھیں، جو اردو، ہندی پڑھنے لکھنے کی صلاحیت رکھتی ہوں، شریف الطبع ہوں، جسمانی طور پر صحت مند ہوں اور متعدی امراض میں مبتلا نہ ہوں۔ [6]

جو لڑکیاں اردو اور ناگری نوشت وخواند نہیں جانتیں، ان کی تعلیم کے لئے مبادی جماعتیں قائم تھیں، ان میں اردو اور ناگری کی تعلیم کے لئے دو استانیاں مامور تھیں۔ [7]

اس کالج کے یونانی شعبہ میں تعلیم کی زبان اردو تھی، مگر اس زبان میں درسی ضرورت کی سلیس اور عام فہم کتابیں دستیاب نہیں تھیں، حکیم اجمل خاں کی ہدایت پر ان کے شاگرد حکیم عبدالرزاق نے لڑکیوں کا نصاب تیار کیا۔ وہ اس کالج میں استاذ بھی تھے۔ مدرسہ میں پردہ کے نظام کی وجہ سے پردہ کی اوٹ سے لڑکیوں کو تعلیم دیتے تھے۔ [8]

زنانہ طبیہ کالج ایک اقامتی ادارہ تھا، یہاں لڑکیوں کی اخلاقی تربیت اور ان کی نگرانی کے لئے لیڈی منصرمہ کا انتظام تھا، کالج کے ذمہ داروں نے طالبات کے مذہبی احساسات کی رعایت کرتے ہوئے ہندو اور مسلم لڑکیوں کے قیام وطعام کا علاحدہ بندوبست کیا تھا۔ [9]

1928 کے پراسپیکٹس میں شائع تعلیمی اور انتظامی اسٹاف کی تفصیلات سے معلوم ہوتا

ہے کہ اس وقت حکیم محمد جمیل خاں انتظامی بورڈ کے سکریٹری اور خواجہ غلام سبطین جوائنٹ سکریٹری تھے۔ڈاکٹر سید ناصر عباس پرنسپل، حکیم مولوی محمد حفیظ الرحمٰن وائس پرنسپل ، پنڈت گنگا سہائے پروفیسر ویدک تھے، ڈاکٹر شریف النساء خانم لیڈی ڈاکٹر کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ایلوپیتھی مضامین کی تدریس پر مامور تھیں۔مسرت جہاں بیگم یونانی کی معلّمہ تھیں۔ سلطان جہاں بیگم بورڈنگ ہاؤس کی منصرمہ تھیں۔ملکہ بیگم کمپاؤنڈر اور منشی اصغر علی دفتر کے محرر تھے۔ [10]

1928 کا پراسپیکٹس اس زمانے کا ہے جب حکیم اجمل خاں کے بعد ان کے صاحبزادہ حکیم محمد جمیل خاں مجلس منتظمہ کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔یہ پراسپیکٹس حکیم اجمل خاں کی حیات 1918 کا مرتبہ ہے۔ [11] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح الملک کی وفات کے بعد نئے ذمہ داروں نے مسیح الملک کے قائم کردہ خطوط پر ہی تعلیمی نظام کو جاری رکھا تھا۔

زنانہ طبیہ کالج میں منعقد 24رفروری 1935 کی کانوکیشن تقریب میں مسز محمود وائس پرنسپل زنانہ طبیہ کالج نے جو رپورٹ پیش کی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیگم میاں محمد رفیع سکریٹری لجسلیٹو اسمبلی کے ہاتھوں کامیاب طالبات کو اسناد عطا کی گئیں، بیگم صاحبہ اس تقریب کی صدر تھیں۔ [12]

حکیم اجمل خاں، ان سے پہلے ان کے برادران اور ان کے بعد ان کے صاحبزادہ حکیم محمد جمیل خاں کے زمانۂ انصرام میں یہ روایت رہی ہے کہ اس خاندان کے قائم کردہ اداروں کی تقریبات میں ملک کی نامور سماجی اور سیاسی شخصیتوں کو مدعو کیا جاتا تھا، غالباً اس کا مقصد طبی کاز سے حلقۂ خواص کو جوڑنا تھا اور یہ اس عہد کی بڑی اہم ضرورت تھی۔

حوالہ جات

1۔ حیات اجمل، حکیم رشید احمد خاں، ناشر عالمی اردو مرکز، دہلی، اشاعت دوم 2002،ص 72-71

2۔ تذکرۂ مسیح الملک ، حکیم محمد حسن قرشی، ناشر ناظم مشیر الاطباء و چشمۂ زندگی، حویلی کابلی مل، لاہور، 1928،ص 25

3۔ مدرسہ طبیہ زنانہ و شفاخانہ زنانہ دہلی کے پہلے سالانہ جلسہ کی رپورٹ جو 16اپریل 1910 کو پیش کی

گئی تھی، شائع کردہ مطبع مجتبائی، ص 7-4

4۔ ایضاً ص 2-1

5۔ پراسپکٹس شعبۂ زنانہ، (مرتبہ اگست 1918) شائع کردہ قیصر ہند پریس، دہلی، جون 1928

6۔ ایضاً

7۔ ملاحظہ ہو حوالہ 3 کا ص 12

8۔ ایضاً ص 11-10

9۔ ایضاً ص 12-11

10۔ ملاحظہ ہو حوالہ نمبر 5

11۔ ایضاً

12۔ رپورٹ زنانہ طبیہ کالج جسے کالج کانوکیشن کے موقع پر 24 رفروری 1935 کو مسز محمود وائس پرنسپل نے پیش کیا تھا، مطبوعہ جید پریس، دہلی

جامعہ طبیہ۔ دہلی

مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی وفات (1927) کے بعد خاندانی اداروں کی جانشینی کو لے کر جو کشمکش شروع ہوئی اس سے ان اداروں کا نظم بری طرح متاثر ہوا۔ 1932 میں آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، دہلی میں طلبہ کی اسٹرائک اسی سلسلہ کا ایک اظہار تھا۔ لیکن نزلہ بر عضو ضعیف کی مصداق، اس کا ٹھیکرا ان اساتذہ کے سر پھوٹا جو ہمیشہ کالج اور طلبہ کے بہی خواہ رہے۔ صدر الاطباء حکیم محمد الیاس خاں، حکیم محمد کبیر الدین اور حکیم فضل الرحمن، اسٹرائک کے ذمہ دار قرار دے کر کالج کی ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے۔ یہاں سے علاحدگی کے بعد ان تینوں نے مل کر شیدی پورہ قرول باغ میں ''جامعہ طبیہ دہلی'' کے نام سے ایک کالج کی بنیاد ڈالی۔ یہ جلد ہی ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا اور نہایت مختصر عرصہ میں معیار تعلیم کے حوالہ سے اس کی شناخت قائم ہو گئی۔

جامعہ طبیہ دہلی میں اگست 1935 سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ شروع میں یہاں دو طرح کا نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ ان کی مدت تعلیم دو سال اور تین سال تھی۔ اردو اور عربی زبان میں تعلیم ہوتی تھی۔ تعلیمی سال اگست سے شروع ہو کر مئی میں پورا ہوتا تھا۔ قیام کے وقت یہاں پرائیویٹ امتحان کی بھی سہولت تھی۔[1] عملی تعلیم کے لئے شفاخانہ اور دواخانہ کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کچھ ہی دنوں بعد ان کا بندوبست کیا گیا۔ 4/مارچ 1936 کو صدر جامعہ حکیم محمد الیاس خاں نے کالج سے ملحق شفاخانہ اور دواخانہ کا افتتاح فرمایا۔ وسائل کی کمی کے

باوجود یہاں نادار مریضوں کو مفت دوائیں فراہم کرنے کا انتظام تھا۔[2]

ابھی کالج کو جاری ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اس کے دو اہم رکن حکیم محمد کبیر الدین اور حکیم فضل الرحمٰن خاں، نظامیہ طبی کالج کی دعوت پر حیدر آباد چلے گئے۔ان کے بعد حکیم محمد الیاس خاں نے تنہا اسے جاری رکھا۔حالانکہ ان سے بھی حیدر آباد آنے کے لئے اصرار کیا گیا، لیکن انہیں جامعہ طبیہ چھوڑ کر جانا گوارا نہیں ہوا۔وہ خانگی مجبوریوں کا بہانہ کر کے اس کی آبیاری میں لگے رہے اور اس کی بقا و ترقی کے لئے اپنا سارا اثاثہ خرچ کر ڈالا۔[3]

1947 میں تقسیم کے اثرات پورے ملک میں محسوس کئے گئے، اس سے دلی بطور خاص متاثر ہوئی۔قرول باغ، دلی کے ان علاقوں میں تھا جہاں اس کی ہولناکی بے حد شدید تھی، بلوائیوں نے اس کا نقشہ ہی بدل ڈالا تھا۔فسادیوں نے یہاں کے دونوں طبی کالجوں کو سخت نقصان پہنچایا تھا، جب فسادات کا سلسلہ رکا تو حکیم الیاس خاں اور حکیم جمیل خاں نے جامعہ طبیہ اور آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج کی بازآبادکاری کا منصوبہ بنایا تا کہ ان درسگاہوں میں پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو سکے اور جن طلبہ کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے، وہ اسے پوری کر سکیں، لیکن ابھی یہاں کے حالات اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے، اس لئے گلی قاسم جان میں جامعہ طبیہ اور طبیہ کالج قرول باغ کے طلبہ و عملہ پر مشتمل ایک عارضی نوعیت کی مشترک درسگاہ قائم کی گئی۔حکیم محمد الیاس خاں اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔یہ درسگاہ گلی قاسم جان کی اسی تاریخی عمارت میں تھی جس میں حکیم عبد المجید خاں نے مدرسہ طبیہ شروع کیا تھا۔ایک سال بعد 1949 میں حالات بہتر ہونے پر آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج اپنے کیمپس میں منتقل ہو گیا، جب کہ جامعہ طبیہ یہیں حکیم محمد الیاس خاں کی نگرانی میں جاری رہا۔[4]

جامعہ طبیہ کو حکیم عبد الحمید کا مالی تعاون حاصل تھا۔1949 ہی سے وہ اسے مالی تعاون فراہم کر رہے تھے۔اس لئے حکیم محمد الیاس خاں اسے اپنے بعد ان کی تولیت میں دینا چاہ رہے تھے۔انھوں نے اپنی وفات سے پہلے باضابطہ وصیت کے ذریعہ جامعہ طبیہ کو ہمدرد ٹرسٹ کے حوالہ کر دیا۔1963 میں حکیم عبد الحمید نے اسے اپنی تحویل میں لے کر 1973 میں اس کو "ہمدرد طبی کالج" کے نام سے موسوم کیا۔یہ کالج 1980 میں جامعہ ہمدرد کے موجودہ کیمپس میں منتقل ہوا۔1989

میں جامعہ ہمدرد کے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرنے کے بعد ہمدرد طبی کالج نے فیکلٹی کا درجہ حاصل کیا۔اس وقت سے اس کے انتظامی امور کی نگراں ہمدرد یونیورسٹی ہے۔اس سے پہلے 1935 سے 1975 تک اس کا الحاق بورڈ آف آیورویدک اینڈ یونانی، دہلی ایڈمنسٹریشن سے تھا، 1976 سے 1988 تک یہ دلی یونیورسٹی سے ملحق رہا۔فیکلٹی بننے کے بعد پروفیسر جمیل احمد اس کے پہلے ڈین مقرر ہوئے۔ان کے بعد بالترتیب پروفیسر ایم اے جعفری، پروفیسر سید شاکر جمیل، پروفیسر مشکور احمد، پروفیسر ٹی اے صدیقی ڈین ہوئے۔

1994 میں یہ درسگاہ ان طبی اداروں کی فہرست میں شامل ہوگئی جہاں پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم کا انتظام ہے۔ یہاں 1994 سے شعبۂ معالجات اور شعبۂ علم الادویہ میں اور 2000 سے شعبۂ تحفظی وسماجی طب میں ایم ڈی کی تعلیم ہورہی ہے۔اس فیکلٹی کا شمار ہندوستان کی ان چند درسگاہوں میں ہے جن میں پری طب کے ذریعہ اورینٹل اسٹریم کے طلبہ کے لئے بی یو ایم ایس کرنے کی سہولت ہے۔

یکم اگست 1989 کو وزیر اعظم ہند راجیو گاندھی کے ہاتھوں جامعہ ہمدرد کا افتتاح ہوا۔اس موقع پر یونیورسٹی کے پہلے شیخ الجامعہ ڈاکٹر اختر حسین نے خطبۂ استقبالیہ میں جامعہ کے تفردات وامتیازات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ یہاں روایتی طب، جدید سائنس اور جدید سائنسی ذرائع کی مدد سے پڑھائی جاتی ہے۔ نیز انھوں نے طب کی تجدید سے متعلق جامعہ کے عزائم اور منصوبوں کا تفصیل سے ذکر کیا تھا۔[5] بلاشبہ جدید اسلوب میں طب کی تفہیم ایک عصری داعیہ ہے۔اس کی شروعات مسیح الملک نے کی تھی۔حکیم محمد الیاس خاں اور حکیم عبدالحمید اس نظریہ کے مویدین میں تھے۔اس تائید وحمایت کے باوجود وہ اس سلسلہ میں حدود و قیود کے بھی حامی تھے۔حکیم عبدالحمید نے 1957 میں برہان پور میں منعقد طبی کانفرنس کے اجلاس میں جدیدیت کے بارے میں اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> ”ہم اپنی درسگاہوں میں ایسے طبیب پیدا کرنا چاہتے ہیں جن میں قدامت کی پوری خوبیوں کے ساتھ جدت کی خامیاں بھی نہ ہوں اور وہ قدامت اور جدت کا ایک ایسا مجموعہ ہوں جو ہمارے وطن کی طبی ضرورتوں

کو پورا کر سکیں اور اس کی صحتی مشکلات کو واقعی دور کر سکیں۔"[6]

لیکن جامعہ کے موجودہ تعلیمی نظام میں جدیدیت کا رجحان اتنا زیادہ ہے کہ طب کا روایتی اسلوب کھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس اصلاح طلب پہلو پر توجہ کی ضرورت ہے۔ اس ادارہ کی پون صدی کی سنہری تاریخ ہے۔ اس مدت میں تعلیمی میدان میں اس کی بیش قدر خدمات رہی ہیں، ساتھ ہی عالم طب پر اس ادارہ کے گہرے اثرات ہیں۔ یہاں تعلیم و تحقیق کے حوالہ سے جو اسلوب رواج پائے گا، وہ دوسرے طبی درسگاہوں کے لئے نمونۂ عمل بنے گا، اس لئے جدیدیت کے حوالہ سے اس وقت جامعہ میں جو رجحان پنپ رہا ہے اس پر سنجیدہ انداز میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

1۔ الحکیم، جلد 20، شمارہ 8، جون 1935، ص 8

2۔ الحکیم، جلد 21، شمارہ 6، اپریل 1936، ص 40

3۔ الواح الصنادید، مرتبہ عطاء الرحمٰن قاسمی، مطبوعہ شیروانی آفسیٹ پریس، دہلی، شائع کردہ ولی اللہ اکیڈمی دہلی، 1989، ص 311-310

4۔ جامعہ طبیہ میگزین، مطبوعہ بہاری پرنٹنگ پریس دہلی، 1967، ص 31

5۔ پروسیڈنگ آف دی ان آگریشن آف جامعہ ہمدرد، 1 راگست 1989 ص 3-2

6۔ خطبات حمید از حکیم عبدالحمید، مرتبہ ڈاکٹر خاور ہاشمی، 1995، خواجہ پریس، دہلی، ص 77

مدرسہ نظامیہ خلیلیہ۔ٹونک

اس مدرسہ کی ابتداء حکیم سید برکات احمد ٹونکی (1863-1928) کے ہاتھوں ہوئی، وہ ریاست ٹونک میں طبیب خاص کے مرتبہ پر فائز تھے۔حکیم سید برکات احمد کو درس وتدریس سے فطری مناسبت تھی، وہ جہاں بھی رہے طلبہ کا ایک حلقہ ان کے ساتھ رہا۔ملازمت کے فرائض اور مطب کے علاوہ انہیں جو وقت ملتا وہ درس وتدریس میں صرف ہوتا تھا۔ان کے ذوق درس وتدریس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے پندرہ پندرہ گھنٹوں تک مسلسل درس دیا ہے۔ان کے علم وفضل کی خبرسن کر دور دراز سے طلبہ ان کے پاس آنے لگے، دھیرے دھیرے یہ تعداد بڑھتی گئی، ابتداء میں طلبہ کی رہائش اور خورد ونوش کا بندوبست حکیم صاحب نے خود کیا اور اپنے مکان کا ایک وسیع حصہ طلبہ کی رہائش کے لئے وقف کردیا تھا، جب طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تو انھوں نے معززین شہر کے اصرار پر اپنے درس کے سلسلہ کو مدرسہ کی شکل دے دی۔ یہاں کے فارغین میں ان کے صاحبزادہ مولانا محمد احمد کے علاوہ شفاء الملک حکیم رضی الدین خاں دہلوی، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا مناظر حسن گیلانی، مولانا محمد شریف اعظم گڑھی، مولانا عبدالقدیر بدایونی (مفتی عدالت عالیہ، حیدرآباددکن) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔بعد میں یہ مدرسہ خلیلیہ کے نام سے موسوم ہوا۔[1] اس مدرسہ میں طب کے علاوہ عربی درسیات کی تعلیم کا بھی انتظام تھا اور اس کی سند تسلیم کی جاتی تھی۔[2] اس مدرسہ میں دوسرے مشرقی علوم کے ساتھ طب کی تعلیم ہوتی تھی، یہ

خالص طب کا ادارہ نہیں تھا۔لیکن ریاست میں طب کی تعلیم کے آغاز کے حوالہ سے اس مدرسہ کا ذکر اہمیت کا حامل ہے۔

حوالہ جات

1۔ ہندوستان کے مشہور اطباء، مرتبہ حکیم حافظ سید حبیب الرحمان، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1988، ص89-90

2۔ آئینہ تاریخ طب، مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 2001،ص390

راجپوتانہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج۔ جے پور

ریاست جے پور میں طبیبوں اور ویدوں کی ایک مشترکہ انجمن بنام راجپوتانہ آیورویدک اینڈ یونانی طبی سبھا جے پور 1924 میں قائم ہوئی تھی۔ اس انجمن کی درخواست پر کونسل آف اسٹیٹ جے پور نے ایک طبی مدرسہ، ایک شفاخانہ، ایک تجارتی دواخانہ اور اردو ہندی میں ایک ماہوار طبی رسالہ کے اجراء کی اجازت عطا کی تھی اور طبی مدرسہ کو امداد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ریاست سے اجازت ملنے کے بعد انجمن کے ذمہ داروں نے 1926 میں محدود پیمانہ پر طبی مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت حکیم محمد آغا حسن انجمن کے جنرل سکریٹری تھے۔[1]

اس کالج میں ویدک کی تعلیم سنسکرت اور ہندی میں ہوتی تھی۔ یونانی طب کی تعلیم کا ذریعہ عربی اور اردو زبان تھی۔ یہاں دو قسم کا نصاب رائج تھا، ایک نصاب اسکول سطح کا تھا جس کی مدت تعلیم دو سال تھی۔ دوسرا نصاب، کالج سطح کا تھا، جو چار برس کی مدت پر مشتمل تھا، یہ نصاب دو دو سال کے دو حصوں پر منقسم تھا۔ یہاں پڑھائے جانے والے نصاب میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی فکر کی تقلید کرتے ہوئے اسی اصول پر تعلیم ہوتی تھی جو طبیہ کالج دہلی میں رائج تھا۔ یہ ایک اقامتی ادارہ تھا، یہاں بیرونی طلبہ کے لئے قیام وطعام کا نظم تھا۔[2]

راجپوتانہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، جے پور میں اردو نصاب کے طلبہ کو عمدۃ الحکماء اور عربی نصاب کی تکمیل کرنے والوں کو ممتاز الحکماء کی سند دی جاتی تھی۔ اس کالج کی

تعمیر و ترقی میں حکیم محمد آغا حسن، حکیم سید واحد علی خاں مسیح آبانیری اور حکیم ابراہیم خاں کی مساعی قابل ذکر ہیں۔ اس کالج میں پرائیویٹ تعلیم کا بھی نظم تھا اور یہ سلسلہ برسوں قائم رہا۔ 1980 میں کالج کے پرائیویٹ امتحانات اور سندوں کا سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب بورڈ آف آیورویدک اینڈ یونانی میڈیسن، راجستھان سے یہ کالج ملحق ہوا، نو برس بورڈ سے متعلق رہنے کے بعد 1989 میں راجستھان یونیورسٹی، جے پور سے اس کا الحاق عمل میں آیا۔[3]

حوالہ جات

1۔ الحکیم، جلد 12، شمارہ 12، اکتوبر 1927، ص 33

2۔ الطبیب، لاہور، جلد 5، شمارہ 9، ستمبر 1938، ص 47

3۔ آئینہ تاریخ طب، مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 2001، ص 388 اور 398

زبیریہ طبیہ کالج۔ جودھپور

یہ کالج صاحب طریقت بزرگ شاہ محمد زبیر کے نام منسوب ہے، ان کا مزار پنجاب میں ہے۔ پنجاب اور اس کے اطراف میں وہ رشد وہدایت کے لئے مشہور تھے، یہاں کے بہت سے لوگ ان سے آج بھی عقیدت اور تعلق رکھتے ہیں۔ شاہ صاحب کے نام معنون اس کالج کے قیام میں حکیم فضل حسین شاہ بخاری، حاجی محمد رمضان قادری، مفتی محمد اشفاق حسین (مہتمم وصدر مدرس دارالعلوم اسحاقیہ۔ جودھپور) ٹھیکیدار عبدالرشید اور محمد اشفاق خاں وغیرہ کی مساعی شامل رہی ہیں۔ انھوں نے جودھپور میں طبی تعلیم کے اہتمام کے لئے زبیریہ طبیہ کالج ٹرسٹ اور زبیریہ طبیہ کالج سنستھا کی تشکیل کی۔ ٹرسٹ کے قیام کی غرض یہ تھی کہ وہ کالج کے لئے مالیات کی فراہمی اور مطلوب وسائل کا بندوبست کرے۔ مذکورہ سبھی حضرات ٹرسٹ کے رکن تھے، یہی لوگ سنستھا کے بھی ممبر تھے، لیکن سنستھا میں ان کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔ سنستھا کے ذمہ کالج کے انتظامی امور کی نگرانی تھی۔ 31/اگست 1979 کو کالج کا قیام عمل میں آیا اور اسی سال تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس وقت یہ بورڈ آف انڈین میڈیسن جے پور راجستھان کے زیر اہتمام تھا۔ 1989-90 میں راجستھان یونیورسٹی سے الحاق کے بعد کالج کے سارے معاملات یونیورسٹی کے زیر انتظام انجام پانے لگے۔

محمد رمضان قادری جو زبیریہ طبیہ کالج ٹرسٹ اور سنستھا کے اہم رکن تھے، ان کے ذاتی مکان ''چاند خاں بلڈنگ'' میں تعلیم کا عارضی بندوبست ہوا۔ تقریباً 1988 تک اس بلڈنگ میں یہ کالج جاری رہا، پھر لال بہادر شاستری کمیتی کے ذمہ داروں کے تعاون سے دوسری بلڈنگ میں منتقل ہو گیا اور آخر تک وہیں رہا۔ 89-1988 میں کالج کے مستقل کیمپس کے لئے ساڑھے پانچ بیگھے زمین خریدی گئی۔

جب کالج کے قیام کے بعد اساتذہ کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا تو کالج کے منتظمین نے حکیم خلیل احمد (استاذ شعبۂ معالجات، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ) سے مشاورتی تعاون حاصل کیا اور انہی کے ایما پر حکیم عبدالحنان (سابق جوائنٹ ڈائرکٹر، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی) اور حکیم انوار علی (ابھی حال ہی میں اسٹیٹ میڈیکل کالج، الٰہ آباد سے سبکدوش ہوئے ہیں) کا انتخاب ہوا۔

حکیم عبدالحنان زبیریہ طبیہ کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی کی ملازمت کے بعد جب وہ اس عہدہ سے مستعفی ہو گئے تو ان کی جگہ حکیم انوار علی کو پرنسپلی تفویض ہوئی۔ پھر بالترتیب حکیم کشف الدجی اور حکیم حمد اللہ فراہی (اعظم گڑھ) پرنسپل ہوئے۔ 1986 سے 1995 تک تقریباً دس برس حکیم محمد عرفان زبیریہ طبیہ کالج کے پرنسپل رہے۔ انہی کے زمانہ میں کالج کیمپس کے لئے زمین خریدی گئی۔ ان کے زمانہ پرنسپلی میں کئی نامساعد حالات آئے جن سے نبرد آزمائی میں انھوں نے کامیابی حاصل کی۔ حکیم محمد عرفان کا آبائی وطن فرخ آباد، یوپی ہے۔ ان کے والد امیر خاں اسلامیہ کالج، فیروز آباد میں ملازم تھے۔ اس لئے ان کی ابتدائی تعلیم فیروز آباد میں ہوئی۔ انھوں نے آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج قرول باغ دہلی سے بی یو ایم ایس کیا ہے۔ 1995 میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں تقرر کے بعد وہ زبیریہ طبیہ کالج سے مستعفی ہو گئے۔ ان کے بعد حکیم ابراہیم خاں، جو زبیریہ طبیہ کالج کے فارغ تھے، پرنسپل مقرر ہوئے۔

مجلس منتظمہ کی باہمی رسہ کشی کی وجہ سے قیام کے کچھ ہی سال بعد کالج کے حالات بگڑنے شروع ہو گئے اور دن بدن بگڑتے ہی چلے گئے۔ اس کی وجہ سے طلبہ، اساتذہ اور دوسرے

کئی لوگوں کو کالج کے معاملات میں دخل اندازی کا موقع مل گیا۔ حتیٰ کہ زبیریہ طبیہ کالج ٹرسٹ اور زبیریہ طبیہ کالج سنستھا کے متوازی زبیریہ طبیہ کالج پربندھک کمیٹی کے نام سے ایک نئی دعویدار انتظامی کمیٹی وجود میں آگئی۔ جب بدنظمی حد سے متجاوز ہوئی تو یہ معاملہ عدالت میں پہنچ گیا اور مجلسِ انتظامی کے بعض اراکین نے عدالت کے سامنے کالج کو بند کردینے کی درخواست پیش کردی۔ جب اخبارات ورسائل تک میں کالج کی بدنظمی کا تذکرہ ہونے لگا تو جودھپور ہائی کورٹ نے 1996 میں کالج بند کرنے کا فیصلہ صادر کردیا۔ دراصل حالات کی خرابی اس انتہا کو پہنچ گئی تھی جہاں کالج کو جاری رکھنے کی ساری توقعات ختم ہوگئی تھیں۔ کالج بند ہوجانے کے بعد زیر تعلیم طلبہ کی ادھوری تعلیم پوری کرنے کا انتظام راجپوتانہ یونانی میڈیکل کالج، جے پور میں کیا گیا لیکن وہاں جاکر تعلیم کی تکمیل، طلبہ کے لئے ایک بارگراں تھی۔ لہٰذا ان کی درخواست پر زبیریہ طبیہ کالج ہی میں ان کی باقی تعلیم پوری کرنے کا بندوبست کیا گیا اور لال بہادر شاستری کمیتی کے ذمہ داروں کی نگرانی میں ان طلبہ نے تعلیم پوری کی۔

جودھپور ہائی کورٹ نے کالج کے ناقص انتظام کی وجہ سے اسے بند کرنے کا حکم ضرور دیا، لیکن اس بات کی گنجائش رکھی کہ ضروری وسائل کے انتظام اور سی سی آئی ایم کے مطلوبہ تقاضوں کی تکمیل کے بعد اسے دوبارہ شروع کیا جاسکتا ہے۔ اس وقت سے کالج کی پراپرٹی زبیریہ طبیہ کالج سنستھا کے رکن اور لال بہادر شاستری کمیتی کے سکریٹری جاوید عراقی کی تحویل میں ہے۔ یونانی طب کے کئی بہی خواہ اس کوشش میں ہیں کہ ضروری وسائل کا انتظام کرکے اس بند پڑے کالج کو ازسرنو شروع کیا جائے۔ دیکھئے اس کی نوبت کب آتی ہے۔

زبیریہ طبیہ کالج جودھپور تقریباً سترہ برس جاری رہا۔ یہ کالج اپنے قیام کے زمانہ سے لے کر بند ہونے تک ہمیشہ مالی مسائل سے دوچار رہا۔ ایک بار جب کالج سخت دشواریوں سے گزر رہا تھا اور بند ہونے کے قریب پہنچ گیا تھا تو مفتی محمد اشفاق حسین، مہتمم دارالعلوم اسحاقیہ نے مدرسہ کے فنڈ سے ایک خطیر رقم کالج کو بطور قرض دے کر اسے مالی بحران سے نکالنے میں

مدد کی تھی۔

اس کالج سے سیکڑوں طلبہ نے بی یو ایم ایس کی اسناد حاصل کیں۔ یہاں کے کئی فارغ طلبہ دوسری درسگاہوں میں تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس کالج کے تیس سے زائد فارغین صوبہ کے محکمہ صحت میں بطور میڈیکل آفیسر مامور ہیں اور سیکڑوں طلبہ صوبہ اور دوسری ریاستوں کے قصبات و قریات میں عوام کو طبی سہولت پہنچانے کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ کالج کے بند ہونے سے یہ سارے سلسلے منقطع ہو گئے۔ یہ تأسف کا مقام ہے کہ جن لوگوں نے کالج کو قائم کیا تھا وہی اس کے بند ہونے کا باعث بن گئے۔

راجستھان یونانی میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل۔ جے پور

اس کالج کے بانی اور روح رواں حکیم عبداللہ خاں ہیں، ان کا شمار راجستھان کے سربرآوردہ طبیبوں میں تھا۔ فنی مہارت اور مطب و معالجہ سے تعلق کی وجہ سے وہ عوام وخواص میں بے حد مقبول اور قدر واحترام کے مالک تھے۔ سیاسی مزاج کے نہ ہونے کے باوجود سیاستدانوں اور سماج کے باثر طبقے سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ ایک عرصہ تک وہ راجپوتانہ طبیہ کالج، جے پور میں استاذ رہے۔ پھر یہاں سے مستعفی ہو کر ایک علاحدہ یونانی کالج کے قیام کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ کی تکمیل میں ان کے شخصی اثر ورسوخ بہت کام آئے۔ اس وقت دیوی شنکر تیواری صوبہ میں وزیر تعلیم تھے۔ انھوں نے نہ صرف حکیم صاحب کے عزائم کی تحسین کی، بلکہ اپنی سطح سے ہر ممکن تعاون بھی پیش کیا۔

راجپوتانہ طبیہ کالج کی ملازمت سے علاحدگی کے بعد حکیم صاحب نے طبی ترقی سوسائٹی، راجستھان کی تشکیل کی اور اس کے زیر اہتمام 5/نومبر 1980 کو راجستھان یونانی میڈیکل کالج، جے پور معرض وجود میں آیا اور ایل بی ایس کالج کے کیمپس میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ جب حالات نسبتاً بہتر ہوئے تو ہانڈی پورہ چار دروازہ کی ایک وسیع عمارت میں کالج کو منتقل کر کے زیادہ بہتر انتظام کے ساتھ تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ قیام کے وقت کالج کا الحاق راجستھان یونیورسٹی، جے پور سے تھا۔

حکیم عبداللہ خاں کی زندگی تک اس کالج کی پیش رفت بہت اچھی رہی۔ ان کی کوششوں سے صوبائی حکومت سے کالج کو کچھ گرانٹ بھی ملنے لگی تھی۔ درازیٔ عمر اور مستقل صحت خراب رہنے کے باعث کالج سے ان کا عملی تعلق دھیرے دھیرے کم ہوگیا۔ جسمانی وزن میں بے حد اضافہ اور موٹاپا کے دوسرے عوارضات کی وجہ سے وہ ایک عرصہ تک صاحب فراش رہنے کے بعد انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کالج کے لئے ایک بڑا سانحہ ثابت ہوئی اور کالج ہر طرح کی بدنظمیوں خصوصاً مالی بدعنوانیوں کی آماجگاہ بن گیا۔

حکیم عبداللہ خاں کے بعد حکیم سعود علی خاں (موجودہ پرنسپل اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے پرنسپل شپ اور ہاسپٹل سپرنٹینڈنٹ کا عہدہ سنبھالا، لیکن حالات بہتر ہونے کے بجائے دن بدن خراب ہی ہوتے گئے۔ مستقل بدنظمیوں کی وجہ سے یونیورسٹی نے کالج کا الحاق رد کر دیا۔ سی سی آئی ایم نے داخلوں پر پابندی عائد کر دی اور حکومت سے ملنے والی گرانٹ بھی بند ہوگئی۔ ان حادثات نے کالج کو نیم مردہ کر دیا۔ اساتذہ دھیرے دھیرے رخصت ہونے لگے۔ سیکڑوں طلبہ جو کالج میں زیر تعلیم تھے، ان کا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اسٹوڈنٹ یونین کی تشکیل کر کے کالج کے تحفظ کے لئے جدوجہد شروع کی۔ برسوں کالج میں دھرنے، مظاہرے اور حکومت کو عرضداشتیں پیش کرنے کا سلسلہ رہا۔ بالآخر 29 ستمبر 2003 کو مجلس منتظمہ تحلیل کر کے نئی مینجنگ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اب یہی کمیٹی کالج کے نظم و نسق کی نگراں ہے۔ اس کے اراکین میں اکثریت انہی طلبہ کی ہے، جو اسٹوڈنٹ یونین کے لئے منتخب ہوئے تھے اور جن کی جدوجہد سے کالج بند ہونے سے محفوظ رہا۔

جب طلبہ کی جدوجہد کے نتیجہ میں کالج کی بازآبادکاری کے امکان پیدا ہوئے تو ایک مسئلہ یہ سامنے آیا کہ سی سی آئی ایم اسے ایک نیا کالج تسلیم کر کے اس پر موجودہ قواعد و ضوابط لاگو کرنا چاہتی تھی، جس میں بے حد دشواریاں تھیں۔ اس لئے عدالت سے کالج کی سابقہ حیثیت قائم رکھنے کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ عدالت عالیہ نے سی سی آئی ایم کے اس حکم پر روک لگاتے ہوئے جودھ پور آیورویدیونیورسٹی کو داخلوں کی کارروائی عمل میں لانے کا حکم دیا، تب سے یہ کالج جودھ پور یونیورسٹی سے ملحق ہے اور اسی کے زیر اہتمام 05-2004 سے یہاں داخلے اور تعلیم کا

دوبارہ آغاز ہوا۔

نئی مینیجنگ کمیٹی میں نسیم الدین خاں (پیارے میاں) چیرمین، حکیم عبدالرحیم خاں اور ڈاکٹر سہیل انصاری وائس چیئرمین، ڈاکٹر پرویز اختر وارثی سکریٹری، ڈاکٹر سرفراز حسین اور محمد امین خاں فائنانس سکریٹری، ڈاکٹر سید عبدالمجیب جوائنٹ سکریٹری اور ڈاکٹر محمد رضوان خاں ڈپٹی سکریٹری ہیں۔ یہ لوگ بڑی لگن سے کام کر رہے ہیں۔ ان سے کالج کی ترقی کے بارے میں بڑی امیدیں ہیں۔

باوجودیکہ اس کالج کا قیام 1980 میں ہوا تھا، لیکن 2004 میں تنظیم نو کے بعد اس نے اپنے سفر کا نئے سرے سے آغاز کیا ہے۔ ابھی اس کے سامنے ایک طویل مسافت ہے۔ حال ہی میں صوبائی حکومت کی طرف سے زمین کے الاٹمنٹ کی منظوری ملی ہے۔ اسے تحویل میں لے کر کالج کیمپس تعمیر کرنے کا منصوبہ ہے۔ ہنوز کالج کرایہ کی بلڈنگ میں ہے، لیکن امید ہے جلد ہی اپنی بنیادوں پر کھڑا ہو جائے گا۔

گورنمنٹ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج۔ میسور

گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج بنگلور کے استاذ پروفیسر محمد خالد (صدر شعبۂ علاج بالتدبیر) کی اطلاع کے مطابق گورنمنٹ طبیہ کالج میسور کے فارغین کا پہلا بیچ 1921 یا 1924 میں نکلا تھا۔ اس بیچ کے طلبہ میں حکیم محمد یوسف، حکیم ایم زیڈ سراج زیبائی اور حکیم میر اعظم سے ان کی ملاقاتیں بھی رہی ہیں۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمان نے اس کالج کا سن قیام 1928 تحریر کیا ہے۔ اگر فارغین کا پہلا بیچ 1921 یا 1924 میں نکلا ہے تو کالج کا زمانۂ قیام 1917 سے 1920 کا درمیانی عرصہ ہونا چاہئے۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے مہاراجہ جیا چامراجندر وڈیر کو کالج کا بانی قرار دیا ہے۔ جبکہ پروفیسر محمد خالد کے مطابق مہاراجہ کرشناراج وڈیر نے یہ کالج قائم کیا تھا۔[1]

مہاراجہ کرشناراج وڈیر ایک مسلم دوست حکمراں تھا۔ اس کے دربار سے اطباء کی ایک جماعت وابستہ تھی۔ وہ یونانی طب کا بڑا حامی تھا، اصلاً اس کا ارادہ صرف یونانی کالج قائم کرنے کا تھا، لیکن عدم رواداری کے الزام سے بچنے کے لئے اس نے طبیہ کالج کے ساتھ آیورویدک کالج بھی قائم کیا۔

یہاں ڈپلومہ سطح کی تعلیم ہوتی تھی۔ یونانی فارغین کو LUMS، (Licentiate of Unani Medicine and Surgery) اور آیورویدک کے طلبہ کو LAMS کی سند دی جاتی تھی۔

طبیہ کالج میں پڑھائے جانے والے نصاب میں یونانی مضامین کے ساتھ جدید طبی مضامین بھی شامل تھے۔ اناٹومی، فزیالوجی اور فارماکولوجی وغیرہ کی تعلیم کے لئے میسور میڈیکل کالج کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ طبیہ کالج کے ہاسپٹل میں مریضوں کو دی جانے والی دواؤں کی تیاری کے لئے فارمیسی کا ایک مستقل شعبہ قائم تھا۔ یہاں نہایت عمدہ معیار کے ساتھ دوائیں تیار ہوتی تھی۔ ادویہ کی تیاری کے لئے جدید قسم کی مشینوں کا سہارا لیا جاتا تھا۔

یہاں کے اساتذہ میں حکیم میر زین العابدین ندوی، حکیم میر غوث، حکیم سید غوث محی الدین اور ڈاکٹر حسین شریف کے ناموں کا پتہ چلتا ہے۔[2]

یہ کالج 1959 میں بند ہوا۔[3] اس کی وجہ اساتذہ کا اختلاف بتایا جاتا ہے۔ حکیم سید احمد، حکیم عبدالکریم خرشی، حکیم سید مرتضیٰ اور حکیم میکری یہاں آخری زمانہ میں استاذ تھے۔ حکیم خرشی کا خیال تھا کہ کالج کے نصاب میں یونانی مضامین کی فوقیت ہونی چاہئے اور انہی کی تعلیم پر اصل زور صرف ہونا چاہئے، لیکن حکیم میکری جدید مضامین کے غلبہ کے حامی تھے۔ دھیرے دھیرے یہ اختلاف حد سے آگے بڑھا اور پوری اساتذہ برادری دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ آیورویدک کالج کے لوگوں نے طبیبوں کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا اور ان کے اختلاف کو مزید ہوا دی۔ اساتذہ کے اختلاف کے نتیجہ میں کالج کا نظام بے حد کمزور ہوگیا اور یہاں تعلیم و تدریس نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ بالآخر 1959 میں یہ کالج اساتذہ کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ اس کے بند ہوجانے کے بعد اب یہاں صرف ایک یونانی ہسپتال ہے، جسے دیکھ کر یونانی طب کے ایک قدیم ادارہ کی یاد آتی ہے۔

حوالہ جات

1۔ آئینہ تاریخ طب، مؤلفہ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمان، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، 2001، ص 388

2۔ عطر حیات، حکیم میر زین العابدین ندوی، مطبوعہ الکلام پریس بنگلور، 1952، ص 102

3۔ مسیحا (سلور جوبلی میگزین)، گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج بنگلور، 2002، ص 13

گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج۔ بنگلور

1959 میں طبیہ کالج، میسور کے بند ہو جانے کے بعد ریاست میں طبیبوں کی کمی پوری کرنے کے لئے یہاں کے طلبہ کو وظیفہ دے کر اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ اور نظامیہ طبیہ کالج، حیدرآباد وغیرہ بھیج کر اس کی تلافی کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس طرح ریاست کے شفا خانوں اور ڈسپنسریوں کی نہ تو ضرورت پوری ہو سکتی تھی اور نہ ہی یونانی طب کا تعلیمی مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ انہی باتوں کا احساس گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج، بنگلور کے قیام کا باعث بنا۔ [1]

جنوری 1973 میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کا بنگلور میں اجلاس ہوا۔ اس میں وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی کے علاوہ ریاست کے گورنر، وزیر اعلیٰ، وزیر صحت اور کئی دوسرے وزراء شریک تھے۔ اس موقع پر صدر کانفرنس حکیم عبدالحمید دہلوی نے عمائدین حکومت کو متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا ''ریاست میں طب یونانی کے کالج کے قیام کی ضرورت، بنیادی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کا احساس ایک عرصہ سے ہے اور بغیر اس کے وجود میں آئے ہوئے یہاں طب یونانی ترقی نہ کر سکے گی۔ حکومت میسور اپنی روایتی فراخدلی سے کام لے کر اس کالج کو جلد از جلد قائم کرے۔'' [2] اس مطالبہ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اگلے ہی سال سے ریاست میں یونانی طب کی تعلیم شروع کرنے کی یقین دہانی کی۔ اس طرح 1975 میں گورنمنٹ یونانی کالج کے نام سے اس طبی درسگاہ کا قیام عمل میں آیا اور تجویز پایا کہ یہاں کے فارغین کو

BMBS کی سند دی جائے گی۔ پہلے تعلیمی سال (76-1975) کے لئے پندرہ طلبہ نے داخلہ لیا تھا۔ ان کی تعلیم کے لئے حکیم ایم ایم ایچ بزمی، حکیم سید شاہ جی حیدر، حکیم صبغت اللہ اور حکیم سی ایم ہارون کا تقرر رہا اور کالج کے پرنسپل کا انتظام ہونے تک آیورویدک میڈیکل کالج بنگلور کے پرنسپل ڈاکٹر مادھوسوامی کو عبوری طور پر پرنسپل کی ذمہ داری تفویض ہوئی۔ 1977 میں سی سی آئی ایم نے سارے طبیہ کالجوں کے لئے یکساں ڈگری اور یکساں نصاب کا ضابطہ نافذ کیا۔ چنانچہ اس کالج نے بھی سی سی آئی ایم کا مجوزہ کورس اپناتے ہوئے BMBS کی جگہ BUMS کی سند دینے کا فیصلہ کیا۔[3]

قیام کے وقت اس کالج کا نام گورنمنٹ یونانی کالج تھا، 1977 میں صوبائی وزیر صحت و خاندانی بہبود نے ایک حکم نامہ جاری کر کے اس کا نام گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نام زیادہ پرشکوہ ہے اور اس نام سے کالج اور یونانی طب کے بارے میں زیادہ اچھا تاثر قائم ہوگا۔[4]

اس کالج کی تعمیر و ترقی میں حکیم محمد عبدالرزاق (سابق ڈائرکٹر سی سی آر یو ایم۔ نئی دہلی) کا اہم کردار ہے۔ کالج کے استاذ اور کارگزار پرنسپل حکیم صبغت اللہ چاہتے تھے کہ یہاں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو لیکن حکیم عبدالرزاق نے اس رائے کی مخالفت کرتے ہوئے اردو زبان میں تعلیم و تدریس کی وکالت کی۔ دسمبر 1980 میں کرناٹک گورنمنٹ نے صوبہ کے اندر یونانی طب کی ترقی کے لئے اسٹیٹ ایڈوائزری کمیٹی قائم کی، عبدالرزاق صاحب کو اس کا چیئرمین بنایا، انھوں نے ستمبر 1981 میں عبوری رپورٹ پیش کی۔ اس زمانہ میں عبدالصمد صاحب وزیر صحت تھے۔ وہ یونانی طب کے بڑے بہی خواہ تھے۔ انھوں نے رپورٹ کی تجویز کے مطابق یونانی میڈیکل کالج بنگلور کے پہلے بیچ کے تمام طلبہ کا صوبہ میں یونانی فزیشین کی خالی جگہوں پر تقرر کروایا، تا کہ صوبہ کے عوام کو اس کالج سے دلچسپی پیدا ہو۔ 1981 تک یونانی میڈیکل کالج بنگلور میں صرف چار اساتذہ تھے۔ اس کے علاوہ حکومت نے ایک پروفیسر اور ایک اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ سینکشن کر دی تھی، مگر ابھی ان پر تقرر نہیں ہو سکا تھا۔ حکیم عبدالرزاق کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اس کالج کے لئے پندرہ لکچرر، دس ریڈر، سات پروفیسر اور ایک پرنسپل کی پوسٹ منظور کروائی۔ اب تک

ہندوستان کے کسی کالج کے لئے اساتذہ کی اتنی آسامیاں منظور نہیں ہوئی تھیں۔ حکیم عبدالرزاق کی تجویز تھی کہ اساتذہ کی تقرری صرف صوبہ کے بجائے، پورے ملک سے کی جائے۔ انھوں نے عمر اور تجربہ میں بھی ڈھیل کی سفارش کی تھی تاکہ اچھے اساتذہ کا انتخاب ہو اور منظور شدہ آسامیاں خالی نہ رہیں۔ اساتذہ کے انتخاب کے سلسلہ میں صوبائی قید کے استثناء کی وجہ سے حکیم سید اشتیاق احمد (اعظم گڑھ۔ یوپی) کا پروفیسر کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ چونکہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں قائم ہونے جا رہا تھا۔ لہٰذا حکیم صاحب نے اپنی رپورٹ میں یہ تجویز رکھی کہ بنگلور کے یونانی کالج کو گلبرگہ منتقل کر دیا جائے۔ ان کے خیال میں وہاں اس کالج کی ترقی کے زیادہ مواقع تھے۔ حکومت نے اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے 1982 میں اسے بنگلور سے گلبرگہ منتقل کر دیا۔ چونکہ گلبرگہ میں ضروری انفرااسٹرکچر موجود نہیں تھا اور یہاں امید کے برعکس داخلے بہت کم ہوئے۔ گلبرگہ میں صرف پانچ طلبہ نے داخلہ لیا۔ لہٰذا حکومت کو اپنا موقف بدلتے ہوئے کالج کو دوبارہ بنگلور منتقل کرنا پڑا۔[5]

جس وقت یہ کالج گلبرگہ منتقل ہوا، پروفیسر حکیم سید اشتیاق احمد اس کے پرنسپل تھے۔ ان کی مشہور تالیف ''کلیات عصری۔ جزء اوّل'' اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ یہ کتاب دراصل مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے نصابی اصلاح کے اس منصوبہ کا حصہ ہے، جس کے لئے انھوں نے ماہر اطباء کی کمیٹی تشکیل کر کے قانون عصری تالیف کروائی تھی۔[6] یہ اس کالج کے لئے ایک بڑا اعزاز ہے کہ اس کے ایک استاذ نے اجملی مشن میں اپنا کردار ادا کیا۔ یہ اس کالج کا بے حد یادگار واقعہ ہے۔

جب تک حکیم محمد عبدالرزاق اسٹیٹ ایڈوائزری کمیٹی کے چیرمین رہے، یہاں ہمہ جہت ترقی ہوئی لیکن ان کے بعد اس کی رفتار کافی سُست ہوگئی۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ صوبائی حکومت نے 1989 میں کالج بلڈنگ کے لئے زمین الاٹ کی تھی، جس پر 1996 میں تعمیراتی کام شروع ہوا، پھر وقت سے فنڈ نہ مل پانے کی وجہ سے کام کی رفتار کافی مدھم رہی۔

2002 میں کالج نے سلور جوبلی تقریب کا انعقاد کیا تھا۔ اس وقت طبیبہ حسیب النساء (پروفیسر و صدر، شعبۂ امراض نسواں) کالج کی پرنسپل تھیں۔ ان کے علاوہ مزید پانچ پروفیسر، بارہ ریڈر اور چار لکچرر تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے، جبکہ لکچرر کی گیارہ آسامیاں خالی تھیں۔

تازہ اطلاع کے مطابق یہ اب بھی خالی پڑی ہیں اب تک ان پر تقرری نہیں ہو سکی ہے۔ البتہ تعمیرات کا بیشتر کام پورا ہو چکا ہے۔ انفرا اسٹرکچر کے اعتبار سے یہ کالج اب بہتر حالت میں ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی اساتذہ کی خالی آسامیاں پُر ہو جائیں گی۔

حکیم عبدالرزاق نے یہاں اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دے کر اردو ماحول کو فروغ دینے کی کوشش کی تھی، لیکن اس پہلو سے کالج کیمپس کو دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے۔ اردو زبان سے یونانی طب کا جو لسانی رشتہ ہے اس کی وجہ سے طبی درسگاہوں میں اردو کلچر کی توقع کی جاتی ہے۔ اکثر مشاہدہ ہوتا ہے کہ جن طبیہ کالجوں میں یونانی مضامین پر توجہ کم ہوتی ہے، وہاں اردو ماحول کا بھی فقدان ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی معاملہ ہے۔ طلبہ اور اساتذہ کی ساری توجہ صرف جدید مضامین تک محدود ہے۔ طبی مضامین کی تعلیم بس روایتی طور پر خانہ پری کے انداز میں ہو رہی ہے۔ اس پہلو پر کالج کے ذمہ داروں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

1۔ سلور جبلی میگزین، گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج بنگلور، 02-2001، ص 13

2۔ خطبات حمید از حکیم عبدالحمید، مرتبہ ڈاکٹر خاور ہاشمی، مطبوعہ خواجہ پریس، دہلی، 1995، ص 229-228

3۔ ملاحظہ فرمائیں حوالہ نمبر 1

4۔ ایضاً، ص 14

5۔ مجاہد طب حکیم عبدالرزاق، مرتبین ام الفضل اور سید غلام مہدی، ریکمو پریس، دہلی، 2010، ص 50-46

6۔ کلیات عصری، مؤلفہ پروفیسر سید اشتیاق احمد، مطبوعہ نیو پبلک پریس، دہلی، طبع اول 1983، ص سرورق اور ص 28-27

لقمان یونانی میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل ۔ بیجاپور

بیجاپور (کرناٹک) کا شمار ہندوستان کے قدیم تاریخی شہروں میں ہے۔ گول گنبد، ابراہیم روضہ اور بارہ کمان (نامکمل تعمیر) جیسے قدیم آثار اس کی تاریخی اہمیت کے مظہر ہیں۔ بیجاپور کو عادل شاہی عہد میں دارالسلطنت ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ اس شہر سے طب کا تعلق صدیوں پرانا ہے۔ محمد قاسم فرشتہ (1525-1623) عادل شاہی دور کا نمائندہ طبیب ہے۔ اس کی مشہور تالیف 'اختیارات قاسمی' (دستورالاطباء) اس عہد کی ایک اہم طبی یادگار ہے۔

بیجاپور کا یہ تاریخی اور تہذیبی پس منظر اس کے شاندار ماضی کی یاد دلاتا ہے۔ سوشیو اکنامک اینڈ کلچرل ایسوسی ایشن آف بیجاپور (SECAB) دراصل ایک مہم ہے اسی ماضی کے تلاش کی۔ شمس الدین پونیکر اس کے ڈائرکٹر اور شمس الدین اکبر پاٹل سکریٹری ہیں۔ اس تنظیم نے بیجاپور میں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے 22 ادارے قائم کیے ہیں۔ ان میں تعلیم نسواں اور پیشہ وارانہ تعلیم کا بھی انتظام ہے۔

SECAB ہی کے زیر اہتمام 1996 میں لقمان یونانی میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل کا قیام عمل میں آیا تھا۔ صوبہ کی دوسری طبی درسگاہوں کی طرح اس کا بھی الحاق راجیو گاندھی یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز کرناٹک، بنگلور سے ہے۔ اب تک اس کالج سے گیارہ بیچ فارغ ہو چکے ہیں۔ قیام سے اب تک داخلہ اور فراغت کا یہ سلسلہ بلا انقطاع جاری ہے۔ ابھی اسے قائم ہوئے صرف

ڈیڑھ دہائی ہوئی ہے، اس عرصہ میں لقمان یونانی میڈیکل کالج نے استحکام اور تعمیر کے جو مراحل طے کیے ہیں وہ اطمینان بخش ہیں۔ توقع ہے کہ اس کے ذریعہ ان طبی روایتوں کا احیاء ہوگا جو اس شہر کی سنہری تاریخ کا حصہ رہی ہیں۔

اس کالج کی ترقی میں بحیثیت پرنسپل کردار ادا کرنے والوں میں حکیم ذاکر، حکیم غلام، حکیم امینہ یاسمین، حکیم شکیلہ بانو اور حکیم فریدالدین کے اسماء شامل ہیں۔ 2010 سے حکیم عاقل قادری بطور پرنسپل خدمت انجام دے رہے ہیں۔ قادری اچھی صلاحیت رکھتے ہیں، انھوں نے معالجات اور نسواں وقبالت دو مضامین میں ایم ڈی کی ہے۔ امید ہے ان کی صلاحیتیں کالج کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔

ارتقائی مرحلہ میں ہونے کے باوجود یہ کالج بہتر تأثر قائم کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقامی طلبہ کے علاوہ صوبہ کے دور دراز کے علاقوں اور دوسرے صوبوں کے طلبہ بھی یہاں تعلیم کے لئے راغب ہو رہے ہیں۔ ان کے لئے ہوسٹل کی سہولت فراہم ہے۔ طلبہ وطالبات کے لئے رہائش اور طعام کا علاحدہ نظم ہے۔ کالج کو سی سی آئی ایم سے چالیس طلبہ کے داخلہ کی اجازت ہے۔ SECAB ایک مضبوط تنظیمی ادارہ ہے۔ امید ہے کہ اس کے زیر اہتمام اس کالج کو فروغ حاصل ہوگا اور اس کالج سے بیجاپور کی شاندار طبی روایتوں کا احیاء ہوگا۔

ٹیپو سلطان یونانی میڈیکل کالج۔ گلبرگہ

1998 میں ٹیپو سلطان شہید ایجوکیشنل ٹرسٹ کی تشکیل ہوئی۔ محمد عظیم الدین (ایڈوکیٹ) اس کے صدر، نصر اللہ حسینی سکریٹری اور ایس اے غنی (ایڈوکیٹ) ڈائرکٹر ہیں۔ انہیں کی مساعی سے ٹیپو سلطان یونانی میڈیکل کالج کا قیام عمل میں آیا۔ 1998 میں سی سی آئی ایم کی منظوری اور راجیو گاندھی یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز کرناٹک، بنگلور سے الحاق کے بعد یہاں داخلہ اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ [1]

گلبرگہ میں ملت نگر روڈ پر کالج کا کیمپس ہے۔ اسے قائم ہوئے ابھی ایک دہائی سے کچھ ہی زیادہ عرصہ ہوا ہے، اداروں کے استحکام کے لئے یہ مدت بہت معمولی ہوتی ہے۔ اس قلیل عرصہ میں کالج نے اطمینان بخش ترقی کی ہے۔ یہاں بنیادی لوازم سے تعلق رکھنے والے بیشتر اسباب مہیا ہیں۔ منتظمین نے اسی طرح جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا تو مستقبل میں یہ ایک اچھے ادارہ کی صورت اختیار کرے گا۔

کالج کے قیام سے اب تک حکیم عبدالمتین، حکیم محمد اشفاق، حکیم ذاکر حسین، حکیم شہاب الحق، حکیم اسریٰ عزیز، حکیم سید عبدالقدیر، بطور پرنسپل خدمت انجام دے چکے ہیں۔ [2]

2007 سے پروفیسر سید جمال اللہ باشا (متوطن ضلع کڑپا، آندھرا پردیش) اس عہدہ پر فائز ہیں۔ وہ اس سے پہلے ڈاکٹر عبدالحق یونانی میڈیکل کالج، کرنول، آندھرا پردیش میں 2001 سے 2006

تک پرنسپل رہ چکے ہیں۔ امید ہے ان کے انتظامی تجربوں اور صلاحیتوں سے اس کالج کو فائدہ ہوگا۔ حکیم فریدالدین کالج کے وائس پرنسپل اور ہاسپٹل سپرنٹنڈنٹ ہیں۔

یہ کالج شیر میسور ٹیپو سلطان (پیدائش 20/ذی الحجہ 1163ھ) کے نام سے منسوب ہے جو مشہور فرمانروا اور علم دوست تھا۔ وہ اپنے والد حیدر علی کی وفات (1782) کے بعد 20/محرم 1196ھ کو 33 سال کی عمر میں سریر آراء سلطنت ہوا۔ تخت نشینی کے بعد اس کا بیشتر وقت کرناٹک اور میسور کے صعوبت آزما میدان کارزار میں گزرا۔ 70 برس کی عمر میں 27/ذی قعدہ 1213ھ کو دارالخلافہ سرنگا پٹنم میں انگریز فوج کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہوا۔ مستقل فوجی مہمات میں مشغول رہنے کے باوجود علوم وفنون سے اس کی دلچسپی میں کمی نہیں آئی۔ تاریخ میں اس کی جانبازی کی طرح علمی دلچسپیوں کے بکثرت واقعات ملتے ہیں۔ سرنگا پٹنم میں اس کی قائم کردہ یونیورسٹی ''جامع العلوم'' اس کے اعلیٰ علمی مذاق کا مظہر ہے۔ اس یونیورسٹی میں طب کی تعلیم کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ طبی شعبہ کے سربراہ اس عہد کے ممتاز طبیب حکیم محمد بیگ تھے۔ سلطان کی تصنیف ''فتح المجاہدین'' کے مقدمہ اور اس کے لکھے مکتوبات سے طب میں اس کی دلچسپی اور مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ اس مضمون سے اس کے خاص لگاؤ کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس کے ذاتی کتب خانہ میں موجود قلمی نوادرات میں مذہبی کتابوں کے بعد سب سے بڑا ذخیرہ کتب طبیہ کا تھا۔[3]

ٹیپو سلطان کے نام سے اس کالج کا انتساب دراصل ایک ایسے علم دوست حکمراں کو خراج تحسین ہے، جسے طب سے بے حد لگاؤ تھا اور اس نے اس کے فروغ کے لئے اپنے عہد میں بڑا اہتمام کیا تھا۔ اس کے نام سے انتساب کے بعد بانیان کالج کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں اور ان کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ منسوب الیہ کے شایان شان کالج کو معیاری صورت عطا کریں۔

حوالہ جات

1۔ یہ تفصیلات متعلقہ کالج کے دفتری ریکارڈ سے ماخوذ ہیں۔

2۔ ایضاً

3۔ جہان طب، جلد 1، شمارہ 1، جون، اگست 1999، ص 15 تا 21، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

اتچ ایم ایس یونانی میڈیکل کالج۔ تمکور

تمکور بنگلور سے تقریباً ستر پچھتر کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس شہر میں کثیر تعداد میں مختلف علوم کے تعلیمی ادارے قائم ہیں۔ یہاں تعلیمی اداروں کے قیام کے سلسلہ میں اتچ ایم ایس سوسائٹی کی مساعی قدر کی مستحق ہیں۔ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام حضرت مدار شاہ کے نام سے موسوم 2002 میں اتچ ایم ایس یونانی میڈیکل کالج کا قیام عمل میں آیا تھا۔

اتچ ایم ایس سوسائٹی کے ذمہ داروں کو امید تھی کہ جلد یہ کالج اپنے وسائل پر جاری رہنے کے لائق ہو جائے گا۔ لیکن ابتدائی نتائج بہت حوصلہ افزا نہیں تھے۔ انتظامیہ کے لئے ذاتی صرفہ سے اس کی کفالت مشکل تھی۔ یہ کالج بند ہونے کے قریب تھا، میڈیکوز ایجوکیشن سوسائٹی نے اسے اپنی تحویل میں لے کر ایک نئی زندگی عطا کی اور اس کی بقا کا سامان کیا۔ ماسٹر الطاف احمد خاں اعظمی، ڈاکٹر محمد آصف خاں اعظمی اور شاہینہ انصاری میڈیکوز ایجوکیشن سوسائٹی کے اہم ذمہ دار ہیں۔ ماسٹر الطاف احمد خاں اعظمی اس کے بانی صدر تھے۔ ابھی چند سال پہلے ان کا انتقال ہوا ہے۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر محمد آصف اعظمی سوسائٹی کے سکریٹری ہیں۔ انھوں نے گلبرگہ سے بی یو ایم ایس کیا ہے، اس وقت ممبئی میں بڑے پیمانے پر پیتھالوجی لیب کا کام کر رہے ہیں۔ ان کی رفیق کار شاہینہ انصاری سوسائٹی کی خازن ہیں۔ وہی کالج کے مالی امور کی نگراں ہیں۔ ڈاکٹر محمد آصف اعظمی بحیثیت سکریٹری انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ وہ جواں سال ہیں اور بڑی لگن کے

آدمی ہیں۔ ممبئی میں قیام کے باوجود پابندی سے تمکور آکر کالج کے انتظامات دیکھتے ہیں۔ مولانا ضیاء الرحمان ندوی کالج کے ڈائرکٹر ہیں۔

حکیم ذاکر حسین وی کالج کے پرنسپل ہیں اور روز قیام سے ہی وہ اس منصب پر فائز ہیں۔ وہ نظامیہ طبیہ کالج حیدر آباد کے فارغ التحصیل ہیں۔ یہاں پرنسپلی کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے وہ بیجاپور اور گلبرگہ کے طبیہ کالج میں بحیثیت پرنسپل خدمت انجام دے چکے ہیں۔

یہ کالج راجیو گاندھی یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز کرناٹک، بنگلور سے ملحق ہے۔ 2002 سے یہاں گریجویشن سطح کی تعلیم ہو رہی ہے۔ 2007 میں بیس طلبہ پر مشتمل پہلا بیچ فارغ ہوا تھا۔ ابھی یہ ارتقائی مرحلہ میں ہے، اسے مستحکم صورت اختیار کرنے میں وقت لگے گا، لیکن نئی انتظامیہ جس لگن سے کام کر رہی ہے، اس سے توقع ہے کہ مستقبل میں یہ طبی تعلیم کا ایک اچھا ادارہ ثابت ہوگا۔ اس وقت جو اساتذہ یہاں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں، گرچہ ان کی تعداد سی سی آئی ایم کے مطلوبہ تقاضوں سے کم ہے لیکن یہاں مامور اکثر اساتذہ ایم ڈی اور باصلاحیت ہیں۔ حکیم ایس ایم مختار احمد، حکیم عابد علی انصاری، حکیم ایم جے شعیب احمد، حکیم جمال اللہ باشا، حکیم مشہود الرحمان اور طبیبہ نرگس جہاں وغیرہ نے کالج میں تعلیمی ماحول پیدا کرنے میں اچھی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

باہر سے آنے والے طلبہ اور طالبات کے لئے ہوسٹل کا نظم ہے۔ انہیں مناسب فیس پر قیام وطعام کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ اس کالج میں طلبہ کی ذہنی اور فکری تربیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن۔ بنگلور

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن (NIUM) بنگلور، اعلیٰ طبی تعلیم کا قومی سطح کا ادارہ ہے۔ آزادی کے بعد جب مختلف دیسی امور کے احیاء کا سلسلہ شروع ہوا تو دیسی طبوں کے لئے بھی آواز اٹھنے لگی۔ اس سلسلہ میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، مسلسل اربابِ حکومت کی توجہ، طبی مسائل اور ان کے حل کی طرف مبذول کراتی رہی۔ اس کے مطالبات میں اعلیٰ تعلیم کے ایک ادارہ کے قیام کا موضوع بھی رہا ہے۔ اس کی پیہم جدوجہد کے نتیجہ میں مرکزی حکومت نے 1984 میں شعبۂ آیوش، وزارت صحت و خاندانی بہبود کے تحت یونانی طب کے نیشنل انسٹی ٹیوٹ کی تجویز منظور کی۔ اس کے لئے جگہ کے تعین کو لے کر برسوں غور وفکر کا سلسلہ رہا۔ حیدرآباد، دلی، سری نگر اور علی گڑھ کی تجاویز سامنے آئیں۔ بالآخر یہ قرعہ بنگلور کے نام نکلا۔ کرناٹک کے وزیر صحت عبدالصمد نے مجوزہ انسٹی ٹیوٹ کے لئے بنگلور میں زمین فراہم کر کے قیام کے سلسلے کا ایک اہم مسئلہ حل کر دیا۔ کرناٹک گورنمنٹ سے زمین کے حصول کے سلسلے میں حکیم عبدالرزاق (سابق ڈائرکٹر سی سی آر یو ایم، نئی دہلی) کی مساعی بہت اہم ہیں۔ 8/نومبر 1995 کو یونین ہیلتھ منسٹر عبدالرحمٰن انتولے نے بنگلور میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقع پر صوبہ کے وزیر اعلیٰ ایچ ڈی دیوگوڑا اور ان کی کابینہ کے وزراء اے بی پاٹل اور پی ایس گھاٹور بھی موجود تھے۔ تعمیرات کا پہلا مرحلہ پورا ہونے کے بعد 20/دسمبر 2003 کو سشما سوراج مرکزی وزیر صحت و

خاندانی بہبود کے ذریعہ اس کا باضابطہ افتتاح عمل میں آیا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ راجیو گاندھی یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز کرناٹک، بنگلور سے ملحق ہے۔ یہاں 5-2004 سے سی سی آئی ایم کے ضابطوں کے مطابق تعلیمی عمل شروع ہوا۔ پہلے مرحلہ میں چار شعبوں علم الادویہ، معالجات، امراض نسواں و قبالت اور تحفظی و سماجی طب میں ایم ڈی کے داخلے ہوئے۔ اس کے بعد 2009 میں علم الصیدلہ اور 2012 میں کلیات میں داخلے ہوئے۔ 2014 سے علاج بالتدبیر اور جراحت میں بھی ایم ڈی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ابتدائی دو سالوں تک امراض نسواں و قبالت کے داخلے، ایم ڈی گائنی اینڈ آبس کے نام سے ہوئے پھر 2006 میں یہ نام بدل کر ایم ایس گائنی اینڈ آبس کردیا گیا۔

وسائل کے اعتبار سے یہ ادارہ بے حد متمول ہے۔ یہاں وہ تمام اسباب فراہم ہیں جو کسی اعلیٰ تعلیمی ادارہ کے لئے مطلوب ہوتے ہیں۔ اگر انہیں بروئے کار لانے والے مناسب لوگ مل جائیں تو اس ادارہ میں بہت آگے جانے کی صلاحیت ہے۔ لیکن افرادی وسائل کی کمی، ان سے استفادہ کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ اس وقت یونانی طب کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس لئے امید کی جاتی ہے کہ یہاں ہر مضمون کے تجربہ کار اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل افراد ہوں گے، لیکن اب تک ایسا نہیں ہوسکا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ریڈر اور پروفیسر کے عہدوں پر منتخب ہونے والے اساتذہ، جن سے کسی ادارہ کا معیار طے پاتا ہے، وہ زیادہ تر پرائیویٹ کالجوں سے آرہے ہیں، جو پوسٹ گریجویٹ سطح کے تدریسی تجربہ اور ریسرچ کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔ اس ادارہ کو مناسب افراد نہ مل پانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ شمالی ہندوستان، جو طب کا اصل مرکز سمجھا جاتا ہے، اس علاقہ کے اچھے اداروں کے اساتذہ یہاں آنے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ علاقائی عصبیت، لسانی اجنبیت اور تہذیبی مغایرت جیسے کئی موانع یہاں ان کی آمد میں رکاوٹ ہیں، جو آبھی جاتے ہیں، وہ یہاں کے سماجی ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتے۔ انسٹی ٹیوٹ کے پہلے ڈائرکٹر پروفیسر محمد ملک وامق امین، جو اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ سے آئے تھے، وہ ان حالات سے اس قدر بدظن ہوئے کہ انھوں نے چند ہی مہینوں میں مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ان کے بعد پروفیسر ایم اے جعفری (استاذ جامعہ ہمدرد) نے 21/مارچ 2005 کو بحیثیت ڈائرکٹر چارج سنبھالا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی بیشتر ترقیات انہی کی

ڈائرکٹرشپ میں انجام پائی ہیں۔ 19/جون 2012 کو ان کی میقات مکمل ہونے کے بعد پروفیسر منصور احمد صدیقی ڈائرکٹر منتخب ہوئے ہیں۔

اب تک یہاں صرف آٹھ شعبوں میں پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم شروع ہوسکی ہے۔ ابھی چھ شعبوں میں یہ عمل باقی ہے۔ اس لئے ترجیحی طور پر اس کا بندوبست ہونا چاہئے۔ انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہونے والے بعض تعارفی لٹریچروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کچھ سرٹیفکٹ اور شارٹ ٹرم کورسز شروع کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں۔ اس قسم کے منصوبوں کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن ان چھوٹے پروگراموں سے نیشنل انسٹی ٹیوٹ کے بڑے منصوبے التواء میں پڑسکتے ہیں۔ اس لئے ابھی اس طرح کے منصوبوں سے صرف نظر کیا جانا چاہئے۔ یوں بھی اس قسم کے کورسز وہ ادارے بھی کرواسکتے ہیں جہاں انڈر گریجویٹ سطح کی تعلیم ہورہی ہے، لہٰذا نیشنل انسٹی ٹیوٹ کو اعلیٰ تعلیم ہی کو اپنا دائرہ عمل بنانا چاہئے اور ایم ڈی سے آگے پی ایچ ڈی جیسے کورسز کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ اس لئے کہ اسے طبی دنیا میں اعلیٰ اور معیاری تعلیم کے ذریعہ قائدانہ کردار ادا کرنے اور رول ماڈل پیش کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ موجودہ ڈائرکٹر کی یہ کاوش لائق ستائش ہے کہ انہوں نے اس پہلو پر غور کرنا شروع کردیا ہے، اس سلسلے میں ان کی سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ یہاں شعبۂ معالجات (2015) اور علم الادویہ (2016) میں پی ایچ ڈی کا آغاز ہوچکا ہے۔

2012 میں جرنل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن (انگریزی) اور 2014 میں ترجمان طب (اردو) کا اجراء بھی موجودہ ڈائرکٹر کی مستحسن مساعی میں سے ہیں۔ ان دونوں تحقیقی جریدوں کو معیاری شکل عطا کرنے اور پابندی سے ان کی اشاعت کو یقینی کے لئے ضروری ہے کہ اس کام کو ایک اضافی عمل کے طور پر انجام دینے کے بجائے، منظم صورت میں کیا جائے۔ ان کے لئے ایک علاحدہ شعبہ قائم کیا جائے، جہاں مدیران اور دوسرے معاون عملے کو صرف اسی کام کے لئے مختص کیا جائے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن جیسے بڑے ادارے کے لئے اس کا نظم اور بندوبست بہت آسان ہے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ سے طبی دنیا کو بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس سے توقع کی جاتی ہے

کہ یہ اعلیٰ تعلیمی معیار کے ساتھ دوسرے متعلقہ معاملات میں بھی کلیدی کردار ادا کرے۔ یونانی طب میں پی جی سطح کی تعلیم گزشتہ چار دہائیوں سے ہو رہی ہے لیکن اب تک اس معیار کا کوئی لٹریچر تیار نہیں کیا جاسکا ہے۔ اساتذہ وطلبہ درس وتدریس کی ضرورتیں کیسے پوری کرتے ہیں اور آئندہ اس کی کیا شکل ہوگی، اس مسئلہ پر سوچنے کی ضرورت ہے، طبی لٹریچر سے جڑے اس قسم کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں جو غور طلب ہیں، ان میں تحقیق کا معاملہ سرفہرست ہے۔ اس سلسلے میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اسے ایک ایسے شعبہ کے قیام پر غور کرنا ہوگا جہاں یونانی طب کے کلاسیکل لٹریچر پر ریسرچ کے ذریعہ اسے تعلیم وتحقیق کی نوع بہ نوع ضرورتوں کے اعتبار سے لائق استفادہ بنانے کا کام انجام پائے، مزید برآں اس ادارہ کی حیثیت یونانی طب کے لٹریری ریسرچ کے ریفرل سنٹر کی ہو جس کے پاس طبی لٹریچر سے متعلق ہر مسئلہ کا حل موجود ہو۔ اس قسم کے ہمہ جہت منصوبوں سے نیشنل انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی کا دائرہ وسیع ہوگا اور دنیائے طب کے سامنے اس کا اعلیٰ وقائدانہ کردار سامنے آئے گا۔

مدرسہ آصفیہ طبیہ۔ بھوپال

ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں بھوپال پہلی ریاست ہے، جس نے باضابطہ یونانی طب کی سرپرستی کی اور اس کے فروغ کے لئے اہتمامات کیے۔ والیانِ ریاست کی طب نوازی کی وجہ سے یہاں اس فن کا بڑا شاندار ماضی رہا ہے۔ انضمام سے پہلے بھوپال میں یونانی طب کی صورت حال کا اندازہ حکیم سید ضیاء الحق کے اس بیان سے ہوتا ہے:

"ریاست حیدر آباد دکن میں طب کو جس شاندار طریقہ سے نوازا جارہا ہے اور اس کے عظمت و وقار کو جس شاہانہ مکرمت اور دستگیری کے ساتھ روز افزوں ترقی دی جارہی ہے وہ ایسی چیز ہے جس کے لیے ہمارے دل خسرو دکن اور ان کی حکومت کے لیے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے۔ طب قدیم کا دوسرا ملجا و ماویٰ سنٹرل انڈیا کی وہ مہذب اور عظیم الشان ریاست ہے، جو بھوپال کے نام سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے کرۂ ارض پر اپنی معارف پروری کے لحاظ سے ایک منور ستارہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ریاست کے روشن دماغ فرمانرواؤں نے طب قدیم کی تہذیب و ترقی پر شاہانہ توجہات مبذول رکھی ہیں اور اسے باقاعدہ ایک نظام کی حیثیت سے ہمیشہ اپنے حدود مملکت میں جاری رکھا ہے، اسی انفاق فی العلم کا نتیجہ

ہے کہ آج ریاست بھوپال میں دیسی طبّی شفاخانوں کا ایک وسیع نظام موجود ہے۔ ہر قصبہ میں ایک شفاخانہ ہے، جس میں مقامی ضروریات کے اعتبار سے ہر قسم کا سامان اور ادویہ موجود رہتی ہیں اور ہر ایسے شفاخانہ کی نگرانی ایک سند یافتہ اور تجربہ کار طبیب کے سپرد ہے، پھر بیرون جات کے تمام شفاخانوں نے ایک محکمہ کی شکل اختیار کرلی ہے، جو مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی قیادت و حمایت کے لیے ایک افسر الاطباء مامور ہے"۔ [1]

اس ریاست کے فرمانرواؤں نے جس طرح یونانی طب کی سرپرستی کی ہے، اس سے طب کے تئیں ان کی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے، ان کے اس لگاؤ کی وجہ سے یہاں محض روایتی طور پر اس کا رواج نہیں رہا بلکہ پوری ریاست میں جابجا سرکاری شفاخانے قائم تھے اور ان کی نگرانی اور نظم و نسق کے لیے محکمۂ صحت کا باضابطہ ایک شعبہ موجود تھا۔ نواب سکندر بیگم نے اپنے عہد حکومت میں شفاخانوں کی ترقی اور صحت عامہ سے متعلق 10 محرم 1280ھ / 29 جون 1863 کو ایک قانون جاری کیا، جس میں افسر الاطباء کے اختیارات، طبیبوں کے فرائض اور دواسازی سے متعلق احکام تھے، ان کے زمانۂ حکومت میں باقاعدہ ادویہ کے ٹھیکہ دار مقرر کیے گئے، ہر محلہ میں آبادی کے لحاظ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی دکانیں قائم کی گئیں، دواء فروشوں کا امتحان لے کر انہیں لائسنس دیا گیا اور ادویہ کے لیے ایک ایک کانٹھ اور پیمانہ رکھنا لازمی قرار دیا گیا، ظروف ادویہ سے متعلق دواء فروش خاص طور پر پابند کیے گئے کہ وہ دوائیں چینی اور شیشے کے برتن میں رکھیں۔ ناقص دواؤں کے اتلاف اور سمیات کی حفاظت سے متعلق خاص ہدایتیں کی گئیں اور ان کی خلاف ورزی پر قید و جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی، اس دستور العمل کی رو سے عرق و شربت کے لیے دکاندار پابند کیے گئے کہ وہ برہمنوں کے ذریعہ تیار کیے جائیں اور ہندو دواء فروش انہیں فروخت کیا کریں، ان کے استعمال کے پانی، برتن، بوتلیں اور مکان وغیرہ علاحدہ ہوں، اس میں جو پانی صرف ہو وہ کہار لایا کریں۔ [2]

ریاست بھوپال میں صیغۂ طبابت کا جس قدر چست نظام تھا اس کی مثال ہندوستان میں

کہیں اور نہیں ملتی۔ ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ریاست میں نہ صرف صحت سے متعلق ایک ترقی یافتہ نظام تھا، بلکہ یہاں کے فرمانرواؤں میں بے حد مذہبی رواداری بھی تھی اور انہیں عوام کے مذہبی جذبات کا غیر معمولی خیال تھا۔ مذہبی جذبات کے اس قدر پاس ولحاظ کی مثال تو موجودہ عہد کے قانون میں بھی نظر نہیں آتی جبکہ اس وقت اس کی زیادہ ضرورت ہے۔

والیان بھوپال کی طب نوازی، علمی قدر افزائی اور معارف پروری کی وجہ سے شمالی ہند کے اطباء بڑی تعداد میں ان سے منسلک ہوئے، ان طبیبوں میں حکیم محمد اعظم خاں، حکیم ڈون ڈسلوا، حکیم عبدالقادر، حکیم سید عبدالحمید، حکیم سید نورالحسن، حکیم سید ضیاء الحسن اور حکیم کوثر چاند پوری کے اسماء بطور خاص قابل ذکر ہیں، ان سب کا شمار اپنے عہد کے مشاہیر میں ہے، ان سبھی کا تعلق شمالی ہند سے ہے، مگر بھوپال سے ان کی وابستگی کی وجہ سے یہ ریاست بھی طب کا مرکز بن گئی۔

ریاست کے حکمرانوں کی طب سے غیر معمولی دلچسپی کی وجہ سے یہاں اسے ہمہ جہت ترقی کے مواقع ملے اور ایک ایسے عہد میں جب ہندوستان کے بیشتر حصوں میں یونانی طب عبوری دور سے گزر رہی تھی اور اپنے وجود و بقا کے لیے جدوجہد کر رہی تھی، ریاستی سرپرستی کی وجہ سے اس کو بڑا سہارا ملا۔ اس ریاست کے سبھی حکمرانوں نے اپنے عہد میں یونانی طب کی سرپرستی کی اور اس کی ترقی و بہبود کے لیے کوششیں کیں۔ تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حکمرانوں کو طب کی اصلاح اور اس کے نقائص کے ازالہ کی بے حد فکر تھی، وہ محسوس کر رہے تھے کہ اب نئے حالات میں یہ طب روایتی انداز میں باقی نہیں رہ سکتی لہٰذا وہ اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے فکر مند تھے، نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں:

> ''نواب احتشام الملک عالی جاہ کو چونکہ طب اور ڈاکٹری سے خاص طور پر دلچسپی تھی، وہ ہمیشہ ان کے نقائص کا ذکر کرتے اور افسوس کرتے اور ان کی اصلاح کی ان کو بڑی فکر تھی، لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی، وہ یونانی طب کی ترقی کے لیے کوئی کام نہ کر پائے''۔[3]

ریاست کے فرمانرواؤں میں نواب سلطان جہاں بیگم یونانی طب کی بڑی حامی تھیں، ان کی حمایت اور سرپرستی سے اس طب کو بڑا فائدہ پہنچا، ان کی ذات سے نہ صرف بھوپال میں قائم

صیغۂ طبابت کو ترقی ملی بلکہ ریاست کے باہر دوسرے طبی اداروں کو بھی انہوں نے اپنا تعاون پیش کیا، دلی کے آیورویدک و یونانی طبی کالج کی تعمیر کے لیے بیگم نے پچیس ہزار کا گراں قدر عطیہ پیش کرنے کے علاوہ اٹھارہ سو روپے کی سالانہ گرانٹ جاری کی تھی، اس مالی تعاون کے علاوہ انہوں نے اس کالج کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت فرما کر اسے اخلاقی تعاون بھی پیش کیا تھا۔ یونانی طب کے دوسرے اداروں کو تعاون دینے کے علاوہ بیگم سلطان جہاں نے اپنی ریاست میں اس کی اصلاح و ترقی کے لیے جو اقدامات کیے وہ طب کے حوالہ سے بڑی خدمت سمجھے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں مدرسہ آصفیہ طبیہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے، اس طبی اسکول کے قیام سے نہ صرف ریاست کے صحتی معاملات میں بہتری آئی بلکہ اس سے طب کی تعلیمی تحریک کو کافی تعاون ملا۔ اس مدرسہ میں تعلیمی سلسلہ جاری ہونے کے بعد ریاست کے شفاخانوں کو تربیت یافتہ اطباء ملنے لگے، لائق طبیبوں کی فراہمی کا مسئلہ حل ہونے کے بعد ریاست کے مفصلات میں شفاخانوں کے قیام میں آنے والی رکاوٹیں بہت حد تک دور ہوگئیں، اس کے بعد ریاست کے دور دراز علاقوں میں شفا خانے قائم کر کے وہاں طبیبوں کو مامور کیا گیا، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ریاست میں طبی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ یہاں کے فارغ التحصیل یونانی طلبہ کو روزگار کے مواقع بھی فراہم ہوئے۔ 4

مدرسہ آصفیہ طبیہ کے قیام سے پہلے یہاں یونانی طب، مدرسوں کے نصاب کا جزوی حصہ تھی اور تشخیص و تجویز کی عملی مشق کا ذریعہ اطباء کے مطب تھے۔ طب جیسے اہم مضمون کی تعلیم کے لیے یہ طریقے اب وقت کے لحاظ سے فرسودہ ہو چکے تھے۔ اگرچہ ہندوستان کے کچھ حصوں میں طب کی باقاعدہ تعلیم کے لیے دو ایک درسگاہیں قائم ہو چکی تھیں۔ مگر اتنی بڑی تعلیمی ضرورت کی پابجائی ان چند اداروں سے ممکن نہ تھی ایسی حالت میں بیگم سلطان جہاں نے طبی تعلیم کی اہمیت اور اس کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے سرکاری اہتمام میں اپنی مرحوم صاحبزادی آصف جہاں بیگم کے نام پر، جن کا محض چودہ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا تھا، مدرسہ آصفیہ طبیہ کی تاسیس کی۔ بیگم سلطان جہاں اس طبی اسکول کے اغراض و مقاصد اور اس کے قیام کے محرکات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"صاحبزادی آصف جہاں بیگم کی دردناک موت کے بعد مجھ کو خیال تھا

کہ میں ان کی کوئی دائمی اور مفید یادگار قائم کروں تاکہ ان کا نام ہمیشہ محبت کے ساتھ لیا جائے، میں نے اس یادگار کے لیے مختلف تجویزیں سوچیں بالآخران کے شدائد اور تکلیفات مرض پر نواب صاحب مرحوم کے ارادہ کا خیال کر کے میری رائے یہ قرار پائی کہ ایک مدرسہ قائم کیا جائے، جس میں یونانی طب کے شائقین تعلیم حاصل کریں اور اس میں سرجری کی بھی ایک شاخ ہو اور اطباء محالات کے لیے وہاں کی تعلیم لازمی کردی جائے''۔[5]

11/ جمادی الاخریٰ 1321ھ/ 1903 بروز جمعہ پانچ بجے شام مدرسہ کی افتتاحی تقریب کا انعقاد ہوا، نواب محمد نصر اللہ خاں نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی۔ اس موقع پر ریاست کے افسر الاطباء حکیم سید محمد نور الحسن نے ایڈرس پیش کیا، جس میں انہوں نے یونانی طب کی افادیت، جراحت سے موجودہ اطباء کی لاتعلقی، نواب احتشام الملک عالی جاہ کی یونانی طب سے خاص دلچسپی اور مدرسہ آصفیہ طبیہ کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی تھی اور اس منصوبہ کا اظہار کیا تھا کہ یہاں یونانی کے ساتھ جدید طب کے مضامین کی بھی تعلیم ہوگی۔ حکیم سید محمد نور الحسن نے اپنے ایڈرس میں اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس مدرسہ میں ڈاکٹری اور یونانی دونوں فنون کی اچھی طرح تعلیم ہوگی اور ان طبوں کے درمیان مختلف فیہ مسائل پر محاکمہ اور مباحثہ کے ذریعہ بہتر نتائج تک پہونچنے کے امکانات تلاشے جائیں گے اور یہاں کے فارغین کو یونانی اور جدید طب دونوں طریقہ ہائے علاج میں مہارت حاصل ہوگی۔[6]

مدرسہ طبیہ کے قیام کے وقت حکیم سید محمد نور الحسن افسر الاطباء تھے، جو ایک ریاستی سطح کا عہدہ تھا، افسر الاطباء پوری ریاست کے طبی امور کا نگراں ہوتا تھا، مدرسہ طبیہ کی نگرانی بھی اسی کے ذمہ تھی، حکیم سید محمد نور الحسن کے بعد حکیم عبد القادر افسر الاطباء مقرر ہوئے، ان دونوں نے حاذق الملک حکیم عبد المجید دہلوی سے تعلیم پائی تھی۔ حکیم عبد القادر کے بعد حکیم سید ضیاء الحسن اس عہدہ پر فائز ہوئے، وہ حکیم اجمل خاں کے تلامذہ میں تھے اور ان کے مدرسہ سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ریاست کے یہ تینوں افسر الاطباء دلی اسکول کے پروردہ تھے، چونکہ یہی مدرسہ آصفیہ طبیہ کے نگراں

تھے، اس لیے اس پر دلی اسکول کے اثرات بہت نمایاں تھے۔

مدرسہ آصفیہ میں چار سالہ نصاب رائج تھا، یہاں یونانی مضامین کی تعلیم کے لیے تجربہ کار اطباء اور جدید مضامین کی تدریس کے لیے ڈاکٹر اساتذہ مامور تھے۔ حکیم سید ضیاء الحسن، حکیم محمد حسن، حکیم محمد اسماعیل، ڈاکٹر حکیم الدین، حکیم سید عبدالحمید، حکیم عبدالقادر وغیرہ نے یہاں پرنسپل شپ کے فرائض انجام دیے۔ حکیم سلطان محمود، حکیم صولت رسول، حکیم عبدالقیوم، حکیم صغیر الحسن، حکیم مختار صدیقی، ڈاکٹر عادل محمد خاں، حکیم علی کوثر چاند پوری، حکیم شریف حسین، حکیم محمد ابراہیم، حکیم محمد غوث وغیرہ کا نام یہاں کے اساتذہ میں ملتا ہے۔ ان میں سے اکثر اسی مدرسہ کے فارغ تھے۔ 7

مدرسہ آصفیہ کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ سرکاری اہتمام میں قائم ہونے والا یہ یونانی طب کا پہلا ادارہ تھا، بیگم سلطان جہاں نے اس کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری اپنے تینوں بیٹوں نواب محمد نصر اللہ خاں بہادر ولی عہد ریاست بھوپال، نواب محمد عبید اللہ خاں بہادر، اور صاحبزادہ محمد حمید اللہ خاں بہادر کے سپرد کی تھی۔ اس کالج سے متعلق بیگم کے منصوبہ کو عملی جامہ عطا کرنے میں حکیم سید محمد نور الحسن کا کردار بے حد اہم رہا ہے اور اسے ترقی عطا کرنے میں ان کے بیٹے حکیم سید ضیاء الحسن نے بڑا کلیدی کردار ادا کیا ہے، انہی کی مساعی سے مدرسہ آصفیہ طبیہ نے اسکول کی سطح سے ترقی کر کے 1927 میں کالج کا مرتبہ حاصل کیا تھا۔

مدرسہ طبیہ کی شاخ کے طور پر مفرد اور مرکب دواؤں کے لیے ایک دوا خانہ بھی قائم کیا گیا تھا تاکہ اصلی اور خالص ادویہ کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے اور مریضوں کو مناسب دام پر صحیح دوائیں مل سکیں، اس دواخانہ کے لیے یہ تجویز طے پائی تھی کہ ریاست کی طرف سے دواخانہ کھولنے والے شخص کو رفاہ عام کی مد سے ایک ہزار روپے دیے جائیں، اس میں وہ مزید سرمایہ لگا کر دکان کھولے اور اس کی نگرانی افسر الاطباء اور میر مجلس جماعت انتظامیہ کے ذمہ ہو، حسب تجویز دواخانہ قائم ہوا، اس کے قیام کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مریضوں کو مناسب دام پر صحیح دوائیں ملنے لگیں، ایک فائدہ اور ہوا کہ دوسرے دوا فروش بھی مناسب داموں پر عمدہ دوائیں فروخت کرنے لگے۔ حالانکہ ریاست میں سکندر جہاں کے عہد ہی سے عمدہ ادویہ کی تجارت کو یقینی بنانے، خراب، ناقص دواؤں کی روک تھام کے لیے تعزیری قوانین موجود تھے پھر بھی عطاروں کے بارے میں

شکایتیں موصول ہو رہی تھیں، مگر مدرسہ سے ملحق سرکاری اہتمام میں دواخانہ کے قیام کے بعد یہاں کے عطاری نظام میں بڑا سدھار آیا۔[8]

بھوپال ریاست کے اندر یونانی طب اور ڈاکٹری، دونوں کے علاحدہ صیغے قائم تھے، یونانی شفاخانوں اور آصفیہ طبیہ کالج کی نگرانی افسر الاطباء کے ذمہ تھی اور ڈاکٹری محکمہ کا سربراہ چیف میڈیکل آفیسر ہوتا تھا۔ بیگمات کے زمانہ تک دونوں طبوں کو مساوی حقوق حاصل تھے، مگر ان کے بعد صورت حال کافی بدل گئی اور چیف میڈیکل آفیسر، ریاست کے پورے صحتی نظام پر حاوی ہو گیا۔ حالات کی اس تبدیلی نے یہاں یونانی طریقۂ علاج کو دوسرے درجہ کی چیز بنا دیا، جب ڈاکٹر کرنل رحمٰن چیف میڈیکل آفیسر ہوئے تو ان کے زمانہ میں حالات اس قدر خراب ہوئے کہ ریاست میں یونانی طب کے وجود پر سوالات کھڑے ہو گئے، ڈاکٹر کرنل نے ایک اسکیم مرتب کر کے ریاست کے ذمہ داروں کو پیش کی، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ریاست کے دیسی شفاخانے افسر الاطباء کے بجائے چیف میڈیکل آفیسر کے ماتحت ہوں، شہر بھوپال کے تمام یونانی اطباء مفصلات میں بھیج دیئے جائیں، آصفیہ طبیہ کالج کو بند کر دیا جائے اور ریاست کے تمام یونانی شفاخانوں کو ختم کر کے صرف اڑتالیس شفاخانوں کو باقی رکھا جائے اور ان میں صرف وہ اطباء ملازم رکھے جائیں جو علی گڑھ، بنارس اور دلی کے فارغ التحصیل ہیں۔ ڈاکٹر کرنل کے اس ناپاک منصوبہ کا اصل ہدف آصفیہ طبیہ کالج تھا، جب اس واقعہ کی اطلاع ہندوستان کے طبی حلقے کو ہوئی تو کرنل کی اس تجویز کی پرزور مخالفت کی گئی۔ طبی تنظیموں کی طرف سے ریاست کے فرمانروا کو عرضداشت پیش کر کے، ان سے کرنل کے اس منصوبہ پر عمل درآمد سے باز رہنے کی درخواست کی گئی، طبی رسائل و جرائد نے اس کے خلاف اداریے تحریر کیے،[9] ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ آصفیہ طبیہ کالج کے خلاف اٹھنے والی آندھی کچھ دیر کے لیے تھم گئی، مگر 30/ اپریل 1949 کو نواب حمید اللہ خاں اور حکومت ہند کے درمیان ایک تحریری معاہدہ ہوا، اس کی رو سے بھوپال ریاست ہندوستان میں ضم ہو گئی۔ اس معاہدہ کے بعد یکم جون 1949 کو حکومت ہند نے بھوپال کا انتظام وانصرام اپنے ہاتھ میں لے کر یہاں چیف کمشنر مقرر کر دیا، ریاست کے انضمام کے بعد آصفیہ طبیہ کالج سرپرستی سے محروم ہو کر ہمیشہ کے لیے

بند ہو گیا۔ آزاد ہندوستان میں یونانی طب کے اس کالج کا بند ہو جانا نہایت افسوسناک واقعہ تھا، ہندوستان کی آزادی کے بعد یہ توقع تھی کہ اب دیسی طبوں کو ترقی کے آزادانہ مواقع ملیں گے، مگر یہاں صورت حال اس کے برعکس تھی۔

ذیل میں مدرسہ آصفیہ کے پراسپکٹس سے کچھ اہم اقتباسات درج کئے جا رہے ہیں، یہ پراسپکٹس 1927 کے داخلہ کے لئے شائع ہوا تھا۔ پراسپکٹس کے ان اقتباسات سے مدرسہ آصفیہ کے انتظام وانصرام اور نصاب تعلیم وغیرہ کے بارے میں اہم معلومات سامنے آتی ہیں:

- افسر الاطباء ریاست بھوپال، مدرسہ طبیہ آصفیہ کے ناظم ہوں گے، اس کے جملہ انتظامات کی نگرانی ان کے ذمہ ہوگی۔
- اس کا اسٹاف، منصرم مدرسہ، صدر مدرس، مدرس دوم، مدرس سوم، فرسٹ ٹیچر آف ڈاکٹری اور سکنڈ ٹیچر آف ڈاکٹری پر مشتمل ہوگا۔
- ایڈوائزری کمیٹی کے صدر، ناظم مدرسہ ہوں گے، اس کے ممبران میں مدرسہ کے اسٹاف کے علاوہ قاضی ریاست، اسسٹنٹ سرجن اور سکریٹری منصرم مدرسہ شامل ہوں گے۔

نصاب تعلیم:

- طب کی تعلیم عربی یا فارسی زبان میں اور ڈاکٹری کی تعلیم صرف اردو میں دی جائے گی۔
- طب کی تعلیم کے ساتھ ڈاکٹری تعلیم لازمی ہوگی۔
- مدت تعلیم چار جماعتوں پر منقسم ہوگی۔

نصاب طب بزبان عربی:

جماعت ادنیٰ	:	قانونچہ، موجز القانون تمام، کلیات اقصرائی (سال اول)
جماعت اوسط اولیٰ	:	شرح اسباب جلد دوم، معالجات سدیدی (سال دوم)، (سال سوم)
جماعت اوسط ثانیہ	:	شرح اسباب جلد اول، کلیات نفیسی، افعال وخواص ادویہ مفردہ ومرکبہ (سال سوم)
جماعت اعلیٰ	:	حمیات قانون تمام، کلیات قانون تمام، مطب (سال چہارم)

نصاب طب بزبان فارسی:

جماعت ادنیٰ : میزان الطب تکشیف الحکمت مخازن التعلیم (سال اول)

جماعت اوسط اولیٰ : طب اکبر جلد دوم، کفایۂ منصوری (سال دوم)

جماعت اوسط ثانیہ : طب اکبر جلد اول، دستور العلاج، ادویہ مفردہ و مرکبہ مع افعال و خواص (سال سوم)

جماعت اعلیٰ : مفرح القلوب، قانون علاج، علم الابدان، مطب (سال چہارم)

نوٹ: جماعت ہائے اعلیٰ وادنیٰ کے لئے دارالشفاء یونانی صدر میں پابندی سے حاضری ضروری تھی۔

نصاب ڈاکٹری بزبان اردو

جماعت ادنیٰ :- ہیومن اناٹومی تاوسرا، میٹریا میڈیکا، اِن آرگینک، فاریسی مکمل (سال اول)

جماعت اوسط اولیٰ :- ہیومن اناٹومی مکمل، میٹریا میڈیکا، آرگینک (سال دوم) فاریسی کی تعلیم کے لئے ہاسپٹل پرنس آف ویلز جانا ضروری تھا۔

جماعت اوسط ثانیہ :- پرنسپل آف میڈیسن، پریکٹس آف میڈیسن (سال سوم)

جماعت اعلیٰ :- پرنسپل آف سرجری، پریکٹس آف سرجری، مطب (سال چہارم)

جماعت اعلیٰ کے طلبہ کے لیے ہاسپٹل پرنس آف ویلز میں حاضری ضروری تھی، نیز ان کے لئے ایمبولینس ایسوسی ایشن کورس بھی مکمل کرنا ضروری تھا۔

مدرسہ آصفیہ میں غریب طلبہ کے لیے امدادی وظیفہ کا انتظام تھا۔ امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والے طالب علموں کو امتیازی وظیفہ دیا جاتا تھا، دارالاقامہ میں رہائش کے لئے کوئی فیس نہیں تھی، غریب طلباء کے کھانے کی فیس بھی معاف تھی۔ [10]

1903 سے 1949 آصفیہ طبیہ کالج نے یونانی طب کے احیاء اور نشرواشاعت میں جو خدمت انجام دی ہے، وہ برطانوی ہندوستان کی طبی تاریخ کا نہایت قابل ذکر واقعہ ہے۔ گرچہ انضمام ریاست کے بعد یہاں جاری تعلیمی سلسلہ موقوف ہوگیا، لیکن یہ اپنے پیچھے طبی تعلیم کی

ضرورت واہمیت کا ایک احساس بہر کیف چھوڑ گیا، یہ بھی اس کالج کا ایک اہم افادی پہلو ہے۔

حوالہ جات

1۔ خطبہ صدارت، حکیم سید ضیاء الحسن بموقع اجلاس پنجاب پراونشل طبی کانفرنس منعقدہ دوسوہہ ضلع ہشیار پور، بتاریخ 5-3 نومبر 1944، مطبوعہ بھوپال پریس، بھوپال، ص 11

2۔ حیات سکندری، دفتر تاریخ بھوپال، مطبع شمسی آگرہ، 1918، ص 19-218

3۔ گوہر اقبال حصہ اول مرتبہ نواب سلطان جہاں بیگم، مطبع سلطانی، 1913، ص 157

4۔ حیات سلطانی، مرتبہ محمد امین زبیری، مطبوعہ عزیزی پریس، آگرہ، 1939، ص 67 اور 142

5۔ گوہر اقبال حصہ اول مرتبہ نواب سلطان جہاں بیگم، مطبع سلطانی، 1913، ص 58-157

6۔ ایضاً، ص 160

7۔ نقوش بھوپال مرتبہ ڈاکٹر رضیہ حامد و رفعت سلطانہ (بحوالہ جنید صدیقی ''بھوپال کا آصفیہ طبیہ کالج'')، باب العلم پبلی کیشنز، 1996، ص 85-484

8۔ گوہر اقبال حصہ اول، مرتبہ نواب سلطان جہاں بیگم، مطبع سلطانی، 1913، ص 163

9۔ الطبیب، لاہور، جلد 6، شمارہ 9، ستمبر 1939، ص 5، 7 اور 43

10۔ حامی الصحت لاہور، جلد 5، شمارہ 3-2، دسمبر، جنوری 26-1925، ص 7-5

سیفیہ حمیدیہ یونانی طبیہ کالج ۔ برہان پور

صوبہ مدھیہ پردیش کا برہان پور شہر صدیوں سے علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ پیر طریقت برہان الدین غریب کے نام منسوب اس شہر نے تاریخ کے کئی ادوار دیکھے ہیں۔ آج بھی کئی ایسے شکستہ آثار ہیں، جن سے اس کے شاندار ماضی کا پتہ چلتا ہے۔ دیگر بہت سے آثار مثلاً مساجد، مقابر، سراؤں اور خانقاہوں کی طرح طب اور اطباء سے متعلق بھی بہت سی نشانیاں ہیں، جن سے اس کی قدیم طبی تاریخی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مشہور طبیب حکیم محمد اکبر ارزانی کی آخری آرام گاہ اسی شہر میں واقع ہے، شکار پور کی وہ مسجد جس میں ارزانی کا مقبرہ ہے، وہ حکیم اکبر ارزانی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں مغل عہد حکومت میں ایک بڑا ہسپتال ''دارالشفاء'' تعمیر ہوا تھا، گو کہ اب اس کے نشانات مٹ چکے ہیں، مگر اس علاقہ کی مسجد، 'مسجد دارالشفاء' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس شہر میں آثار قدیمہ کی تلاش کے دوران کئی حماموں کے نشانات ملے تھے۔ اس کے علاوہ شاہی قلعہ میں ''شاہ جہانی حمام'' اور ''جہانگیری حمام'' کے نام سے دو حمام آج بھی موجود ہیں۔[1]

عبدالرحیم خاں خاناں (1556-1627) کے برہان پور کے زمانہ قیام میں اس شہر کو ایک اہم طبی مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس کے دامن فیض سے مشہور اطباء کی ایک بڑی جماعت

وابستہ تھی، خان خاناں کی طب دوستی اور اطبا نوازی نے اس شہر میں ایک ایسی کشش پیدا کردی تھی کہ وسط ایشیا سے ہندوستان آنے والے کئی طبیبوں نے یہاں کا قصد کیا، ان میں حکیم روح اللہ، حکیم محمد باقر، حکیم جبرئیل، حکیم محمد امین، حکیم محمد نفیس، حکیم کمال الدین، حکیم حسین شیرازی، حکیم غفور لاہیجانی اور حکیم مشہدی جیسے اطباء کے نام ملتے ہیں، جو خان خاناں کی معارف پروری سے مستفیض ہوئے ہیں۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر سے یونانی طب کی ایک قدیم روایت جڑی ہوئی ہے۔

برہان پور میں اس سلسلہ کا موجودہ احیاء اور نشاۃ ثانیہ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس اور حکیم عبدالحمید (بانی جامعہ ہمدرد، دہلی) کی مرہون منت ہے اور یہاں طبی تعلیم کے لیے سیفیہ حمیدیہ یونانی طبیہ کالج کا قیام دراصل اسی قدیم روایت کا تسلسل ہے۔ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کا تیسرا اجلاس دسمبر 1957 میں برہان پور میں منعقد ہوا تھا۔ اس موقع پر یونانی طب کی تعلیم کے سلسلہ میں ایک ریزولیوشن پاس کیا گیا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ''یونانی طبی ایجوکیشن سوسائٹی۔ برہان پور'' کا قیام عمل میں آیا، فرم اور سوسائٹیز ایکٹ کے تحت ریاستی حکومت سے سوسائٹی کے رجسٹریشن کے بعد 1962 میں سیفیہ حمیدیہ یونانی طبیہ کالج کے نام سے برہان پور میں طبی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس کالج کے قیام میں داؤدی بوہرہ رہنما سیدنا ڈاکٹر طاہر سیف الدین اور حکیم عبدالحمید کے بیش قدر تعاون کی وجہ سے، اسے ان دونوں شخصیات سے موسوم کیا گیا۔[2] کالج کے قیام میں اس علاقہ کے جن لوگوں کا سرگرم تعاون رہا ہے ان میں ایچ۔ ایل راجا، عبداللہ بھائی سروری، ڈی این حکیم پل والا، حکیم ناتھورام پل والا، حکیم طاہر علی اندوری، سید حسن جے پوری، حماد انور (ناسک)، شیخ فضل حسین، ڈاکٹر صلاح الدین فاروقی، ڈاکٹر عبدالمجید، مولوی شمس التوحید اور حکیم ظہور احمد کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا شمار کالج کے بانی اراکین میں ہے۔

اس کالج نے بڑی بے بضاعتی کے ساتھ سفر شروع کیا تھا، قیام کے وقت اس کے پاس اپنی کوئی عمارت نہیں تھی، حکیمیہ اسکول کی بلڈنگ میں شبینہ کلاسز کا اہتمام کیا گیا تھا، کالج کے ابتدائی ایام طلبہ، اساتذہ اور منتظمین سبھی کے لیے بہت صبر آزما اور جدوجہد بھرے تھے، آزمائشوں کا یہ دور تقریباً دو دہائیوں پر محیط رہا ہے، اکتوبر 1980 میں ارجن سنگھ وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش کے ہاتھوں

کالج بلڈنگ کا سنگ بنیاد رکھا گیا، 4 جنوری 1986 کو صوبہ کے وزیر اعلیٰ موتی لال وورا کے ہاتھوں سعیدہ ہاسپٹل اینڈ ریسرچ سنٹر اور برہانی ہوسٹل کی رسم تاسیس ادا ہوئی، برہانی ہوسٹل کے تعمیری مصارف بوہرہ روحانی پیشوا ڈاکٹر محمد برہان الدین نے برداشت کیے اور سعیدہ ہاسپٹل کے لیے مسلم نمائندہ کمیٹی برہان پور نے دو ایکڑ زمین لیز پر دی۔[3] 4 جنوری 1986 کو موتی لال وورا کے ہاتھوں ان دونوں بلڈنگوں کی رسم تنصیب ادا ہوئی۔ یہ دن کالج کے لیے تاریخی اہمیت کا حامل تھا، اس لیے کہ اس روز یہاں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کا تیرہواں اجلاس منعقد ہو رہا تھا، جس کے افتتاح کے لیے مرکزی وزیر صحت و خاندانی فلاح و بہبود محسنہ قدوائی دلی سے تشریف لائی تھیں، اس کے علاوہ صوبہ کے سرکاری عمائدین، بوہرہ رہنما ڈاکٹر محمد برہان الدین، کانفرنس کے صدر حکیم عبدالحمید اور یونانی طب کی مقتدر شخصیتیں بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ اس کالج میں کانفرنس کا اجلاس منعقد کر کے حکیم عبدالحمید نے بڑی دور اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ سرکار کے صوبائی و مرکزی نمائندوں کو یہاں مدعو کر کے ان کی توجہ کالج کی طرف منعطف کرانے کے ساتھ انہیں ریاست میں یونانی طب کی تعلیمی ضرورت اور اہمیت سے آگاہ کرانا چاہتے تھے۔

اس کالج کو شروع سے حکیم عبدالحمید دہلوی کا تعاون حاصل رہا ہے، حکیم صاحب کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ یہ کالج شخصی کفالتوں سے بے نیاز ہو اور اسے حکومت کا تعاون مل جائے، انہوں نے کانفرنس کے اجلاس میں مرکزی وزیر صحت اور صوبائی حکومت کے ذمہ داروں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا تھا:

''اس موقع پر میں مرکزی اور ریاستی وزیر صحت سے درخواست کروں گا کہ اب جب کہ ساری ریاست میں یہی ایک یونانی کالج ہے اور اپنی زندگی کی مشکلوں سے دو چار ہے تو اسے حکومت کا بھرپور تعاون دیا جائے، میری تجویز ہے کہ ریاست مدھیہ پردیش، برہان پور میں یونانی طب کا حکیم اکبر ارزانی ہسپتال قائم کر کے یہاں کے عوام کو یونانی طریقۂ علاج سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا موقع دے''۔[4]

ایک زمانہ میں ریاستی حکومت نے اس کالج کو مالی تعاون کی پیشکش بھی کی تھی، لیکن منتظمین نے اسے مسترد کر دیا، انہیں خدشہ تھا کہ کہیں اس کی وجہ سے کالج حکومت کی تحویل میں نہ

چلا جائے، یہ انتظامیہ کا بے بنیاد اندیشہ تھا، اگر اس نے حکومت کی یہ پیشکش قبول کر لی ہوتی تو اسے بڑی حد تک مالی مسائل سے چھٹکارا مل جاتا اور دوسرے ترقیاتی منصوبوں کی طرف توجہ کرنے کا زیادہ موقع ملتا، حکومت کی امداد کے بعد اس کی معتبریت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

اس کالج کی تعمیر و ترقی کے سلسلہ میں حکیم عبدالحمید کی کوششیں بے حد اہم ہیں، انہوں نے ضرورت کے ہر موڑ پر کالج کی دستگیری کی اور اسے ہر طرح کا تعاون دیا ہے۔ سعیدہ ہسپتال حکیم صاحب کی اہلیہ کے نام منسوب ہے، اس کے بیشتر مصارف انہوں نے برداشت کیے۔ تعمیرات کے سلسلہ میں حکیم صاحب کے جس ذوق کی شہرت ہے، اس کا مظاہرہ سعیدہ ہسپتال کی بلڈنگ سے بھی ہوتا ہے، یہ نہایت عالی شان پانچ منزلہ عمارت ہے، اس کی وجہ سے کالج کیمپس بڑا پرشکوہ معلوم ہوتا ہے، اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

ہمدرد فاؤنڈیشن (قائم کردہ حکیم عبدالحمید) کے غیر معمولی تعاون کی وجہ سے کالج انتظامیہ میں ایک رکن کی نامزدگی کا حق فاؤنڈیشن کو حاصل ہے۔ اس وقت پروفیسر ذکی الدین (سائنس کالج برہان پور) فاؤنڈیشن کی طرف سے نامزد رکن ہیں اور انہی کے توسط سے فاؤنڈیشن اپنا تعاون پیش کرتی ہے۔

اس کالج میں یونانی طب کے گریجویشن (BUMS) کے ساتھ فزیوتھیراپی (BPT) اور یونانی کمپاؤنڈر کے کورسز بھی پڑھائے جاتے ہیں، یہاں جاری فزیوتھیراپی کے نصاب سے یونانی طلبہ کو علاج بالتدبیر سیکھنے میں مدد ملتی ہے، استفادہ کی یہ کوشش قابل ستائش ہے۔ یونانی طب کے مختلف شعبہ جات میں ڈپارٹمنٹ آف علم الادویہ کا معیار کافی بہتر ہے، یہاں کے صیدلہ ڈپارٹمنٹ میں طلبہ کی عملی تعلیم کا کافی بہتر نظم ہے، کالج ہسپتال میں استعمال ہونے والی تمام دوائیں یہیں تیار ی ہوتی ہیں، اس سے مریضوں کو خالص اور عمدہ دوائیں مل جاتی ہیں اور طلبہ کو یونانی دوا سازی سیکھنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔

اس وقت کالج انتظامیہ کے سامنے کئی Para Medical کورسز شروع کرنے کا منصوبہ زیر غور ہے، BPT اور یونانی کمپاؤنڈر کے تجربہ کے بعد اب وہ نرسنگ، لیب ٹکنیشین اور اکسرے ٹکنیشین کا کورس شروع کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔[5]

ریاستی حکومت کے ضابطے کے مطابق داخلوں میں صوبائی طلبہ کے لیے پچاس فیصد نشستیں مختص کرنا ضروری ہے، ان مراعات کا فائدہ حاصل کرنے والے زیادہ تر طلبہ برہان پور یا اس کے مضافات کے ہوتے ہیں۔ تدریسی اور غیر تدریسی عملہ میں بھی مقامی لوگوں کی تعداد نصف سے زیادہ ہے، بلاشبہ اس ادارہ کا قیام ریاستی لوگوں کے لیے ہوا ہے، لیکن مقامی اساتذہ اور طلبہ کی اس کثرت کی وجہ سے اکثر یہاں انتظامی بدامنی کا مشاہدہ ہوتا ہے، جب ریاست کی طرف سے اس قسم کی پابندی نہیں تھی، اس وقت کئی صوبوں کے طلبہ یہاں تعلیم حاصل کرتے تھے، تب یہاں کا تعلیمی ماحول بھی بہت اچھا تھا اور مختلف ریاستوں کے طلبہ واساتذہ کی وجہ سے اس کی شناخت کا دائرہ کافی وسیع تھا۔

سیفیہ حمیدیہ طبیہ کالج کو سی سی آئی ایم سے منظوری حاصل ہے اور صوبہ کی دیوی اہلیہ یونیورسٹی اندور سے یہ کالج ملحق ہے۔ پچھلے پچاس سالوں سے یہ کالج طبی تعلیم کی اشاعت کررہا ہے، اب تک ریاست اور بیرون ریاست کے سیکڑوں طلبہ یہاں سے مستفید ہو چکے ہیں۔ نصف صدی پہلے جب یہاں تعلیم کا آغاز ہوا تھا اس وقت جن اساتذہ کے ذریعہ یہ سلسلہ شروع ہوا تھا ان میں حکیم نذیر یوسفی، حکیم نعیم اللہ، حکیم ماجد، حکیم مظفر الاسلام، حکیم عبدالحفیظ اور حکیم عبدالحمید کے نام شامل ہیں، حکیم صلاح الدین فائق کالج کے پہلے پرنسپل تھے، ان کے بعد جن اساتذہ نے مختلف میقاتوں میں پرنسپل شپ کے فرائض انجام دیے، ان میں حکیم برکت اللہ نیر، ٹی وی وید، حکیم تسخیر فہمی، حکیم سید اختر علی، حکیم محمد نذیر یوسفی، حکیم وثیق الدین، حکیم کبیر عالم، حکیم قیام الدین، حکیم الطاف جاوید، حکیم سعید صدیقی، حکیم ابوالفیض جھولے، حکیم عبدالوحید اور حکیم عبدالودود وغیرہ کے نام شامل ہیں،6 حکیم عبدالودود سے راقم کو مودت کا رشتہ ہے، انہوں نے برسوں یہاں تدریسی فرائض انجام دیے ہیں اور اس وقت نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن بنگلور میں شعبۂ علم الادویہ میں پروفیسر ہیں، انہوں نے کالج کے تعلق سے زبانی معلومات فراہم کرنے کے علاوہ دوسرے حوالوں کی دستیابی میں بھی راقم کا تعاون کیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ جہان طب (سہ ماہی) جلد 11، شمارہ 2، اکتوبر-دسمبر 2009، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی: ص 17-16

2۔ اے پروفائل، یونانی طبی ایجوکیشن سوسائٹی، برہان پور، کوالٹی پرنٹرس منڈی، برہان پور، غیر مورخ، ص 3

3۔ سیفیہ حمیدیہ یونانی طبیہ کالج کی پچاس سالہ رپورٹ جو پروفیسر عبدالودود (سابق استاذ کالج ہذا) نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور کے ذریعہ حاصل ہوئی۔

4۔ خطبات حمید از حکیم عبدالحمید، مرتبہ ڈاکٹر خاور ہاشمی، مطبوعہ خواجہ پریس، جامع مسجد، دہلی 1995، ص 267

5۔ ملاحظہ ہو حوالہ نمبر 2، ص 8

6۔ ملاحظہ ہو حوالہ نمبر 3

الفاروق یونانی میڈیکل کالج۔ اندور

اندور (مدھیہ پردیش) کو یہ افتخار حاصل ہے کہ حکیم محمد اعظم خاں (1813-1902) کو اس شہر سے نسبت رہی ہے اور یہیں وہ آسودۂ خاک ہیں۔ ان کے مشورہ سے ریاست اندور کے طبیبوں، ویدوں اور جراحوں کے لئے اہلیتی امتحان پاس کرنے کو ضروری قرار دیا گیا تھا۔ اعظم خاں کی مشہور تالیف ''اکسیر اعظم'' والی ریاست مہاراجہ تکو جی راؤ ہولکر اور ''محیط اعظم'' سیوا جی راؤ ہولکر کے نام معنون ہے۔ شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم اپنے ایام ولی عہدی میں جب ہندوستان دورہ کے موقع پر اندور آیا تھا، مہاراجہ تکو جی راؤ ہولکر نے ''اکسیر اعظم'' اسے تحفہ میں پیش کی تھی۔ ایڈورڈ ہفتم نے اسے بے حد پسند کیا تھا اور لندن میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کروایا تھا۔ اعظم خاں کے نبیرہ حکیم محمد اکمل خاں کا شمار اندور کے حاذق معالجین میں تھا۔ وہ ریاست میں افسر الاطبا کے علاوہ مہاراجہ کے سکریٹری اور ریونیو کمشنر کے اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔[1]

یہ واقعات اندور سے طب اور اطباء کے گہرے تعلق کا ثبوت ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہاں ماضی میں طب کی صورت حال کا پتہ چلتا ہے اور اس فن سے والیان ریاست کے لگاؤ اور ان کے نزدیک اس کی قدر و منزلت کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر 1947 کے بعد اندور سے طب کے تعلق کا یہ واقعہ ماضی کی داستان بن گیا۔

اس شہر میں الفاروق یونانی میڈیکل کالج کی تاسیس سے یونانی طب کو حیات نو ملنے

کے آثار پیدا ہوئے ہیں۔ اس کا سہرا الفاروق چیریٹیبل ٹرسٹ اور اس کے بانیوں کے سر ہے۔ ٹرسٹ کے قیام کے سلسلہ میں امان اللہ خاں (رینجر صاحب) کی مساعی بے حد اہم ہیں، ان کا شمار کھجرانہ (اندور) کے معززین میں تھا۔ ٹرسٹ کے ذمہ داروں نے رفاہ عام خصوصاً مسلمانوں کی طبی سہولت کے لئے 1990 میں کھجرانہ میں لیڈی حلیمہ ہاسپٹل کے نام سے ایک شفاخانہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کی کامیابی نے ٹرسٹیوں کو حوصلہ بخشا، انھوں نے ایک قدم آگے بڑھ کر طبی تعلیم کا منصوبہ وضع کیا، اس کی برآوری کے لئے ٹرسٹ کے ذیل میں الفاروق ایجوکیشنل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ سید اشتیاق علی صدر، حاجی محمد اسرار سکریٹری، محمد فاروق خازن، لیاقت حسین قریشی چیئرمین، عبدالمجید قریشی اور ممو پٹیل سوسائٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ ان کی مشترکہ جدوجہد سے 1997 میں الفاروق یونانی میڈیکل کالج کا آغاز ہوا۔ ہائر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کی اجازت، دیوی اہلیہ یونیورسٹی، اندور سے الحاق اور سی سی آئی ایم کی منظوری کے بعد 31 مارچ، 1998 سے باقاعدہ تعلیم کی ابتداء ہوئی۔ سی سی آئی ایم کی اجازت کے مطابق پہلے سال چالیس طلبہ کا داخلہ ہوا تھا۔ دوسرے سال سے اب تک ہر برس یہاں پچاس طلبہ کا داخلہ ہو رہا ہے۔

اس کالج کے ابتدائی اساتذہ میں حکیم عبدالقوی فاروقی، حکیم خورشید عالم، حکیم سید مرتضیٰ علی کے اسماء قابل ذکر ہیں، جو یونانی مضامین کی تدریس پر مامور تھے۔ جدید مضامین کے لئے ڈاکٹر محمود خاں (ایم ڈی میڈیسن)، ڈاکٹر وی خاں (ایم ڈی میڈیسن اور ایم ایس گائنا کولوجی) کا تقرر ہوا تھا۔ ان چند اساتذہ کی ٹیم نے کھجرانہ کے راکوٹ اسکول میں کرایہ کی بلڈنگ سے تعلیمی سفر کا آغاز کیا تھا۔ تقریباً دو سال تک کرایہ کی اسی عمارت میں رہنے کے بعد 2000 میں یہ کالج لیڈی حلیمہ ہاسپٹل کی بالائی منزل پر منتقل ہوا۔ 2009 تک یہاں تعلیم و تدریس کا سلسلہ رہا۔ اس کے بعد اندور بائی پاس پر واقع کیمپس میں کالج کی نئی عمارت میں یہ منتقل ہو گیا۔

حکیم عبدالحنان فاروقی اس کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ دو سال خدمت انجام دینے کے بعد انھوں نے دیواس مدھیہ پردیش میں حکیم عبدالحمید یونانی میڈیکل کالج کے نام سے خود اپنا ادارہ قائم کرلیا، جہاں وہ دیگر انتظامی امور کے ساتھ پرنسپلی کی ذمہ داری بھی نبھا رہے ہیں۔ ان کے بعد 2000 سے 2001 تک حکیم سعود علی خاں (موجودہ پرنسپل اجمل خاں طبیہ کالج،

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے پرنسپلی کے فرائض انجام دیئے۔ سعود علی خاں کے بعد حکیم نذیر احمد یوسفی تقریباً آٹھ ماہ پرنسپل رہے۔ ان کے بعد ذکی انور انصاری، منصور احمد صدیقی، عبدالقوی فاروقی، محمد عاصم صدیقی اور اختر مسعود صدیقی کے پاس پرنسپل شپ کا چارج رہا۔ 5/جنوری 2012 کو حکیم عبدالقوی فاروقی اس عہدہ پر فائز ہوئے۔ اس وقت یہاں شعبۂ جراحت میں طبیبہ نکہت مرتضٰی اور آمرین سید۔ شعبۂ معالجات میں طبیبہ خورشید زریں، حکیم محمد اسجد خاں، حکیم محمد عامر۔ شعبۂ کلیات میں پروفیسر کفیل احمد، طبیبہ عظمٰی فاروق، مولانا شکیل احمد۔ شعبہ نسواں میں طبیبہ سیدہ مریم علی، حکیم نورالدین عباسی۔ شعبۂ علم الادویہ میں حکیم سلیم اختر، حکیم شفیق الرحمٰن، حکیم محمد افصح الکلام۔ شعبۂ حفظان صحت میں پروفیسر محمد عاصم صدیقی، حکیم فرازالدین، حکیم محمد اکمل، حکیم سید محمد عبید۔ شعبۂ تشریح و منافع الاعضاء میں پروفیسر سید مرتضٰی علی، طبیبہ شکیلہ شفیق اور طبیبہ انجمن شاہین تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

الفاروق ایجوکیشنل سوسائٹی کے موجودہ ذمہ داروں میں سید عبد القدوس (صدر)، لیاقت حسین قریشی (سکریٹری)، عبدالمجیب فاروقی (چیرمین)، محمد فاروق (خازن)، حاجی محمد اسرار (وائس پریسیڈنٹ)، ممو پٹیل اور عمران علی بطور رکن شامل ہیں۔ موجودہ انتظامیہ میں لیاقت حسین قریشی بے حد متحرک اور فعال ہیں۔

مدھیہ پردیش حکومت ہر سال، پری آیورویدک، ہومیوپیتھی، یونانی، نیچروپیتھی (PAHUNT) کا مشترکہ داخلہ امتحان منعقد کرتی ہے۔ اس کے ذریعہ منتخب ہونے والے طلبہ الفاروق یونانی میڈیکل کالج اور صوبہ کی دوسری طبی درسگاہوں میں داخلہ پاتے ہیں۔

لیڈی حلیمہ ہاسپٹل کھجرانہ میں طلبہ عملی مشق حاصل کرتے ہیں۔ یہاں یونانی اور ایلوپیتھی طریقۂ تشخیص و تجویز سیکھنے کی اچھی سہولت ہے۔ اس ہاسپٹل میں یونانی او پی ڈی اور آئی پی ڈی کا بھی انتظام ہے۔ حکیم سلیم اختر شعبۂ علم الادویہ اور صیدلہ کے صدر ہیں۔ جب وہ علی گڑھ میں طالب علم تھے، اس زمانہ سے انہیں دواسازی سے دلچسپی رہی ہے۔ اس کالج کی OPD اور IPD میں استعمال ہونے والی دوائیں انہی کی نگرانی میں تیار ہوتی ہیں، اس سے طلبہ کو دواسازی سیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ یہاں استعمال ہونے والی دواؤں کے نسخہ جات کو حکیم سلیم اختر نے ''مرکبات

الفاروق'' کے نام سے مرتب کر کے، اسے کالج فارما کوپیا کی شکل دے دی ہے۔

اس کالج کے ذریعہ اندور اور صوبہ کے لوگوں کو طبی تعلیم کا موقع میسر آ رہا ہے۔ مزید برآں اندور کے لوگوں کو طبی سہولیات کی فراہمی میں یہ کالج مددگار ثابت ہو رہا ہے اور اندور کے اطراف میں یونانی طریقۂ علاج کے تعارف کا ذریعہ بن رہا ہے۔ ابھی یہ کالج تعمیر و ترقی کے مرحلہ میں ہے۔ ہنوز اسے کئی مرحلے طے کرنے ہیں۔ اس سلسلہ میں انتظامیہ، اساتذہ اور طلبہ ہر ایک کا کردار اہم ہے۔ اگر مشترکہ جدوجہد کا سلسلہ جاری رہا تو سارے مراحل آسان ہوں گے۔

حوالہ

1۔ اسماء الادویہ، مؤلفہ حکیم محمد اعظم خاں، مقدمہ حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 2002، ص 8، 11، 14

حکیم سید ضیاء الحسن گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج۔ بھوپال

1949 میں بھوپال ریاست کا ہندوستان کے ساتھ انضمام ہوا، اس کے بعد یہاں کے تمام انتظامی اختیارات حکومت ہند کو منتقل ہو گئے اور بھوپال کی ریاست والی حیثیت ختم ہو گئی، سیاسی لحاظ سے یہ بہت بڑی تبدیلی تھی، یہ اندازہ تو تھا کہ اب یہاں کے حالات پہلے سے بہت مختلف ہوں گے، لیکن یہ توقع کی جا رہی تھی کہ جن چیزوں کا تعلق مفاد عامہ سے ہے، وہ نئے سیاسی نظام میں بھی جاری رہیں گی اور انہیں بدستور فروغ کے مواقع ملیں گے۔ اس لیے کہ ہندوستانیوں نے جنگ آزادی لڑکر سیاسی قوت اسی لیے حاصل کی تھی کہ جب ملک آزاد ہوگا تو یہاں ہندوستانیت کو فروغ ملے گا اور دیسی امور کو خود مختاریت حاصل ہوگی اور انہیں ترقی کے آزادانہ مواقع میسر ہوں گے، لیکن غیر متوقع تبدیلیوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ نئے نظام میں آصفیہ طبیہ کالج کا بند ہو جانا بھی اسی قسم کا ایک حیرت ناک واقعہ تھا، 1903 سے قائم یہ طبی ادارہ جس کا تعلق تعلیم کے ساتھ صحت عامہ جیسے بنیادی شعبہ سے تھا اور اس سے عوامی مفاد وابستہ تھا، مزید برآں یہ ہندوستان کی ایک اہم علمی و تہذیبی میراث کے تحفظ کا ذریعہ بھی تھا، ان سب باتوں کے باوجود نہ جانے ہندوستان کے سامنے، کون سی مجبوریاں تھیں کہ اسے تقریباً نصف صدی سے جاری اس اہم تعلیمی ادارہ کو بند کر دینا پڑا۔

اس کالج کے بند ہو جانے کے بعد بھوپال کی طبی رونق ختم ہو گئی۔ اس شہر میں دوبارہ طبی

تعلیم شروع کرنے کے لیے قومی اور مقامی دونوں سطح سے مطالبات ہونے لگے، حکومت کے صوبائی و مرکزی ذمہ داروں کو اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا گیا، آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے تیسرے اجلاس منعقدہ برہان پور میں حکیم عبدالحمید نے اپنے صدارتی خطبہ میں مطالبہ کرتے ہوئے کہا تھا:

''بعض ریاستوں میں کسی عذر کی بناء پر جو درسگاہیں بند ہوگئی ہیں انہیں مناسب مدد دے کر دوبارہ جاری کیا جائے، آصفیہ طبیہ کالج بھوپال، طبیہ کالج بمبئی اور بھوپندر طبیہ کالج پٹیالہ پھر سے کھولے جائیں اور ان کے انتظامات کا معقول بندوبست کیا جائے''۔

اسی طرح انہوں نے 1984 میں کانفرنس کے اجلاس، منعقدہ برہان پور میں مرکزی وزیر صحت محسنہ قدوائی اور محکمۂ صحت کے ریاستی ذمہ داروں سے اپنے خطبۂ صدارت میں سوال کیا تھا:

''کن وجوہ سے بھوپال میں قائم طبیہ کالج بند ہوگیا ہے، جس کو ایک عرصہ تک یونانی طب کی ایک محسن، بیگم صاحبہ سابق والی ریاست بھوپال کی سرپرستی حاصل رہی ہے''۔[1]

مقامی سطح پر طب کے کئی بہی خواہوں نے صوبائی حکومت کے ذمہ داروں سے مل کر بھوپال میں طبیہ کالج کے قیام کے سلسلہ میں جدوجہد کی۔ اس تعلق سے حکیم ملک انعام الحق اور اختر مسعود صدیقی کا بڑا اہم کردار رہا ہے، ملک صاحب ریاست کے محکمۂ صحت میں یونانی طب کے ڈپٹی ایڈوائزر تھے اور اختر صاحب سی، سی، آئی، ایم میں صوبہ کی طرف سے نمائندگی کر رہے تھے، ان دونوں کی کوششیں رنگ لائیں اور مدھیہ پردیش حکومت نے سرکاری اہتمام میں بھوپال کے اندر ایک طبیہ کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور اس مجوزہ کالج کو فخر الاطباء حکیم سید ضیاء الحسن کے نام منسوب کر کے اپنے ایک ایسے فرزند کی طبّی خدمات کے اعتراف کا ثبوت پیش کیا، جس کی کاوشوں کا بھوپال میں طب کی تعلیم کے فروغ کے سلسلہ میں نہایت اہم کردار رہا ہے، بھوپال میں طبّی تعلیم کے رواج اور اس کی ترقی میں حکیم سید ضیاء الحسن اور ان کے خاندان کا جو حصہ ہے اس کی بنیاد پر ان کے نام سے اس نئے کالج کا انتساب نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے۔

13 رجنوری 1998 کو حکیم سید ضیاء الحسن یونانی میڈیکل کالج کے نام سے بھوپال میں

طبی تعلیم کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔[2] جولائی 1998 میں اس کالج میں پہلا تعلیمی سیشن شروع ہوا۔ داخلہ کا عمل پورا ہونے کے بعد صوبہ میں تعینات یونانی میڈیکل آفیسروں کی خدمات مستعار لے کر انہیں تدریسی ذمہ داریاں تفویض کی گئیں۔ حکیم ملک انعام الحق، حکیم اختر مسعود صدیقی، حکیم محمد سمیع (علیگ)، حکیم عمران احمد خاں (علیگ)، حکیم محمد اسلم (علیگ)، حکیم عبدالعزیز صدیقی کے ذریعہ اس تعلیمی کارواں نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ ان کے علاوہ یہاں کے ابتدائی اساتذہ میں حکیم محفوظ الرحمٰن (علیگ) کا نام بھی شامل ہے، یہ اس کالج کے پہلے ایسے استاذ ہیں جو براہ راست تدریسی خدمت کے لئے منتخب ہوئے تھے، جس وقت ان کا انتخاب ہوا تھا اس وقت تک اساتذہ کی پوسٹیں حکومت سے سینکشن نہیں ہو پائی تھیں۔ اس لئے کچھ دنوں تک انھوں نے بلا معاوضہ خدمت انجام دی۔

2003 میں حکومت کی طرف سے اساتذہ کی چودہ اسامیاں منظور ہوئیں، اس طرح پہلی بار جنرل سلیکشن کمیٹی کے ذریعہ منظور شدہ پوسٹوں کے لیے اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا۔[3] محفوظ الرحمٰن، کہکشاں جعفری، زبیر احمد انصاری، سید شاہ عالم، محمد شفیق خاں ندوی پہلے بیچ کے اساتذہ ہیں، ان سے پہلے جو اساتذہ تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے، وہ دراصل صوبائی حکومت کے یونانی میڈیکل آفیسر تھے، کالج کے لیے ان کی خدمات مستعار لی گئی تھیں۔ 2003 میں جب پہلی بار اساتذہ کی چودہ اسامیوں کے لیے سلیکشن کمیٹی ہوئی تھی تو ریزرویشن زمرہ کے اساتذہ نہ مل پانے کی وجہ سے کچھ سیٹیں خالی رہ گئی تھیں، لہٰذا حکومت نے بعض عارضی اساتذہ جیسے اختر مسعود صدیقی، محمد اسلم خاں اور عبدالعزیز صدیقی کے ڈیپوٹیشن کو کچھ دنوں اور جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تاکہ تدریسی عمل متاثر نہ ہو۔

جب کالج کی بنیاد پڑی تھی، اس وقت ملک انعام الحق مدھیہ پردیش میں یونانی کے ڈپٹی ایڈوائزر تھے، 2000 میں ان کو حکومت کی طرف سے پرنسپل شپ کی اضافی ذمہ داری تفویض کی گئی، اس طرح انہیں کالج کا پہلا پرنسپل ہونے کا اعزاز حاصل ہے، چونکہ ان کا تقرر عارضی تھا اس لیے 2006 میں ان کی جگہ اختر مسعود صدیقی پرنسپل بنا دیئے گئے، کچھ دنوں بعد یہ چارج عبدالعزیز صدیقی کو دے دیا گیا، لیکن وہ زیادہ دنوں اس عہدہ پر برقرار نہیں رہ سکے اور

اختر مسعود صدیقی دوبارہ پرنسپل شپ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے، مگر 2008 میں یہ چارج عمران احمد خاں کو دے دیا گیا لیکن جلد ہی ایک بار پھر یہ عہدہ اختر مسعود صدیقی کے پاس پہنچ گیا۔ کالج کے قیام سے لے کر 30 مارچ 2009 تک عہدۂ صدارت کی منتقلی کا سلسلہ یونہی جاری رہا اور اس رسہ کشی کا اختتام اس وقت ہوا جب ڈاکٹر ذکی انور انصاری اس کالج کے باضابطہ پرنسپل منتخب ہوئے۔

حکومت نے کالج میں اساتذہ کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے 2007 میں مزید 34 عہدوں کی منظوری دی، لیکن اس بار بھی ایس، سی اور ایس، ٹی زمرہ کی اسامیاں خالی رہ گئیں، لہٰذا سی، سی، آئی، ایم کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے حکومت کی جانب سے 2009 میں مزید پوسٹیں سینکشن ہوئیں۔ 19/مارچ 2010 کو ان عہدوں پر اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا۔ اب یہاں اساتذہ کی وہ تعداد پوری ہو چکی ہے جو سی، سی، آئی، ایم کے لحاظ سے ضروری ہے۔ اس وقت کالج کے سبھی چودہ شعبوں میں اساتذہ کی مطلوبہ تعداد موجود ہے اور یہ اس کالج کا ایک بڑا امتیاز ہے، ورنہ ہندوستان کے اکثر سرکاری انتظام والے ادارے اساتذہ کی کمی کے مسئلہ سے دوچار ہیں، اس کی وجہ سے وہاں داخلہ اور تعلیم کا عمل متاثر ہو رہا ہے۔

بھوپال کے اس کالج کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ یہاں ہاسپٹل میں کلینیکل رجسٹرار اور ریزیڈنشیل میڈیکل آفیسر کے علاحدہ عہدے ہیں اس کے علاوہ اس کالج کو دوسرے، تیسرے اور چوتھے درجہ کے ملازمین کی 137 اسامیوں کی منظوری حاصل ہے۔ اب تک چونسٹھ پوسٹوں کے لیے تقرر کا کام پورا ہو چکا ہے۔ باقی اسامیوں پر تقرری تکمیل کے مرحلہ میں ہے، جلد ہی اس کے پورا ہو جانے کی امید ہے۔[4]

کالج کی بڑھتی ضرورتوں کے لیے جب موجودہ کیمپس تنگ پڑنے لگا تو ریاستی حکومت نے 2003 میں کالج کو مزید پانچ ایکڑ زمین فراہم کرنے کے احکام جاری کیے۔ چونکہ یہ قطعۂ آراضی موجودہ کیمپس سے ذرا فاصلہ پر تھا اس لیے کالج کے ذمہ دار اسے لینے میں پس و پیش کر رہے تھے بالآخر وہ اسے لینے پر راضی ہو گئے۔

اس کالج کو ایک بڑی کامیابی اس وقت ملی جب وزارت صحت کی طرف سے اسے

ماڈل کالج بنانے کے لیے پانچ کروڑ کی امدادی رقم دیئے جانے کا فیصلہ ہوا، تین کروڑ کی پہلی قسط سے کالج کے لیے پی۔ جی بلڈنگ اور ہاسپٹل کی تعمیر کا کام مکمل ہو چکا ہے، باقی دو کروڑ کے حصول کے لیے اس کا یوٹی لائزیشن سرٹیفکٹ وزارت صحت کو بھیجا جا چکا ہے۔

بھوپال کا یہ کالج ابھی استحکام کے مرحلہ میں ہے، مگر اس کی پیش رفت کو دیکھتے ہوئے توقع کی جا رہی ہے کہ اس کے ذریعہ اس شہر میں یونانی طب کی فضا ایک بار پھر قائم ہوگی اور یہاں یونانی طب کو، اس کی کھوئی ہوئی زمین دوبارہ حاصل ہوگی اور بھوپال میں ایک بار پھر طب کی وہی رونق ہوگی جو انضمام سے پہلے ریاست کے زمانہ میں تھی۔

حوالہ جات

1۔ خطبات حمید از حکیم عبدالحمید، مرتبہ ڈاکٹر خاور ہاشمی، خواجہ پریس، دہلی، 1995، ص 92 اور 265

2۔ حکمنامہ مدھیہ پردیش گورنمنٹ، جاری کردہ ڈیپارٹمنٹ آف میڈیکل ایجوکیشن، مورخہ 13 رجنوری 1998 اندراج نمبر 3/ med / 44 / 97 / 2623 / 79۔

3۔ حکمنامہ مدھیہ پردیش گورنمنٹ، جاری کردہ ڈیپارٹمنٹ آف میڈیکل ایجوکیشن، مورخہ 1 راپریل 2003 اندراج نمبر 3 / Edu / 55 / 98 / 25 / 5

4۔ حکمنامہ مدھیہ پردیش گورنمنٹ، جاری کردہ ڈیپارٹمنٹ آف میڈیکل ایجوکیشن، مورخہ 25 راگست 2008، اندراج نمبر 55 / 3 / 2007 / 16-1

حکیم عبدالحمید یونانی میڈیکل کالج۔ دیواس

ضلع دیواس، جو عام طور پر بینک نوٹ پریس کے لئے جانا جاتا ہے، یہ ڈسٹرکٹ اندور سے 36 رکلومیٹر کی مسافت پر ممبئی آگرہ روڈ پر آگرہ کی طرف جانے والی شاہراہ پر واقع ہے۔ دیواس میں مسلم آبادی کا تناسب تقریباً 30 فیصد ہے۔ اب دیواس کی ایک نئی حیثیت حکیم عبدالحمید یونانی میڈیکل کالج کی وجہ سے ہے۔ طبی حلقہ میں دیواس اسی حیثیت سے متعارف ہے۔ اس شہر کو یہ شناخت عطا کرنے والے پروفیسر حکیم عبدالحنان فاروقی ہیں، جن کی وجہ سے یہاں یہ یونانی کالج قائم ہوا ہے۔

حکیم عبدالحنان فاروقی سیفیہ حمیدیہ یونانی طبیہ کالج، برہان پور کے فارغ ہیں، ان کا تعلق ضلع اندور، قصبہ دیپالپور کے ایک قاضی خاندان سے ہے۔ یونانی طب سے تعلق انہیں بزرگوں سے وراثت میں ملا ہے۔ ان کے نانا حکیم سید میر غنی (وفات 1971) اپنے وقت کے اچھے طبیب تھے۔ ان کے والد حکیم عبدالسلام (عمر تقریباً اسی برس) دیواس میں یونانی مطب کر رہے ہیں۔

حکیم عبدالحنان فاروقی نے 1992 میں سیفیہ حمیدیہ یونانی طبیہ کالج، اندور سے بی یو ایم ایس کی تکمیل کی۔ جب 1997 میں اندور میں الفاروق یونانی میڈیکل کالج قائم ہوا تو وہ اس کے پہلے پرنسپل منتخب ہوئے۔ اس عہدہ پر تقریباً دو برس خدمت انجام دینے کے بعد انھوں نے

خود اپنا کالج قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سے ان کی اولوالعزمی کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے کالج کے قیام کے لئے اقرأ ایجوکیشن سوسائٹی دیپالپور کی تشکیل کی اور اس کے زیر اہتمام کالج کے قیام کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا۔ حکیم ضیاء الرحمٰن ساکن دیواس جو حکیم عبدالحنان کے اندور میں کلاس فیلو تھے اور ڈاکٹر وثیق الرحمٰن گجدھر جن کا دیواس میں ایک بڑا ہاسپٹل ہے، ان دونوں حضرات نے بھی عملی طور پر کالج کے قیام میں حصہ لیا۔

طویل جدوجہد کے بعد اقرأ ایجوکیشن سوسائٹی دیپالپور کو صوبائی حکومت اور سی آئی ایم سے کالج کے قیام کی منظوری ملی۔ 3/مارچ 2002 سے حکیم عبدالحمید یونانی میڈیکل کالج میں تدریسی سلسلہ کا آغاز ہوا۔ ابتدأ تعلیم کا بندوبست ڈاکٹر وثیق الرحمٰن گجدھر کے ذاتی مکان میں تھا۔ 2005 میں سوسائٹی نے اپنی زمین خرید کر کالج کی عمارت تعمیر کی۔ 2006 سے نئی بلڈنگ میں تعلیم ہو رہی ہے۔ دیواس میں راجوداروڈ پر واقع اس کالج میں ابھی تعمیر وترقی کے بہت کام باقی ہیں، حکیم عبدالحنان اور ان کے ساتھیوں سے امید ہے کہ وہ جلد ہی ان کی تکمیل کرلیں گے۔

اس کالج کو حکیم عبدالحمید کے نام سے منسوب کرنے کی وجہ دراصل ان کی طبی خدمات کی تحسین و پذیرائی ہے۔ حالانکہ ہندوستان کے بعض یونانی کالجوں کو حکیم صاحب کا تعاون حاصل رہا ہے۔ اس سلسلہ میں برہان پور کے سیفیہ حمیدیہ یونانی طبیہ کالج کا نام لیا جاسکتا ہے۔ یہ کالج ان کے تعاون کی وجہ سے ان کے نام سے معنون ہے۔ لیکن دیواس کے اس کالج کے انتساب کی وجہ صرف حکیم صاحب کی اعلیٰ طبی خدمات کی تحسین کرنا ہے۔

حکیم عبدالحنان فاروقی، حکیم عبدالحمید یونانی میڈیکل کالج کے بانی اور روح رواں ہیں۔ اس کے قیام سے لے کر اب تک وہی اس کے پرنسپل ہیں۔

اس کالج کو چالیس طلبہ کے داخلہ کی منظوری حاصل ہے۔ 2008 میں اس کا پہلا بیچ فارغ ہوا تھا۔ صوبہ مدھیہ پردیش کی وکرم یونیورسٹی، اجین سے اس کا الحاق ہے۔ حکیم عبدالحمید یونانی میڈیکل کالج۔ دیواس کے قیام سے صوبہ میں یونانی تعلیم کی اشاعت کا ایک اور ذریعہ پیدا ہوا ہے۔ اسے معیار تک پہنچانے کے لئے بانیان کالج کو خلوص اور لگن کے ساتھ جدوجہد جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔

مدرسہ طبیہ۔ کلکتہ

یہ طبی اسکول 1921 میں آنریبل امیر السلام کی تحریک پر قائم ہوا تھا۔ جب اس کے قیام کی اطلاع تکمیل الطب کالج، لکھنؤ کے ذمہ داروں کو ملی تو انھوں نے اپنے آرگن خادم الاطباء کے ذریعہ اپنے تعاون کی پیش کش کی تھی۔ مدیر رسالہ 'کلکتہ میں طبی تعلیم' کے عنوان سے لکھتے ہیں

''ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آنریبل امیر السلام صاحب کی تحریک پر کلکتہ میں طبی تعلیم کا ایک مدرسہ قائم ہوا ہے۔ اگر یہاں کے منتظمین تکمیل الطب کالج، لکھنؤ کے مشوروں پر کام کریں اور اس کے اکیس سالہ تجربات سے فائدہ اٹھائیں تو انہیں بڑی مدد ملے گی۔'' [1]

مدرسہ طبیہ، کلکتہ کے قیام میں انجمن اطباء کلکتہ کی مساعی بھی شامل تھیں۔ یہاں تعلیم کی زبان عربی تھی۔ یہ مدرسہ بہت کم مدت کے لئے جاری رہا۔ [2]

حوالہ جات

1۔ خادم الاطباء لکھنؤ، جلد 2، شمارہ 9، ستمبر 1921، ص 4

2۔ آئینہ تاریخ طب از پروفیسر حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ، 2001، ص 386

کلکتہ یونانی میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل۔ کولکاتا

کلکتہ میں طبی تعلیم کی پہلی کوشش مدرسہ طبیہ کی شکل میں 1921 میں ہوئی تھی۔ پھر ربع صدی بعد تقریباً 1945 میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے احاطہ میں دوبارہ طبی تعلیم کا اجرا ہوا۔ مگر یہ دونوں ہی سلسلے دراز نہیں ہو سکے اور نامساعد حالات کی وجہ سے آغاز کے کچھ ہی دنوں بعد بند ہو گئے۔ اس ناخوشگوار واقعہ کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ یہ دونوں سلسلے بند ہونے کے باوجود اپنے پیچھے طبی تعلیم کی ضرورت کا احساس چھوڑ گئے۔ جب مغربی بنگال حکومت نے 1979 میں صوبہ میں طب کے فروغ اور نشو ونما کے لئے ''پچھم بنگو یونانی ایکٹ'' پاس کیا تو اس سے طب کی ترقی کی امید پیدا ہوئی۔ بہی خواہانِ طب نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ہندوستان کے اس بڑے تاریخی شہر میں طبی تعلیم کے اہتمام کے لئے از سرنو کوشش شروع کی۔ ان میں حکیم محمد ابراہیم جون پوری، حکیم زماں حسینی، حکیم محمد سعید خاں، حکیم محمد یوسف بخشی، حکیم حاجی محمد ایوب خاں، سعید احمد (سابق ایم ایل اے)، حکیم سالم ادیب، حکیم نہال احمد اور عبدالرؤف انصاری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، انھوں نے حکیم سید فیضان احمد کی سربراہی میں صوبہ میں طبی درسگاہ کے قیام کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا۔

مغربی بنگال کے طبی حلقہ میں حکیم سید فیضان احمد کا نام بہت نمایاں ہے، ان کا اصل وطن بہار ہے۔ وہ 1936 میں، قصبہ دانا پور میں پیدا ہوئے۔ والد حکیم مولوی وہاج الدین کے انتقال کے بعد ماموں نے، جو کلکتہ میں بغرض تجارت مقیم تھے، اپنے ساتھ رکھ کر تعلیم و تربیت کا

بندوبست کیا۔ حکیم صاحب نے کلکتہ میں ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی سے عربی زبان وادب اور علوم دینیہ اور راجستھان بورڈ سے فاضل طب کی سند حاصل کی۔ اس وقت ان کا شمار مغربی بنگال کی مشہور شخصیات میں ہے۔ وہ یونانی ادویہ کے بڑے تاجر کے علاوہ ایک عرصہ سے سی آئی ایم کے رکن اور اسٹیٹ یونانی کونسل کے صدر ہیں۔ انہی کی کوششوں سے 1984 میں صوبہ میں یونانی کونسل قائم ہوئی تھی، جس کے تحت پانچ ہزار سے زائد معالجین کا رجسٹریشن کرکے، انہیں مطب ومعالجہ کی اجازت عطا کی گئی تھی۔ حکیم سید فیضان احمد مغربی بنگال میں یونانی طب کے متعدد اعلیٰ مناصب پر فائز رہنے کے علاوہ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی بنگال شاخ کے جنرل سکریٹری ہیں۔ ان کی سرکردگی میں کانفرنس کی صوبائی شاخ کے ذریعہ 27 جنوری 1989 کو ''کلکتہ یونانی میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل'' کا قیام عمل میں آیا، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے قومی صدر حکیم عبدالحمید کے ہاتھوں رسم تاسیس انجام پائی۔ قیام کے تقریباً ساڑھے پانچ سال بعد سات جولائی 1994 کو یہاں درس وتدریس کا آغاز ہوا۔ یہ سلسلہ شروع ہونے کے تقریباً چار برس بعد 1998 میں کلکتہ یونیورسٹی سے اس کا الحاق عمل میں آیا اور 2002 میں کالج کا پہلا بیچ فارغ ہوا۔

اس کالج کو زمانہ قیام ہی سے طبی کانفرنس کی سرپرستی حاصل رہی ہے اور اس کے قیام میں کانفرنس کی جدوجہد کا اہم حصہ ہے۔ کلکتہ میں جب پہلی بار 23 مئی 1969 کو آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا تھا، اس موقع پر صدر کانفرنس نے صوبائی عوام اور حکومت کو طب کی تعلیمی ضرورت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا ''کلکتہ جیسے عظیم شہر اور علمی مرکز میں طبی کالج کا نہ ہونا بڑا مایوس کن ہے، مجھے امید ہے کہ یہاں کے باہمت لوگ ایک طبیہ کالج قائم کرنے کی کوشش کا آغاز کریں گے اور یہاں کی حکومت دل کھول کر ان کی مدد کرے گی تاکہ نئے یونانی معالجین کی تعداد میں اضافہ ہو اور یونانی طب کو وہ مقام حاصل ہو سکے جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہے''[1]۔

جب ایک دہائی بعد 27 دسمبر 1981 کو یہاں دوسری بار کانفرنس کا اجلاس ہوا تو حکیم عبدالحمید نے صدارتی خطبہ میں اس امر کی طرف پھر توجہ منعطف کرواتے ہوئے کہا تھا ''ریاست مغربی بنگال نے یونانی علاج سے متعلق پہلے ہی ایک قانون پاس کردیا ہے، تاہم اس پر عمل درآمد میں کافی تاخیر ہوگئی ہے اور اب وقت کی ضرورت ہے کہ ایکٹ کے بموجب فوری طور پر کم از کم کچھ ابتدائی

اقدامات کئے جائیں۔ طب یونانی کی تعمیر کے لئے ریاست میں ایک طبیہ کالج کی شدید ضرورت ہے تا کہ یونانی اطباء کی موجودہ پریشان کن قلت دور ہوسکے۔'' 2ے

اس کالج کے قیام سے لے کر تعمیر و ترقی کے ہر مرحلہ میں حکیم سید فیضان احمد کا بیش قدر حصہ ہے۔ وہ اس تحریک کے نہ صرف قائد تھے، بلکہ اس کے قائم ہونے کے بعد وہ مجلس منتظمہ کے سکریٹری کے ساتھ، پرنسپل کے بطور 2005 تک خدمت انجام دیتے رہے۔

2005 سے 2007 تک حکیم نذر عباس (علیگ) پرنسپل رہے۔ اس عرصہ میں انتظامی سطح پر کافی اختلافات رونما ہوئے۔ حتیٰ کہ ایک نئی مجلس منتظمہ وجود میں آگئی۔ انتظامیہ کا یہ نزاع عدالت تک جا پہنچا۔ بالآخر موجودہ انتظامیہ کے حق میں جس کے سربراہ حکیم سید فیضان احمد ہیں، عدالت کا فیصلہ ہوا۔

2007 سے 2010 کے درمیانی عرصہ کے لئے حکومت نے سی ایل بہانی کو ریسیور مقرر کر دیا تھا۔ انھوں نے کالج کا نظم و نسق جاری رکھنے کے لئے عارضی بندوبست کے طور پر دو سینئر اساتذہ حکیم حشمت اقبال عثمانی اور طبیبہ ریحانہ پروین کو یکے بعد دیگرے ٹیچر انچارج مقرر کیا۔ 19 مارچ 2010 سے کالج کے سینئر استاذ حکیم محمد ایوب بطور پرنسپل خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اس کالج کے اکثر اساتذہ نوجوان نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو توانائی سے بھرپور، اچھی علمی استعداد کے مالک ہیں۔ حکیم تاج الدین (علیگ) یہاں کے اساتذہ میں علمی صلاحیتوں کے لحاظ سے بہت ممتاز ہیں۔ ترجمہ و تالیف کے میدان میں ان کا جوہر خاص طور پر نظر آتا ہے۔ اب تک وہ کئی فارسی طبی تالیفات کو اردو جامہ عطا کر چکے ہیں۔

اس کالج میں درس و تدریس کا بہت عمدہ ماحول ہے۔ یہاں انفرااسٹرکچر سے متعلق بیشتر لوازم مہیا ہیں۔ کالج کو یہ معیاری صورت عطا کرنے میں حکیم سید فیضان احمد اور ان کے رفقاء کار جسٹس خواجہ یوسف، محمد امین (ایم پی)، حکیم عبدالقادر، کے کے حیدر صدیقی، انصار الحق، حکیم شرف الدین، حکیم مصطفیٰ اور حکیم ارشاد احمد خاں کی مساعی شامل ہیں۔

حالیہ برسوں میں صوبائی حکومت کی طرف سے ایک اہم پیش رفت یہ ہوئی کہ اس نے کالج کو اپنی تحویل میں لینے کے لئے اسٹینڈنگ کمیٹی کے ذریعہ پیش کردہ بل کو منظوری عطا کردی

ہے۔مگراس کا نوٹیفیکیشن ہونے سے پہلے ہی صوبہ میں حکومت تبدیل ہوگئی، جس کی وجہ سے یہ کام التوا کا شکار ہوگیا۔ورنہ اب تک یہ سرکاری تحویل میں آچکا ہوتا۔امید ہے کہ موجودہ حکومت سیاسی مصلحتوں سے اوپراٹھ کرمفادعامہ کے لئے جلد ہی زیرالتواء مسئلہ کا مناسب حل ڈھونڈ لے گی۔

قیام کے وقت یہ کالج کلکتہ یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ 2004 سے یہ ویسٹ بنگال یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز سے ملحق ہے۔ابتدأیہاں 30 طلبہ کے داخلہ کی اجازت تھی، اب اسے بڑھا کر 40 کردیا گیا ہے۔من حیث المجموع کالج کی پیش رفت قابل اطمینان ہے۔توقع ہے کہ سرکاری تحویل میں آنے کے بعد اس کے حالات مزید بہتر ہوں گے۔

حوالہ جات

1۔ خطبات حمیداز حکیم عبدالحمید، مرتبہ ڈاکٹر خاور ہاشمی، خواجہ پریس، دہلی، 1995، ص 206

2۔ ایضاً، ص 261

اجمل طبیہ کالج۔ بمبئ

1910 میں بمبئ میڈیکل یونین نے دیسی طبوں کو غیر علمی قرار دے کر ان کے حاملین کو حاصل جائز حقوق سے باز رکھنے کی حکومت سے سفارش کی۔ اس خبر سے طبی حلقوں میں بے چینی پیدا ہوگئی۔ اس نازک دور میں حکیم اجمل خاں آگے آئے، انھوں نے طبیبوں اور ویدوں کو آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کے بینر تلے جمع کر کے دیسی طبوں کے تحفظ کے لئے تحریک چھیڑی۔ اس کی وجہ سے نہ صرف دیسی طبوں کے حاملین کی شیرازہ بندی میں مدد ملی اور بمبئ میڈیکل یونین کی تحریک کو ناکام بنایا گیا، بلکہ دیسی طبوں کے حاملین کے اندر تحریکی اور تعلیمی ضرورت کا احساس بیدار کرنے میں بھی اس تحریک نے اہم کردار ادا کیا۔ قومی سطح پر ویدوں اور طبیبوں نے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی اس تحریک سے جڑ کر اسے مضبوط بنایا۔ اس کے اثر سے مقامی سطح پر کئی تنظیموں کا وجود عمل میں آیا، انھوں نے اپنے علاقوں میں طبی کاز کے لئے اہم کارنامے انجام دیئے۔ پنجاب، سندھ، لاہور اور مدراس وغیرہ میں ان علاقائی تنظیموں نے طبی تعلیم کی تنظیم اور تجدید کے سلسلہ میں جو کام کیے، اس کے بڑے مفید نتائج سامنے آئے۔

دوسرے علاقوں کی طرح بمبئ میں بھی اطباء کی جماعتیں قائم ہوئیں۔ مگر انھوں نے طبی تعلیم کا کام بہت دیر سے شروع کیا۔ چونکہ 1910 کی تحریک کا مرکز بمبئ تھا، اس لئے امید کی جارہی تھی کہ یہاں یہ کام سب سے پہلے شروع ہوگا۔ تاخیر کے باوجود ایک خوش آئند بات یہ ہے

کہ ہندوستان کی دوسری مقامی تنظیموں کی طرح جمعیت الاطباء بمبئی نے پہل کرتے ہوئے طب کے ایک تعلیمی ادارہ کا منصوبہ بنایا۔ اس کی کوشش سے ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرح بمبئی میں بھی طبی تعلیم کا آغاز ہوا۔ جمعیت الاطباء کی یہ تعلیمی تحریک حکیم اجمل خاں اور ان کے تعلیمی ادارہ سے انسپائرڈ تھی۔ ''الطبیب، لاہور'' کے اداریہ سے اس کالج کے متعلق درج ذیل تفصیلات سامنے آتی ہیں۔ مدیر رسالہ لکھتے ہیں:

''اس طبی تعلیم گاہ کی نسبت ہمیں جو تفصیلات فراہم ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اردو اور عربی ذرائع تعلیم ہوں گے۔ مدت تعلیم تین سال ہوگی اور نصاب کم و بیش وہی مقرر کیا گیا ہے، جو طبیہ کالج دہلی میں رائج ہے۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ جمعیت الاطباء بمبئی نے ابتداً یہ فیصلہ کیا تھا کہ تعلیم دن کے وقت دی جائے گی۔ لیکن بعد میں مقامی حالات کی مجبوریوں کی وجہ سے انہیں اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آئی اور اب دن کے بجائے صرف رات میں دو گھنٹہ تعلیم ہوا کرے گی''۔ 1

اجمل طبیہ کالج، بمبئی کے افتتاح کے لئے جمعیت الاطباء نے یکم مارچ 1938 کو ایک شاندار جلسہ کا اہتمام کیا۔ اس میں بمبئی کے عمائدین اور روسا کے علاوہ حکماء اور وید بڑی تعداد میں مدعو تھے۔ محمد یٰسین نوری وزیر محکمہ تعمیرات اس تقریب کے صدر تھے۔ انہی کے ہاتھوں افتتاح عمل میں آیا۔ انھوں نے پرنس بلڈنگ کی پہلی منزل کا دروازہ کھول کر افتتاح کی رسم انجام دی۔ بلڈنگ کے اس حصہ میں تعلیمی ساز و سامان، جسم انسانی کے تشریحی نقشہ جات، انسانی ڈھانچے اور درسی کتابوں کو سلیقہ سے سجایا گیا تھا۔ وزیر موصوف نے افتتاح کے بعد صدارتی تقریر فرمائی۔ ان کے بعد ڈاکٹر وید پوپٹ پربھورام، جو مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے ساتھیوں میں تھے، نے بھی اس موقع پر تقریر کی اور مفید مشورے دئے۔ فخر الحکماء رئیس الاطباء حکیم محمد سعید اجمیری اس کالج کے سرپرست تھے، مگر علالت کی وجہ سے وہ افتتاحی جلسہ میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ 2

جون 1938 سے اجمل طبیہ کالج بمبئی میں تعلیم کا آغاز ہوا، شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں اس کالج کے پہلے پرنسپل تھے۔ شروع میں رات نو بجے سے گیارہ بجے تک تعلیم ہوتی تھی۔ 3

اگرچہ یہ کالج محدود پیمانہ پر جاری ہوا تھا، اس کے باوجود اس کی اس اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے ذریعہ بمبئ جیسے اہم شہر میں، جہاں اب تک طب کی تعلیم کا کوئی نظم نہیں تھا، وہاں اس سلسلہ کا آغاز ہوا۔ یہ اس کا سب سے اہم پہلو ہے کہ اس کی وجہ سے طبی تعلیم کے اجملی سلسلہ کو ہندوستان کے دوسرے کئی علاقوں کی طرح بمبئ جیسے شہر میں دراز ہونے کا موقع ملا۔ اس کالج کے قیام سے مہاراشٹر کے دوسرے شہروں میں طبی تعلیم کی ضرورت کا احساس بیدار ہوا۔ بشمول بمبئ مہاراشٹر کے دیگر شہروں میں آج طب کے جو ادارے نظر آرہے ہیں، ان کے قیام میں کہیں نہ کہیں یہ کالج مؤثر رہا ہے۔ لہٰذا اجمل طبیہ کالج بمبئ کو مہاراشٹر میں طبی تعلیم کی خشت اول کے زاویہ سے دیکھے جانے کی ضرورت ہے۔ یہ کالج بمبئ کے بورڈ آف آیورویدک اینڈ یونانی میڈیسن سے منظور شدہ تھا۔ یہاں فاضل طب و جراحت کی سند دی جاتی تھی۔ اجمل طبیہ کالج بعد میں طبیہ کالج بمبئ کے نام سے مشہور ہوا۔

حوالہ جات

1۔ الطبیب لاہور، جلد 5، شمارہ 4، اپریل 1938، ص 6

2۔ ایضاً، ص 45

3۔ الطبیب لاہور، جلد 5، شمارہ 6، جون 1938، ص 47

یونانی میڈیکل کالج وجناح ہسپتال۔بمبئی

بمبئی میں قائم ہونے والا یہ دوسرا طبی کالج تھا، جو اجمل طبیہ کالج، بمبئی کے قیام کے تقریباً چار سال بعد 1941 میں قائم ہوا تھا، یہ محمد علی روڈ پر واقع تھا۔حکیم محمد مختار اصلاحی اس کالج میں اعزازی طور پر منافع الاعضاء پڑھایا کرتے تھے۔[1] وہ اس کالج کے بانیوں میں تھے، ان کے علاوہ اس کے قیام میں خواجہ عبدالحمید (سپلا والے) اور حکیم مرزا حیدر بیگ کی اہم مساعی ہیں۔

1947 میں تقسیم کے بعد پڑھے لکھے مسلمانوں کی بڑی تعداد پاکستان چلی گئی۔ہجرت کرنے والوں میں بمبئی کے لوگوں کی خاصی تعداد تھی۔اس کا واضح اثر یہاں کے تعلیمی اداروں پر پڑا۔اس سے یہاں کے دونوں طبیہ کالج بھی متاثر ہوئے۔درپیش حالات میں ایک ہی شہر میں دو طبی کالجوں کا جاری رہنا مشکل تھا، اس لئے یونانی میڈیکل کالج اور بمبئی طبیہ کالج کے طلبہ، اساتذہ اور اثاثہ جات کو ملا کر ضم کر دیا گیا تا کہ دونوں مل کر مستحکم صورت اختیار کر لیں۔مگر یہ تدبیر کارگر ثابت نہیں ہو پائی اور 1950 میں یہ متحدہ کالج نامساعد حالات کی وجہ سے بند ہو گیا۔گرچہ تقسیم کی وجہ سے ہندوستان کے کئی طبی کالج متاثر ہو کر بند ہوئے تھے، مگر اس کے بند ہونے سے مہاراشٹر جیسے صوبہ میں طبی تعلیم کا سلسلہ یکسر موقوف ہو گیا، جو کہ پہلے ہی بہت تاخیر سے شروع ہوا تھا۔یہاں DUSF کی سند دی جاتی تھی۔کالج کے بند ہونے کے بعد اس سے ملحق ہسپتال مزید کچھ دنوں جاری رہا، اس کی سرپرستی کالج وہسپتال بورڈ کے صدر خواجہ عبدالحمید (ڈائرکٹر سپلا ریمیڈیز)

اوران کے رفقاء حکیم یوسف نذیری (مستند طبیہ کالج قرول باغ۔ دہلی) اور حکیم محمد مختار اصلاحی (علیگ) کر رہے تھے۔ [2]

حوالہ جات

1۔ اطباء اوران کی مسیحائی (بحوالہ مصنف کے مختصر حالات زندگی از ناشر)، مؤلفہ حکیم محمد مختار اصلاحی، شائع کردہ اصلاحی یونانی طبی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی، 1987، ص8

2۔ یہ تفصیل حکیم شیخ محمد ارشد (سابق پرنسپل انجمن اسلام ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا طبیہ یونانی میڈیکل کالج، ممبئی) کی فراہم کردہ اطلاع پر مبنی ہے۔

انجمن اسلام ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا طبیہ یونانی میڈیکل کالج۔ ممبئی

1950 میں بمبئی میں جاری طبیہ کالج کے بند ہونے کے بعد یہاں طب کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس اہم شہر میں طبی درسگاہ کا نہ ہونا اور پہلے سے جاری کالج کا بند ہو جانا بے حد افسوسناک تھا۔ اس ضرورت کی طرف حکومت کو برابر متوجہ کیا جاتا رہا۔ بالآخر صوبہ کے وزیر صحت مسٹر کنم دار نے تیسرے پنج سالہ منصوبہ میں اس مطالبہ کو شامل کر کے ممبئی شہر کے شایان شان ایک طبی کالج قائم کرنے کا وعدہ کیا۔ ان کے ایما پر اس مجوزہ کالج کا ایک خاکہ بھی تیار کر کے حکومت کو پیش کیا گیا، لیکن بوجوہ اس سلسلہ میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ لہٰذا چار اکتوبر 1962 کو آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، شاخ مہاراشٹر کے عہدیداران کے ایک وفد نے وزیر صحت بی کے ساونت سے ملاقات کر کے ممبئی کے بند طبیہ کالج کو دوبارہ کھولنے کے لئے عرضداشت پیش کی۔ حکیم مرزا حیدر بیگ (صدر)، حکیم محمد یوسف نذیری (نائب صدر)، حکیم محمد مختار اصلاحی (جنرل سکریٹری)، حکیم گوپال سنگھ، حکیم محمد عثمان بانات والا، حکیم علی محمد جیوا بھائی، حکیم شمشاد علی اور سیٹھ عبدالخالق فیتا والے اس وفد میں خصوصی حیثیت میں شامل تھے۔ [1]

ایک عرصہ تک حکومت کو میمورنڈم اور عرضداشتیں پیش کرنے کا سلسلہ رہا۔ جب اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو ہمدردان طب کی ایک جماعت نے 1969 میں نجی وسائل سے ایک عمارت کرایہ پر لے کر طبی کالج جاری کر دیا۔ اس کے قیام میں حکیم محمد مختار اصلاحی، حکیم سید علی زیدی، حکیم عثمان اسماعیل بانات والا، حکیم ابرار حسین، ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا، ڈاکٹر باشی، حکیم جیوا بھائی وغیرہ کی مساعی بہت اہم ہیں۔ سات، آٹھ جون 1970 کو آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا دو روزہ اجلاس، صدر کانفرنس حکیم عبدالحمید کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ ممبئی میں طبی کانفرنس کی میٹنگ کے انعقاد کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ یہاں طبیہ کالج کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔[2]

جب 1969 میں دوبارہ طبیہ کالج کے قیام کا مسئلہ سامنے آیا تو حکیم محمد مختار اصلاحی نہ صرف اس تحریک میں پیش پیش رہے، بلکہ اعزازی طور پر پڑھانے کی ذمہ داری بھی قبول فرمائی۔ ان کی وابستگی کا یہ سلسلہ 1982 تک قائم رہا۔ اس دوران علم الادویہ، معالجات اور تاریخ طب جیسے مضامین ان کے درس میں شامل تھے۔ اس سے قبل جب 1941 میں یونانی میڈیکل کالج و جناح ہسپتال قائم ہوا تھا، اس وقت بھی وہ اعزازی مدرس تھے اور طلبہ کو منافع الاعضاء پڑھایا کرتے تھے۔[3]

کالج کے قیام کے بعد ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا طبیہ کالج بورڈ کے صدر، نیز کالج کے پرنسپل اور سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ ان کے زیر انصرام، طبیہ کالج و ہاسپٹل پبلک چیریٹیبل ٹرسٹ کی نگرانی میں داخلہ اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ ذمہ داروں کی مساعی سے 72-1971 میں مہاراشٹر فیکلٹی آف آیورویدک اینڈ یونانی سسٹم آف میڈیسن سے اس کا الحاق ہوا اور طے پایا کہ فارغین کو DUMS کی سند دی جائے گی۔ 1974 میں طلبہ کا پہلا بیچ فارغ ہوا۔ 1971 میں سی سی آئی ایم کی منظوری سے BUMS کا نصاب شروع ہوا۔ مہاراشٹر فیکلٹی کی ماتحتی میں اس کے داخلے اور امتحانات کی کارروائی چلتی رہی۔ 1982 میں یہ ممبئی یونیورسٹی سے ملحق ہوا۔ اس الحاق میں مہاراشٹر کے گورنر اور چانسلر آف یونیورسٹیز ایر چیف مارشل کرنل عبداللطیف کے ایما کا بڑا دخل تھا۔ 1977 کے صوبائی انتخاب میں کامیابی حاصل کر کے ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا جب

انجمن اسلام ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا طبیہ یونانی میڈیکل کالج۔ ممبئی

1950 میں ممبئی میں جاری طبیہ کالج کے بند ہونے کے بعد یہاں طب کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس اہم شہر میں طبی درسگاہ کا نہ ہونا اور پہلے سے جاری کالج کا بند ہو جانا بے حد افسوسناک تھا۔ اس ضرورت کی طرف حکومت کو برابر متوجہ کیا جاتا رہا۔ بالآخر صوبہ کے وزیر صحت مسٹر کنم دار نے تیسرے پنج سالہ منصوبہ میں اس مطالبہ کو شامل کر کے ممبئی شہر کے شایان شان ایک طبی کالج قائم کرنے کا وعدہ کیا۔ ان کے ایماپر اس مجوزہ کالج کا ایک خاکہ بھی تیار کر کے حکومت کو پیش کیا گیا، لیکن بوجوہ اس سلسلہ میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ لہٰذا چار اکتوبر 1962 کو آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، شاخ مہاراشٹر کے عہدیداران کے ایک وفد نے وزیر صحت بی کے ساونت سے ملاقات کر کے ممبئی کے بند طبیہ کالج کو دوبارہ کھولنے کے لئے عرضداشت پیش کی۔ حکیم مرزا حیدر بیگ (صدر)، حکیم محمد یوسف نذیری (نائب صدر)، حکیم محمد مختار اصلاحی (جنرل سکریٹری)، حکیم گوپال سنگھ، حکیم محمد عثمان بانات والا، حکیم علی محمد جیوا بھائی، حکیم شمشاد علی اور سیٹھ عبدالخالق فیتا والے اس وفد میں خصوصی حیثیت میں شامل تھے۔[1]

ایک عرصہ تک حکومت کو میمورنڈم اور عرضداشتیں پیش کرنے کا سلسلہ رہا۔ جب اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو ہمدردان طب کی ایک جماعت نے 1969 میں نجی وسائل سے ایک عمارت کرایہ پر لے کر طبی کالج جاری کر دیا۔ اس کے قیام میں حکیم محمد مختار اصلاحی، حکیم سید علی زیدی، حکیم عثمان اسماعیل بانات والا، حکیم ابرار حسین، ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا، ڈاکٹر باشی، حکیم جیوا بھائی وغیرہ کی مساعی بہت اہم ہیں۔ سات، آٹھ جون 1970 کو آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا دو روزہ اجلاس، صدر کانفرنس حکیم عبدالحمید کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ ممبئی میں طبی کانفرنس کی میٹنگ کے انعقاد کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ یہاں طبیہ کالج کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔[2]

جب 1969 میں دوبارہ طبیہ کالج کے قیام کا مسئلہ سامنے آیا تو حکیم محمد مختار اصلاحی نہ صرف اس تحریک میں پیش پیش رہے، بلکہ اعزازی طور پر پڑھانے کی ذمہ داری بھی قبول فرمائی۔ ان کی وابستگی کا یہ سلسلہ 1982 تک قائم رہا۔ اس دوران علم الادویہ، معالجات اور تاریخ طب جیسے مضامین ان کے درس میں شامل تھے۔ اس سے قبل جب 1941 میں یونانی میڈیکل کالج و جناح ہسپتال قائم ہوا تھا، اس وقت بھی وہ اعزازی مدرس تھے اور طلبہ کو منافع الاعضاء پڑھایا کرتے تھے۔[3]

کالج کے قیام کے بعد ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا طبیہ کالج بورڈ کے صدر، نیز کالج کے پرنسپل اور سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ ان کے زیر انصرام، طبیہ کالج و ہاسپٹل پبلک چیریٹیبل ٹرسٹ کی نگرانی میں داخلہ اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ ذمہ داروں کی مساعی سے 72-1971 میں مہاراشٹر فیکلٹی آف آیورویدک اینڈ یونانی سسٹم آف میڈیسن سے اس کا الحاق ہوا اور طے پایا کہ فارغین کو DUMS کی سند دی جائے گی۔ 1974 میں طلبہ کا پہلا بیچ فارغ ہوا۔ 1971 میں سی سی آئی ایم کی منظوری سے BUMS کا نصاب شروع ہوا۔ مہاراشٹر فیکلٹی کی ماتحتی میں اس کے داخلے اور امتحانات کی کارروائی چلتی رہی۔ 1982 میں یہ ممبئی یونیورسٹی سے ملحق ہوا۔ اس الحاق میں مہاراشٹر کے گورنر اور چانسلر آف یونیورسٹیز ایر چیف مارشل کرنل عبداللطیف کے ایما کا بڑا دخل تھا۔

1977 کے صوبائی انتخاب میں کامیابی حاصل کر کے ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا جب

وزیر مملکت بن گئے تو ڈاکٹر حکیم حسن باپا نے ان کی جانشینی کی۔ لیکن عدیم الفرصتی کی وجہ سے وہ 1980 میں پرنسپل شپ اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ ان کے بعد حکیم شیخ محمد ارشد (متوطن چھاؤں، ضلع اعظم گڑھ۔ یوپی) نے عبوری طور پر ذمہ داری سنبھالی۔ 1981 میں انھوں نے مستقل پرنسپل اور سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے چارج سنبھالا اور ستمبر 2001 تک وہ ان عہدوں پر فائز رہے۔ یکم جون 2005 سے اگست 2007 تک وہ کالج کے ڈین بھی تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد پھر 2012 سے بحیثیت ڈین وہ کالج سے وابستہ ہیں۔ حکیم معین الدین اصلاحی، حکیم شاہ عالم، حکیم بدر السلام عثمانی، حکیم عبدالمنان انصاری اور حکیم عبدالمبین خاں وغیرہ یہاں کے اہم اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

1971 میں انجمن خیر الاسلام نے کالج کو اپنی تحویل میں لے کر اسے اپنے اداروں کے زمرہ میں شامل کرنا چاہا تھا۔ مگر بعض تکنیکی دشواریوں کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہو پایا۔ لیکن انجمن خیر الاسلام کے ذمہ داروں کی سرپرستی اسے حاصل رہی۔ ان کی وجہ سے یہ کالج ایک عرصہ تک گھیلا بائی اسٹریٹ میں واقع حبیب سیٹھ کی تین منزلہ عمارت میں جاری رہا۔ لیکن بڑھتی ضرورتوں کے لئے جب یہ جگہ تنگ پڑنے لگی تو 78-1977 میں یہ کالج ناگپاڑہ جنکشن پر واقع بیت الامان بلڈنگ میں منتقل ہو گیا۔

1993 میں انجمن اسلام نے اسے اپنی تحویل میں لے کر اس کے انتظامات کے لئے ایک بورڈ کی تشکیل کی۔ انجمن اسلام کی ماتحتی میں آنے کے بعد 1998 میں یہ کالج اندھیری ورسوا کے موجودہ کیمپس میں منتقل ہوا۔ کالج کے بہی خواہ حاجی عبدالرزاق کالسیکر کے مالی تعاون سے جنوری 2002 میں اندھیری ورسوا میں انجمن اسلام کے باولہ کمپاؤنڈ میں تعمیرات کا کام پورا ہوا۔ ڈاکٹر ظہیر اسحاق قاضی (معروف ریڈیولوجسٹ) 1995 میں کالج بورڈ کے چیئرمین منتخب ہوئے تھے، وہ اس وقت بورڈ کے صدر ہیں اور ڈاکٹر عبدالرؤف اس کے چیئرمین ہیں۔ ڈاکٹر نسرین عبدالمبین خاں یکم جولائی 2014 سے کالج کی پرنسپل ہیں۔ ان سے پہلے یہاں ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا، ڈاکٹر حکیم حسن باپا، حکیم شیخ محمد ارشد، حکیم بدر السلام عثمانی، حکیم محمد شاہ عالم، حکیم عبدالمبین خاں، حکیم شارق ظفر، حکیم ہارون رشید منصوری بطور پرنسپل خدمت انجام دے چکے ہیں۔

1998 میں مہاراشٹر گورنمنٹ کے گزٹ نوٹیفیکیشن سے مہاراشٹر یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز (MUHS) ناسک کا قیام عمل میں آیا، تب سے یہ کالج اس یونیورسٹی سے ملحق ہے۔ 2003 میں یہاں علم الادویہ، حفظان صحت، امراض نسواں وقبالت اور علم الجراحت میں سی سی آئی ایم کی منظوری سے، ممبئی یونیورسٹی کی نگرانی میں پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم کا آغاز ہوا مگر یہ سلسلہ دراز نہیں ہوسکا اور وسائل کی کمی کے باعث جلد ہی بند ہوگیا۔

اس کالج کی تعمیر و ترقی میں ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا اور حاجی عبدالرزاق کالسیکر کا گرانقدر تعاون ہے، اس لیے ان کے ناموں سے کالج منسوب کرنے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ 2000 سے یہ کالج انجمن اسلام ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا طبیہ یونانی میڈیکل کالج اینڈ حاجی عبدالرزاق کالسیکر طبیہ یونانی اسپتال کے نام سے موسوم ہے۔

حوالہ جات

1۔ مسیحا بمبئی۔ پندرہ روزہ (مدیر حکیم محمد مختار اصلاحی)، جلد 5، شمارہ 20، 15/ اکتوبر 1962، ص 10

2۔ ہمدرد۔ دہلی (پندرہ روزہ) جلد 14، شمارہ 12، 15/ جون 1970، ص 1 اور 7

3۔ اطباء اور ان کی مسیحائی (بحوالہ مصنف کے مختصر حالات زندگی از ناشر)، مولفہ حکیم محمد مختار اصلاحی، شائع کردہ اصلاحی یونانی طبی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی، 1987، ص 8

محمدیہ طبیہ کالج۔ مالیگاؤں

محمدیہ طبیہ کالج کا قیام مولانا مختار احمد ندوی (30/جون 1930۔ 9/ستمبر 2007) حکیم محمد مختار اصلاحی (15 فروری 1915۔11 جون 2006) اور محمد خلیل سیٹھ (1924-1983) کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ ہے۔ مولانا ندوی کا شمار جمعیت اہل حدیث کے اکابرین میں تھا، بلاد خلیج کے علماء اور تجار سے ان کے بہت اچھے مراسم تھے۔ ان کے تعاون سے مولانا نے ہندوستانی مسلمانوں کی دینی وعصری تعلیم کے لئے کئی ادارے قائم کیے۔ انہیں شعبۂ صحت اور طب سے خاص دلچسپی تھی۔ جامعہ سلفیہ بنارس میں طبیہ کالج کے قیام میں ان کا اہم تعاون رہا ہے۔ انھوں نے اپنے آبائی قصبہ مئوناتھ بھنجن میں عالیہ اسپتال قائم کیا تھا۔ اس سے ملحق وہ ایک طبی درسگاہ قائم کرنے کا منصوبہ رکھتے تھے، جو بوجوہ پورا نہ ہوسکا۔ حکیم محمد مختار اصلاحی مہاراشٹر کی نہایت قد آور طبی شخصیت تھے، صوبہ میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی نمائندگی کی وجہ سے انہیں بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ یہاں طبی تعلیم کے فروغ اور طبی کانفرنس کو منظم کرنے میں ان کی بڑی شاندار خدمات ہیں۔ حاجی محمد خلیل سیٹھ مالیگاؤں کے عمائدین میں تھے، ان کا شمار یہاں کی سیاسی، سماجی اور ملی زندگی کے باحیثیت لوگوں میں تھا۔ سیٹھ صاحب کا آبائی وطن مئوناتھ بھنجن تھا۔ ان کے بزرگ ہجرت کر کے مالیگاؤں آئے تھے۔

مولانا مختار احمد ندوی، حکیم محمد مختار اصلاحی اور حاجی محمد خلیل سیٹھ کی کوششوں سے 1981

میں محمدیہ طبیہ کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اس نوزائیدہ کالج کو سنبھالنے کے لئے مضبوط ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ اصلاحی صاحب کے بڑے صاحبزادے حکیم فیاض عالم نے پرنسپل کی ذمہ داری سنبھال کر اس اہم مسئلہ کو حل کر دیا۔ ان کی پرنسپل شپ میں یہاں تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس کالج کو استحکام بخشنے میں حکیم فیاض عالم کا قابل قدر کردار ہے۔

اس کالج میں تعلیم کی ابتداء پری طب سے ہوئی تھی۔ حکیم وحید اللہ فاروقی، حکیم عبدالسلام (استاذ نباتیات)، مولانا عزیز الرحمٰن (استاذ عربی)، ڈاکٹر لطف اللہ (استاذ کیمسٹری)، محمد قدوس (استاذ حیوانیات)، انصاری محمد یوسف (استاذ انگریزی)، انصاری سراج احمد (استاذ طبعیات) پری طب کی تعلیم کے لئے منتخب ہوئے تھے۔ 1998 تک یہاں پری طب کا سلسلہ رہا، اس کے بعد اسے ختم کر کے براہ راست بی یو ایم ایس کی تعلیم دی جانے لگی۔ مہاراشٹر کونسل آف انڈین میڈیسن سے منظوری کے بعد 1984 میں پونہ یونیورسٹی سے اس کا الحاق ہوا۔ اسی سال صوبائی حکومت نے کالج کے مالی تعاون کے لئے گرانٹ جاری کی۔ 1986 میں 27/طلبہ پر مشتمل پہلے بیچ نے تعلیم مکمل کی۔

جب کالج میں باضابطہ تعلیمی سلسلہ قائم ہوگیا تو حکیم فیاض عالم عہدۂ پرنسپلی سے سبکدوش ہو کر اصلاحی دواخانہ ممبئی چلے گئے۔ ان کے بعد کئی اساتذہ اس ذمہ داری پر مامور ہوئے، ان میں حکیم عبدالسلام، حکیم ابوبکر، حکیم شہاب الدین، حکیم وحید اللہ فاروقی، حکیم اظہر حسن، حکیم ابواللیث اعظمی، حکیم ریاض احمد اور حکیم عبداللہ انصاری کے نام شامل ہیں۔ ان سب میں حکیم اظہر حسن کو پرنسپل کے عہدہ پر سب سے زیادہ فائز رہنے کا موقع ملا۔ وہ پہلی بار 1995 سے 1999 تک، دوسری بار 2005 سے 2010 تک کالج کے پرنسپل رہے، اس عرصہ میں انھوں نے یہاں کے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے میں اچھا کردار ادا کیا ہے۔ ان کا شمار کالج کے باصلاحیت اساتذہ میں ہے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تربیت یافتہ ہیں۔ یہاں سے انھوں نے بی یو ایم ایس اور ایم ڈی کی ہے۔

2001 میں اس کالج کو پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم کے لئے اجازت ملی۔ 2003 سے شعبۂ علم الادویہ اور امراض نسواں واطفال میں ایم ڈی کا داخلہ ہو رہا ہے۔ تین دہائیوں کے سفر

میں اس کالج کی جو حصولیابیاں ہیں، وہ قابل تحسین ہیں۔ گریجویشن تک یہاں اچھی تعلیم ہوتی ہے، لیکن پی جی شعبوں کا معاملہ زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی یہاں اس معیار کے اساتذہ کا انتظام نہیں ہے۔ حالانکہ کالج کے سامنے وسائل کی دقت نہیں ہے۔ حکومت کی معتد بہ گرانٹ کے ساتھ اسے خلیجی ملکوں سے بھی خاصا تعاون مل جاتا ہے۔ ان سب کے علاوہ خود طلبہ سے لی جانے والی فیس کالج کی مد کو ایک بڑی رقم فراہم کر رہی ہے۔ اس لئے کالج انتظامیہ معقول مشاہروں پر اچھے اور باصلاحیت اساتذہ کی خدمات حاصل کر کے ایم ڈی کے تعلیمی معیار کو بہتر بنا سکتی ہے۔ اس کے لئے یہ مسئلہ بہت آسان ہے، لیکن اس جانب اس کی توجہ نسبتاً کم ہے۔ مولانا مختار احمد ندوی کے بعد کالج کے انتظامی امور ان کے بیٹے ارشد مختار کے ہاتھوں میں ہیں۔ لیکن اب تک ان میں کالج کے تئیں وہ جذبہ پیدا نہیں ہو سکا ہے، جو ان کے والد مولانا مختار احمد ندوی کے اندر تھا، مولانا ارشد مختار کو خلف رشید ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کالج پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کالج میں بہت آگے جانے کی صلاحیت ہے، لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کے ذمہ دار اسے خاندانی میراث کے بجائے ملی امانت سمجھ کر اپنے فرائض انجام دیں۔

چند تشنہ امور کے باوجود مہاراشٹر میں یونانی طب کی فضا بنانے میں اس کالج کا جو حصہ ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ اس کالج کے ذریعہ صوبہ کے ایک بڑے حصہ میں یونانی طب کی اشاعت ہوئی ہے، خصوصاً مالیگاؤں اور اس کے اطراف کے طبی شائقین کو اپنے علاقہ میں رہ کر یونانی طب کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔

زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج۔ پونہ

پونہ شہر کے قلب میں واقع اعظم کیمپس، پونہ کالج سے متصل 127 ایکڑ رقبہ پر محیط ہے۔ یہ گجرات کے مشہور تاجر حاجی غلام محمد اعظم کے نام موسوم ہے، انھوں نے یہ قطعۂ آراضی مسلم تعلیمی اداروں کے لئے وقف کی تھی۔ حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ اس کے نظم ونسق کی نگراں ہے۔ اس وقت یہ کیمپس 22 سے زائد پروفیشنل اور کئی غیر پروفیشنل کالجوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کے ادارے بہتر انتظام اور معیار تعلیم کے لئے پورے مہاراشٹر میں شہرت رکھتے ہیں۔ اسی کیمپس میں 1984 میں زیڈ وی ایم (زلیخابائی ولے محمد) یونانی میڈیکل کالج، پونہ کا قیام ہوا تھا۔ اس کا اہم مقصد اردو میڈیم کے طلبہ کے لئے اعلیٰ پیشہ وارانہ تعلیم کے مواقع فراہم کرنا اور روزگار و معاش کے اعتبار سے انہیں خود کفیل بنانا تھا۔ اس کے بانیوں میں ڈاکٹر اے آر شیخ کا نام سب سے اہم ہے، انھوں نے پونہ کے مخیر اور طب و تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب پی اے انعامدار، ڈاکٹر این وائی قاضی، عابدہ انعامدار، منور پیر بھائی، ایس ایم اقبال، صالح محمد خاں، مرحوم امین حزیںؔ اور مرحوم فقیر محمد شیخ کے تعاون سے یہ طبی درسگاہ قائم کی تھی۔ اس کا سنگ بنیاد معروف فلم اداکار دلیپ کمار (محمد یوسف خاں) اور ان کی اہلیہ اداکارہ سائرہ بانو نے نصب کیا تھا۔

1984 میں یہ کالج نیم پختہ دیواروں اور کھپریل سے بنے چند کمروں میں شروع ہوا تھا۔ لیکن 1991 میں رنگون والا فاؤنڈیشن اور ورلڈ میمن فاؤنڈیشن کے تعاون سے تعمیر جدید

عمارت میں منتقل ہوگیا۔ پروفیسر جلال الدین تکمیلی (متوطن سیتاپور، یوپی) کالج کے پہلے استاذ اور پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس کالج کی تعمیر وترقی کے علاوہ پونہ شہر میں یونانی طب کی فضا قائم کرنے میں ان کا اہم حصہ ہے۔ انھوں نے اپنے کلینکی تجربات اور معمولات کو 'مجربات تکمیلی' کے نام سے شائع کردیا ہے۔ انہیں پونہ میں یونانی معالج کی حیثیت سے جو شہرت حاصل ہے وہ باعثِ رشک ہے۔

حکیم جلال الدین تکمیلی کے بعد حکیم عبدالسلام (1985 تا 1987)، حکیم نذیر یوسفی (1987 تا 1992)، حکیم تسخیر احمد فہمی (1992 تا 1995 دوسری میقات 1997 تا 1999)، حکیم خورشید عالم (1995 تا 1996)، حکیم سید طاہر علی بلگرامی (1999 تا 2009)، حکیم انصاری عبداللہ (2009 تا 2010) کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ 2010 سے پروفیسر حکیم جلیس احمد یہاں کے پرنسپل ہیں، وہ شعبۂ علم الادویہ کے صدر بھی ہیں۔ ان میں علمی اور انتظامی دونوں صلاحیتیں بہت اچھی ہیں، ان اوصاف کے ساتھ وہ اعلیٰ اخلاقی جوہر سے بھی متصف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے طلبہ، اساتذہ اور انتظامیہ ہر حلقہ میں وہ مقبول ہیں۔ اس کالج کے شعبۂ معالجات اور حفظان صحت میں ایم ڈی کی شروعات 2006 سے ہوگئی تھی۔ 2011 سے ایم ایس کی تعلیم بھی ہورہی ہے۔ اس شعبہ کے صدر حکیم منظور احمد ہیں۔ وہ اچھی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی یہاں آمد سے جراحت کی تعلیم کا معیار کافی بہتر ہوا ہے۔

زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج کا قیام ڈاکٹر اے آر شیخ کی تحریک پر عمل میں آیا تھا۔ وہ کالج کی مجلس منتظمہ کے پہلے صدر تھے۔ وہ اکتوبر 1984 سے جون 1994 تک مسلسل دس برس صدر رہے، پھر اپریل 1995 سے اپریل 2000 تک دوبارہ صدر رہے۔ جون 1994 سے اپریل 1995 تک، پھر جون 2001 سے نومبر 2010 تک پی اے انعامدار نے انتظامی مجلس کے صدر کے طور پر خدمت انجام دی۔ ان کے بعد ڈاکٹر این وائی قاضی صدر منتخب ہوئے، تاحال وہ منصبِ صدارت پر فائز ہیں۔ مذکورہ سبھی صدور کالج کے بانیوں میں ہیں اور بحیثیت صدر ان سب کی خدمات اہم ہیں، لیکن پی اے انعامدار کا زمانۂ صدارت کالج کی تعمیر وترقی کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہے۔

ہندوستان کی طبی درسگاہوں میں زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج کئی لحاظ سے ممتاز

ہے۔اسے یہ حیثیت عطا کرنے میں پی اے انعامدار کا کردار بہت اہم ہے، انہیں پونہ کا سرسید کہا جاتا ہے۔وہ واقعی اس خطاب کے حق دار ہیں، وہ ایک جدت پسند ماہر تعلیم ہیں۔ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کئی بڑے اداروں کے ذریعہ کیا گیا ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ وغیرہ کی انتظامی رکنیت سے سرفراز کیا جانا اعتراف کی مثالیں ہیں۔ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تعلیم کے معاصر تقاضوں کو سمجھتے ہیں، اس کا اظہار زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج اور اعظم کیمپس کے اداروں کے تعلیمی انتظامات سے ہوتا ہے۔

زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج میں تعلیم وتربیت کا انداز بڑا منفرد ہے۔یہاں سبجکٹ کی تعلیم کے ساتھ ذہنی اور فکری تربیت کے ذریعہ طالب علم کی شخصیت کو نکھارنے اور اسے زمانہ کے جدید رویوں کے مطابق بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں اضافی طور پر پرسنالٹی ڈیولپمنٹ پروگرام، انگریزی بول چال کی مشق اور بقدر ضرورت کمپیوٹر کی تعلیم ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے۔سال آخر کے طلبہ کو ڈرائیونگ کی مشق کراکے، انہیں گورنمنٹ سے لائسنس دلوایا جاتا ہے۔ ان اضافی لوازمات کا مقصد یہ ہے کہ وہ بھی چیزیں جو اعلیٰ سماجی معیار کی علامت سمجھی جاتی ہیں، ان سے طلبہ کو آراستہ کرکے سماجی دھارے کا حصہ بنایا جائے۔وقت کے تقاضوں کو محسوس کرنے میں یہ کالج دوسری طبی درسگاہوں پر سبقت رکھتا ہے۔ یہاں پروجیکٹر کے ذریعہ تعلیم، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی سہولیات اس وقت سے مہیا ہیں، جب یونیورسٹیوں تک میں ان کا چلن عام نہیں تھا۔یہاں کے مخصوص طرز تعلیم کا اثر ہے کہ اس کالج کے طلبہ عملی زندگی میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔جب کہ دوسرے کالجوں کے فارغین زیادہ فنی واقفیت کے باوجود پریکٹیکل لائف میں ان کی طرح کامیابی کا مظاہرہ نہیں کرپاتے۔اس لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس طرز پر دوسری طبی درسگاہوں میں بھی شخصی تربیت پر توجہ دی جائے تاکہ طلبہ خود کو کمتر سمجھنے کے احساس سے اوپر اٹھ کر معاصر دنیا میں مسابقتی جذبہ کے ساتھ آگے بڑھ سکیں۔

راقم کی عملی زندگی کا آغاز اسی کالج سے ہوا ہے۔تقریباً ایک سال (2003-2004) اس سے وابستہ رہنے کی وجہ سے اسے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔اس کالج کا شعبۂ علم الادویہ دوسرے شعبہ جات کے مقابلہ میں بے حد منظم اور ترقی یافتہ ہے۔اس کا سہرا حکیم شارق ظفر (سابق

صدر شعبہ) اور حکیم جلیس احمد (موجودہ صدر شعبہ) کے سر ہے۔ شعبہ کا ہربل گارڈن مثالی نوعیت کا ہے۔ ہندوستان کے کسی بھی طبی ادارے میں اس معیار کا نباتی باغ نہیں ہے۔ اسے بہتر نظم ونسق کے لئے کئی بار پونہ میونسپل کارپوریشن کی طرف سے ایوارڈ اور توصیفی سند سے نوازا گیا ہے۔ شناخت ادویہ کی پریکٹیکل کلاس اسی گارڈن میں ہوتی ہے۔ اس کے ایک گوشہ میں محراب نما حصہ ہے اس کے وسط میں سنگ مرمر کی خوبصورت ٹیبل ہے۔ اس پر پودے کا گملا رکھ کر شناخت کے ضروری متعلقات سے طلبہ کو روشناس کرایا جاتا ہے۔ میری اس شعبہ سے وابستگی کے زمانہ میں یہاں ساڑھے تین سو نباتی اقسام کے پانچ سو پودے تھے۔ اس کے علاوہ شعبہ کے ہربیریم میں نباتی ادویہ کا بہت اچھا ذخیرہ ہے، جہاں نصاب میں شامل ادویہ کے نمونے بڑے سلیقے سے جمع کئے گئے ہیں۔ کالج ہاسپٹل میں استعمال ہونے والی ساری دوائیں شعبہ کی صیدلہ لیب میں تیار ہوتی ہیں، اس سے طلبہ کو یونانی دوا سازی سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کالج سے وابستگی کے زمانہ میں ہربل گارڈن، ہربیریم اور صیدلہ انچارج کے طور پر مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔

کالج کا ہاسپٹل بڑے اچھے معیار کا ہے۔ اس میں قدیم وجدید دونوں طرح کے علاج کی سہولت ہے۔ نظامیہ طبی کالج، حیدرآباد کے بعد زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج دوسرا ادارہ ہے، جہاں علاج بالتدبیر کا منظم شعبہ ہے۔ جب کہ اکثر طبی کالجوں میں اس کی تعلیم صرف علمی مضمون کے طور پر ہوتی ہے۔ یہاں شعبۂ علم الادویہ کے زیر نگرانی برص کی او پی ڈی کا علاحدہ نظم ہے۔ اس میں پونہ اور اس کے اطراف کے مریضوں کا مرجوعہ رہتا ہے۔

کالج میں دوسری نسل کے اساتذہ کی تقرری کے بعد تعلیمی ماحول مزید بہتر ہوا ہے۔ حکیم جلیس احمد، حکیم جمال اختر (سابق استاذ)، مولانا محمد زید قاسمی، طبیبہ فرح رضوان، طبیبہ غزالہ ملا، حکیم رفیع احمد چودھری، حکیم ارشد پٹھان، حکیم خان محمد قیصر (سابق استاذ)، حکیم منظور احمد وغیرہ بڑی اچھی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی وجہ سے کالج میں علمی ماحول کو فروغ مل رہا ہے۔

زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج صوبہ کے دوسرے طبی کالجوں کی طرح ناسک یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز سے ملحق ہے۔ اس کالج کو مہاراشٹر حکومت کا جزوی مالی تعاون حاصل ہے۔ بقیہ مصارف کی تکمیل کالج اپنے ذرائع سے کرتا ہے۔ کالج کی طالبات کے لئے کیمپس کے اندر ہی

رہائش کا نظم ہے۔ کالج میں ڈریس کوڈ کی پابندی کا جس قدر التزام ہے، کسی اور طبی کالج میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اس کالج کے فارغین نے 2003 میں ایکس اسٹوڈنٹ ایسوسی ایشن (ESA) کے نام سے ایک رجسٹرڈ تنظیم قائم کی ہے۔ پی اے انعامدار اس کے سرپرست ہیں۔ طبی تقریبوں کا انعقاد، صوبہ کے مختلف حصوں میں یونانی طریقۂ علاج کا فروغ، عوامی سطح پر اس کا تعارف، یونانی طب کے ضرورت مند طلبہ کی مالی اعانت، دوسری طبوں سے اشتراک، مختلف ہندوستانی زبانوں خصوصاً انگریزی اور اردو میں جرنل، میگزین اور نیوز لیٹر وغیرہ کی اشاعت ESA کے اہم مقاصد ہیں۔ یہ ایک فعال تنظیم ہے۔ قیام کے بعد اس کا پہلا پروگرام ممبئی کے پانچ ستارہ ہوٹل تاج لینڈ اینڈ میں ہوا تھا۔ اس تقریب میں صوبہ کے نائب وزیر اعلیٰ بھجبل مہمان خصوصی اور معروف فلمی اداکار قادر خان مہمان اعزازی تھے۔ منتظمین کی دعوت پر راقم حروف نے بھی اس تقریب میں شرکت کی تھی۔ یہ تنظیم پابندی سے سالانہ سی ایم ای سیمینار کا انعقاد کرتی ہے۔ اس کے ذریعہ Health Update کے نام سے ایک مجلہ شائع ہو رہا ہے۔ اس میں تحقیقی مقالوں اور عام معلوماتی مضامین کے ساتھ ESA کی سرگرمیوں کا احاطہ ہوتا ہے۔ اس تنظیم نے اقرا فاؤنڈیشن کے اشتراک سے رفاہ عام کے لئے اقرا یونانی کلینک قائم کی ہے۔ یہ تنظیم ضرورت مند طلبہ کی مالی امداد اور طب میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والوں کی تحسین و پذیرائی کرتی ہے۔

علمی ماحول، معیار تعلیم، وسائل اور نظم و نسق وغیرہ کے لحاظ سے زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج مثالی حیثیت کا حامل ہے، نہ صرف مہاراشٹر بلکہ ہندوستان کی طبی درسگاہوں میں یہ اپنے طرز کا ایک منفرد ادارہ ہے۔ اسے اس مقام تک پہنچانے میں انتظامیہ، اساتذہ اور طلبہ سبھی کا حصہ ہے۔

تاج طبیہ کالج ورشید یہ ہاسپٹل۔ناگ پور

اسے جامعہ عربیہ اسلامیہ، ناگ پور کے مہتمم مفتی عبدالقدیر خاں نے 1990 میں قائم کیا تھا۔ یہ کالج چشتیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ تاج الدین اولیاء عرف تاج الدین بابا (1925-1868) کے نام سے موسوم ہے، ان کا مزار ناگ پور میں مرجع خلائق ہے اور رشیدیہ ہاسپٹل بانی کالج مفتی عبدالقدیر کے والد مفتی عبدالرشید خاں کے نام منسوب ہے۔

اس کالج کے بانی مفتی عبدالقدیر خاں کا شمار ناگ پور کے مسلم مشاہیر میں ہے۔ ان کے والد مفتی عبدالرشید خاں فتح پور (الہ آباد، یوپی) سے ناگ پور آئے تھے۔ انھوں نے یہاں کے مسلمانوں کی دینی تعلیم کے لئے جامعہ عربیہ اسلامیہ، ناگ پور کے نام سے ایک درسگاہ قائم کی تھی۔ مفتی عبدالقدیر خاں اسی مدرسہ کے فارغ ہیں۔ بعد میں انھوں نے جامعہ نعیمیہ مرادآباد میں داخلہ لیا۔ یہاں سے فراغت کے بعد ناگ پور سے گریجویشن کیا۔

مفتی عبدالقدیر خاں ناگ پور اور مہاراشٹر کے مسلم بچوں کے لئے دینی تعلیم کے ساتھ طبی تعلیم کا بھی اہتمام کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس منصوبہ کی برآوری کے لئے جامعہ عربیہ رشیدیہ ٹرسٹ کی تشکیل کی، اس کے زیر اہتمام 1990 میں تاج طبیہ کالج ورشیدیہ ہاسپٹل، ناگپور کا قیام عمل میں آیا۔ حکیم مرزا عبدالنور بیگ (لکھنؤ) اس کے پہلے پرنسپل تھے۔ ان کے بعد حکیم انوار قریشی، حکیم نذیر یوسفی، حکیم اسد اللہ جعفری پرنسپل ہوئے۔ یہاں کے اساتذہ میں حکیم علیم الرحمٰن،

حکیم قاری عبدالقدوس، حکیم شاہد عالم، حکیم ثاقب حسین (اس وقت سی سی آئی ایم کے ممبر ہیں)، حکیم شفیق ندوی، حکیم یحییٰ خاں، حکیم محمد اسماعیل وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

قیام کے وقت یہ کالج ناگ پور یونیورسٹی سے ملحق تھا، جب مہاراشٹر یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز، ناسک قائم ہوئی تو صوبہ کے دوسرے کالجوں کی طرح تاج طبیہ کالج کا بھی اس سے الحاق ہوا۔ سی سی آئی ایم کی طرف سے اس کالج کو پچاس طلبہ کے داخلہ کی اجازت تھی۔ مگر انفرااسٹرکچر کی کمی اور سی سی آئی ایم کے تقاضوں کو پورا نہ کر پانے کی وجہ سے اس کی منظوری منسوخ ہوگئی اور 2004 میں یہ کالج بند ہوگیا۔ یہ تقریباً چودہ برس جاری رہا۔ اس سے سیکڑوں طلبہ نے بی یو ایم ایس کی ڈگری حاصل کی۔ یہاں کے کئی فارغین طبی درسگاہوں میں تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں، کچھ صوبائی حکومت کے محکمۂ صحت میں ملازم ہیں۔ یہاں کے اکثر فارغین اچھے طبیب ہیں اور مطب و معالجہ کر رہے ہیں۔

جب کالج بند ہوا تو زیر تعلیم طلبہ کو صوبہ کے دوسرے طبی کالجوں میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کالج کے ایک طالب علم حکیم قاری عبدالقدوس جو یہاں استاذ بھی رہے ہیں، اس وقت اقرا یونانی میڈیکل کالج، جل گاؤں (مہاراشٹر) میں استاذ ہیں۔ راقم کو تاج طبیہ کالج کی بیشتر تفصیلات انھی سے حاصل ہوئی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ گرچہ کالج کے پاس مطلوب انفرااسٹرکچر نہیں تھا، مگر یہاں تعلیم و تدریس کا بڑا اچھا ماحول تھا اور طلبہ و اساتذہ کے اندر بڑی لگن تھی۔

یونانی طبیہ کالج اینڈ ہاسپٹل۔ ناندیڑ

اب یہ کالج داستان پارینہ کا حصہ ہے۔ اس کا قیام آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس مراٹھواڑہ زون غنیم پورہ، ناندیڑ کے ذریعہ عمل میں آیا تھا۔ برکت کامپلکس دیگلورناکہ ناندیڑ میں یونانی طبیہ کالج اینڈ ہاسپٹل کے نام سے قائم اس طبی درسگاہ میں 92-1991 میں پری طب کے لئے پہلے بیچ کا داخلہ ہوا تھا۔ اس وقت نجم خاں (ایم ایس سی) اس کے پرنسپل تھے۔ ان کے بعد بالترتیب حکیم اشفاق احمد اور حکیم نسیم الدین حسینی پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ دونوں نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد سے فارغ التحصیل تھے۔

بانیانِ کالج میں حکیم مصباح سلطانہ، حکیم خلیل الرحمٰن، عبدالمجیب (غالباً یہی کالج کے سکریٹری تھے)، عبدالروٗف درویش، ڈاکٹر عبدالرشید مرحوم (پی ایچ ڈی)، امیر خسرو، عبدالباری صدیقی (ایڈوکیٹ)، حکیم احمد عبدالباقی مرحوم کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

متعلقہ اداروں سے منظوری کے بغیر داخلہ اور تعلیم شروع کرنے کی وجہ سے پہلے بیچ کے طلبہ کا امتحان نہ ہوسکا۔ جب 93-1992 میں دوسرے بیچ کے طلبہ کا داخلہ ہوا تو پہلے بیچ والوں کو انہی کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔ ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد سے اس کالج کا عارضی الحاق ہوا۔ اسی یونیورسٹی کے ذریعہ اس کالج کے تین امتحانات منعقد ہوئے۔ سی سی آئی ایم کی عدم منظوری اور وسائل کی کمی جیسے مسائل سے یہ کالج دوچار تھا۔ جب ان حالات

سے اس کے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں پیدا ہوسکی تو حکومت مہاراشٹر نے 96-1995 میں اسے بند کر کے یہاں زیر تعلیم طلبہ کو ممبئ، پونہ اور مالیگاؤں کے طبی کالجوں میں منتقل کرنے کے احکام جاری کردیئے۔

حکیم جلیل احمد اس کالج کے دوسرے بیچ کے طالب علم ہیں۔ کالج بند ہونے کے بعد انھوں نے باقی تعلیم ممبئ سے پوری کی تھی۔ وہ اس وقت زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج پونہ میں شعبۂ کلیات میں ریڈر ہیں۔

حکیم احمد عبدالباقی مرحوم نے اس کالج کے لئے بڑی تگ و دو کی تھی۔ جب صوبائی حکومت نے کالج کو بند کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو انھوں نے اس کے جاری رکھنے کے لئے بڑے جتن کئے تھے۔ گرچہ وہ اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو پائے۔ لیکن کالج کے حوالہ سے ان کی مساعی بے حد قابل قدر ہیں۔

احمد غریب یونانی میڈیکل کالج۔ اکل کوا

مولانا غلام محمد وستانوی جدید فکر کے حامل روشن خیال عالم دین ہیں۔ تعلیمی میدان میں گراں قدر خدمات کی وجہ سے ان کی شخصیت قومی سطح پر متعارف ہے، انھوں نے مہاراشٹر کے دور افتادہ علاقہ اکل کوا میں دینی، تکنیکی اور طبی علوم کی جو شمع روشن کی ہے، اس سے مسلمانوں کی تعلیم کے تئیں ان کی فکرمندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ طبی تعلیم اور علاقہ کے صحتی مسائل کے حل کے لئے احمد غریب یونانی میڈیکل کالج اینڈ السلام ہاسپٹل ان کے اسی احساس کا ایک اظہار ہے۔ اس کا آغاز 'السلام شفاخانہ' سے ہوا تھا۔ قاری محمد صدیق باندوی کے ایما پر مولانا وستانوی نے شفاخانہ کے ساتھ طبی تعلیم کا منصوبہ بنایا، مگر اس راہ میں بہت سی تکنیکی دشواریاں حائل تھیں۔ خصوصاً مرکزی اور صوبائی حکومتوں سے منظوری کا معاملہ طبی کالج کے قیام کے سلسلہ کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ مگر مولانا کے اثر ورسوخ سے یہ کام بہت آسانی سے انجام پا گیا۔ عبدالرحمٰن انتولے (مرکزی وزیر صحت) کی وجہ سے سی سی آئی ایم نے رسمی معائنہ کے بعد 1996 میں کالج کے قیام کی اجازت دے دی۔ گورنر بنگال اے آر قدوائی کی معرفت مہاراشٹر کے گورنر اور وزیر صحت تک رسائی آسان ہوگئی۔ اس طرح صوبائی حکومت نے سال 99-1998 کے داخلہ اور تعلیم کی اجازت دے دی۔ ابتداً اس کا الحاق جل گاؤں یونیورسٹی سے تھا، پھر مہاراشٹر یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز، ناسک کے قیام کے بعد صوبہ کے دوسرے طبی کالجوں کی طرح احمد غریب یونانی میڈیکل کالج بھی اس سے ملحق

ہوا۔

اس کالج کے انتظامی امور مولانا وستانوی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ بہت اچھے تنظیمی تجربہ کے مالک ہیں۔ محض چند برسوں میں انھوں نے اس کالج کو ان تمام لوازمات سے آراستہ کردیا ہے، جو ضابطوں کے لحاظ سے مطلوب تھے۔ چونکہ یہ کالج جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم جیسی دینی درسگاہ کے زیرانتظام ہے، اس لئے جامعہ کی طرح یہاں بھی اسلامی ماحول ہے اور تعلیم کے ساتھ طلبہ کی اخلاقی تربیت کو اہمیت حاصل ہے۔

پروفیسر محمد نذیر یوسفی اس کالج کے پہلے پرنسپل تھے، وہ تقریباً چھ برس اس عہدہ پر فائز رہے۔ ان کے بعد پروفیسر شیخ محمد ارشد اور پروفیسر عبدالمنان نے پرنسپلی کے فرائض انجام دیئے۔ گزشتہ چار برسوں سے حکیم نفیس الرحمٰن تھانوی بطور پرنسپل خدمت انجام دے رہے ہیں۔ انہیں انتظامی معاملات کا کافی وسیع تجربہ ہے۔ وہ اس کالج کی وابستگی سے پہلے سہارن پور طبیہ کالج میں بانی پرنسپل کی حیثیت سے تقریباً گیارہ برس کام کرچکے ہیں، تھانوی صاحب انتظامی اہلیت کی طرح بہت اچھی علمی صلاحیت کے بھی مالک ہیں۔ "تذکرہ حضرت الحاج مولانا حکیم محمد عمر دیوبندی" ان کی علمی اور تحقیقی صلاحیتوں کا بہترین نمونہ ہے۔

یہ کالج ایک دورافتادہ علاقہ میں ہے۔ اس دشواری کی وجہ سے دور دراز کے اساتذہ یہاں زیادہ دنوں تک نہیں رک پاتے ہیں۔ انہیں بہتر سہولیات اور اچھے مشاہروں کے ذریعہ راغب کیا جاسکتا ہے۔ من حیث المجموع کالج میں درس وتدریس کا مناسب ماحول ہے۔ آئندہ کے پروگراموں میں ہسپتال کی توسیع کے علاوہ پوسٹ گریجویٹ تعلیم شروع کرنے کا منصوبہ ہے۔

اقرا یونانی میڈیکل کالج ہاسپٹل اینڈ ریسرچ سینٹر۔ جل گاؤں

جل گاؤں، مہاراشٹر کا معروف ضلع ہے۔ یہ ماضی میں مشرقی خاندیش کے نام سے موسوم تھا۔ اس کا قدیم نام فاروقی دور سلطنت (1382-1601) کی یاد دلاتا ہے۔ خاندیش ''خان'' سے ماخوذ ہے۔ فاروقی سلطنت کے دوسرے فرمانروا ملک ناصر کو گجرات کے حکمراں احمد اول (1411-1443) نے خان کا خطاب عطا کیا تھا۔ اسی نسبت سے یہ علاقہ خاندیش کہلایا۔

جل گاؤں کیلے کی کاشت کے لئے بھی مشہور ہے۔ اسی لئے اسے Banana City بھی کہتے ہیں۔ اس ضلع کو یہ افتخار حاصل ہے کہ بارہویں صدر جمہوریہ پرتبھا دیوی سنگھ پاٹل کو اس سے وطنی نسبت ہے۔

اقرا ایجوکیشنل سوسائٹی جل گاؤں ایک رجسٹرڈ تنظیم ہے۔ 28 مئی 1986 کو اس کی تاسیس ہوئی تھی۔[1] اس کے ذریعہ اب تک جل گاؤں شہر میں چودہ تعلیمی ادارے وجود میں آچکے ہیں۔ ان میں کے جی سے پی جی تک کی تعلیم کا انتظام ہے۔ عبدالکریم سالار اس تنظیم کے صدر اور روح رواں ہیں، وہ جل گاؤں میونسپل کارپوریشن کے ڈپٹی میئر بھی رہ چکے ہیں، اس وقت اسلامک ڈیولپمنٹ بینک کے علاقائی رکن ہیں۔ عبدالغفار ملک اقرا ایجوکیشنل سوسائٹی کے سکریٹری ہیں، اس کے ساتھ وہ نیشنل کانگریس پارٹی کے صوبائی سکریٹری بھی ہیں۔ اقرا یونانی میڈیکل کالج، ہاسپٹل اینڈ ریسرچ سنٹر کا قیام دراصل عبدالکریم سالار اور عبدالغفار ملک کی مساعی کا نتیجہ ہے۔

سوسائٹی کے ان ذمہ داروں کی کوشش سے 1999 میں حکومت مہاراشٹر نے انڈر گریجویٹ سطح کی تعلیم کے لئے اجازت عطا کی[2] 18 رجولائی 2000 کو سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن نے تعلیمی میقات 2000 اور 2001 کے لئے پچاس طلبہ کے داخلہ کی اجازت دے کر اس شہر میں طب کی تعلیم کے لئے راہ استوار کی۔[3] 19 رجنوری 2001 میں مہاراشٹر یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز، ناسک سے اس کا الحاق عمل میں آیا اور اسی سال سے یہاں تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔[4]

ابھی اس کالج کے قیام کو محض ڈیڑھ دہائی کا عرصہ بیتا ہے۔اس قلیل مدت میں اس نے اہم پیش رفت کی ہے۔انفرااسٹرکچر کے لحاظ سے اس کالج نے سی سی آئی ایم کے مجوزہ معیار کو کافی حد تک پورا کرلیا ہے۔کالج کا ہاسپٹل جدید سہولیات سے آراستہ ہے۔یہاں تمام کلینکی شعبوں میں آوٹ ڈور اور انڈور مریضوں کو طبی امداد فراہم کی جاتی ہے، کالج کے نباتی باغ (Herb Garden) میں 168 انواع کے تقریباً 400 پودے ہیں۔ ہرب گارڈن سے متصل یونانی فارمیسی ہے، جہاں ہاسپٹل میں استعمال ہونے والی دواؤں کو باقاعدگی سے تیار کیا جاتا ہے۔اس سے طلبہ کو یونانی دوا سازی سیکھنے کا اچھا موقع مل رہا ہے۔

حکیم تسخیر احمد فہمی اس کالج کے بانی پرنسپل تھے، اس کالج کی خوش بختی ہے کہ اسے ان کے جیسا انتظامی صلاحیتوں والا لائق پرنسپل ملا، جس نے اس کالج کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا۔ان کے طویل تدریسی اور انتظامی تجربات، اس کالج کو ایک معیاری درسگاہ بنانے میں بے حد کام آئے۔فہمی صاحب جامعہ طبیہ، دہلی سے فراغت کے بعد طبیہ کالج ممبئی، راجپوتانہ طبیہ کالج، جے پور، تکمیل الطب کالج، لکھنو، سیفیہ حمیدیہ طبیہ کالج، برہان پور اور زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج، پونہ میں درس و تدریس سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ان میں سے اکثر کالجوں میں وہ انتظامی عہدوں پر بھی فائز رہے ہیں۔ان کا شمار ایسے اساتذہ میں تھا جو واقعی یونانی طب کا شعور رکھتے تھے۔کلیات سے انہیں خاص شغف تھا، انھوں نے کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ وہ ایک اچھے شاعر اور نثر نگار تھے، وہ ایک عرصہ تک دہلی سے شائع ہونے والے علمی و ادبی رسالہ ''رہنماء تعلیم'' کے اعزازی مدیر رہے۔راقم کو پونہ کی تدریسی ملازمت کے زمانہ میں ان سے شرف نیاز حاصل رہا ہے۔

حکیم تسخیر احمد فہمی صاحب کے طویل انتظامی تجربات سے فائدہ اٹھا کر اقرا یونانی میڈیکل کالج نے نہایت قلیل مدت میں ایک مستحکم صورت اختیار کی۔ 2006 میں کالج سے فہمی صاحب کی سبکدوشی کے بعد حکیم خورشید احمد پرنسپل منتخب ہوئے۔

خورشید صاحب کے بزرگوں کا تعلق سیتا پور، لکھنؤ سے تھا۔ لیکن ان کی پیدائش اور نشوونما مالیگاؤں میں ہوئی۔ ممبئی طبیہ کالج سے 1985 میں فراغت کے بعد وہ چند ماہ یونانی میڈیکل کالج، پونہ میں رہے۔ 1998 سے 2003 تک وہ دوبارہ پونہ سے منسلک رہے۔ 1998 سے 2000 تک انھوں نے یہاں پرنسپل کے فرائض بھی انجام دیئے۔

حوالہ جات

1۔ رجسٹریشن سرٹیفیکٹ، اندراج نمبر مہاراشٹر/762/ جل گاؤں مجریہ 28/ مئی 1986

2۔ مہاراشٹر گورنمنٹ پرمیشن سرٹیفیکٹ نمبر یوایم سی 1175 / 572 / ای آر او/ 97ای ڈی یو۔2 مجریہ 26/ مئی 1999

3۔ سی سی آئی ایم پرمیشن سرٹیفیکٹ نمبر 11/80 / 2000 مجریہ 28/ جولائی 2000

4۔ الحاق نامہ MUHS/E.3355/130/2001 مجریہ 19/ جنوری 2001

یونس فضلانی یونانی میڈیکل کالج۔ اورنگ آباد

معروف عالم دین مولانا غلام محمد وستانوی نے جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا کا ایک کیمپس اورنگ آباد کے تعلقہ کنڑ، کنج کھیڑا میں قائم کر رکھا ہے۔ یہاں ان کی سرپرستی میں عمر بن خطاب ویلفیئر ٹرسٹ کے تحت لڑکوں کی دینی تعلیم کے لئے مدرسہ عمر بن خطاب، لڑکیوں کے لئے مدرسہ حفصہ بنت عمر، عصری و پیشہ وارانہ تعلیم کے لئے فارمیسی، بی ایڈ اور ڈی پی ایڈ کے کالج قائم ہیں۔ مولانا غلام محمد وستانوی کے بھتیجہ مولانا محمد فاروق وستانوی ٹرسٹ کے چیئرمین کی حیثیت سے ان اداروں کا نظم و نسق دیکھ رہے ہیں۔ اسی ٹرسٹ کے زیر اہتمام 2009 میں طبی تعلیم کے لئے یونس فضلانی یونانی میڈیکل کالج قائم ہوا۔ یہ مولانا وستانوی کے ممبئی کے ایک دوست قادر بھائی سپاری والا کے مرحوم بھتیجہ، یونس فضلانی کے نام منسوب ہے۔ اسے قادر بھائی نے اپنے بھتیجہ کی یادگار اور ایصال ثواب کے مقصد سے تعمیر کروایا ہے۔ عمر بن خطاب ویلفیئر ٹرسٹ کے تحت قائم اس کالج میں حکومت کی اجازت اور سی سی آئی ایم کی منظوری کے بعد 2009 سے داخلہ اور تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ صوبہ کی دوسری طبی درسگاہوں کی طرح یہ بھی مہاراشٹر یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز، ناسک سے ملحق ہے۔ حکیم سلیم احمد شاہ اس کالج کے پرنسپل ہیں، وہ زمانہ قیام ہی سے اس عہدہ پر فائز ہیں۔

مولانا وستانوی کی زیر سرپرستی چل رہے احمد غریب یونانی میڈیکل کالج اکل کوا کی طرح یہاں بھی انفرا اسٹرکچر کا معیار کافی بہتر ہے۔ گرچہ اسے قائم ہوئے ابھی چند برس ہی ہوئے

ہیں، لیکن اس قلیل عرصہ میں سازوسامان سے متعلق اکثر چیزوں کا بندوبست یہاں کرلیا گیا ہے۔ ابھی یہ اپنے وجود کے ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ امید ہے مستقبل میں یہ یونانی طب کا ایک اچھا ادارہ ثابت ہوگا۔ اس توقع کی وجہ یہ ہے کہ اسے مولانا غلام محمد وستانوی جیسے دانشور ماہر تعلیم کی سرپرستی حاصل ہے۔

طبیہ کلاسز لاہور/طبیہ کالج انجمن حمایت اسلام۔ لاہور

ہندوستان میں طبی درسگاہوں کے قیام کی باضابطہ تاریخ مدرسہ طبیہ دہلی سے شروع ہوتی ہے، جس کی بنیاد حکیم اجمل خاں کے برادر بزرگ حکیم عبدالمجید خاں نے ڈالی تھی۔ بایں ہمہ طبی تعلیم کی تنظیم نو کا سہرا خاندان شریفی کے سر باندھا جاتا ہے۔ بلاشبہ دلی کا شریفی خاندان اس کریڈٹ کا مستحق ہے، اس لئے کہ اس نے مدرسہ طبیہ، دہلی کی صورت میں طبی تعلیم شروع کر کے ایک ایسے سلسلہ کا آغاز کیا تھا، جس کے اثرات اُس زمانہ سے لے کر آج تک محسوس ہوتے ہیں۔ گویا مدرسہ طبیہ دہلی کی شکل میں یونانی طب کی تعلیم کی تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ یہی اس مدرسہ کا سب سے اہم امتیاز ہے۔ طبی تعلیم کے حوالہ سے ایک اور کوشش، جو تقریباً اسی زمانہ میں پنجاب میں کی گئی تھی۔ چونکہ یہ محدود پیمانہ پر تھی اور بڑی خاموشی سے ہوئی تھی، اس لئے اس کا چرچا خاطر خواہ انداز میں نہیں ہوا۔ 1870 میں پنجاب یونیورسٹی نے ایک پہل کرتے ہوئے گورنمنٹ میڈیکل اسکول کے ایک ذیلی شعبہ کے طور پر یونانی اور آیورویدک کلاسز کا آغاز کیا تھا۔[1]

ان کلاسز کو مستقل حیثیت عطا کرنے کے مقصد سے 1897 میں یونانی طب کی جماعت اسلامیہ کالج، لاہور اور ویدک جماعت ڈی اے وی کالج، لاہور کے سپرد کر دی گئی اور ان کے اخراجات کے لئے یونیورسٹی نے ایک گرانٹ مختص کر دی۔ انجمن حمایت اسلام لاہور، طبیہ کلاسز کی نگراں مقرر ہوئی اور اس کی سرپرستی میں پنجاب میں طب کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا۔[2]

طبیہ کلاسز اپنے نام سے بظاہر معمولی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کے ذریعہ ہندوستان کے ایک بڑے خطہ میں طب کی اشاعت کا جو کام انجام پایا ہے، وہ نہایت گراں قدر ہے۔ اس کے فارغین کو زبدۃ الحکماء کی سند دی جاتی تھی، یہاں کے فضلا اس نسبت کے استعمال کو فخر سمجھتے تھے۔ اس زمانہ میں سیکڑوں ایسے اطباء تھے جو اپنے ناموں کے ساتھ زبدۃ الحکماء کا لاحقہ لگاتے تھے۔ حالانکہ ان کی شخصیت اتنی بلند تھی کہ انہیں تعارف کے لئے ایسے کسی لاحقے کی ضرورت نہیں تھی۔ حکیم محمد کبیر الدین اور حکیم محمد حسن قرشی مدرسہ طبیہ دہلی سے فراغت کے بعد، طبیہ کلاسز سے مستفید ہوئے اور ہمیشہ اپنے ناموں کے ساتھ زبدۃ الحکماء لکھتے رہے۔

طبیہ کلاسز میں دو درجات تھے۔ حاذق الحکماء میں داخلہ کے وہ طلبہ اہل تھے جو انٹرنس پاس ہوں یا اردو میں اچھی دستگاہ رکھتے ہوں۔ زبدۃ الحکماء میں بی اے (عربی) منشی فاضل، مولوی فاضل یا عربی میں اچھی قابلیت رکھنے والے طلبہ داخلہ لے سکتے تھے۔ طبیہ کلاسز کے فارغین کے بارے میں وزیر تعلیم پنجاب نے لیجسلیٹو کونسل میں بیان دے کر یہ ہدایت جاری کی تھی کہ طبیہ کلاسز اسلامیہ کالج لاہور کو گورنمنٹ نے تسلیم کرلیا ہے۔ لہٰذا میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں اس کے فارغین کو بطور طبیب، ملازم رکھا جائے۔ 3

طبیہ کلاسز اسلامیہ کالج لاہور کو کالج کا درجہ حاصل ہونے پر حکیم نیر واسطی، ناظم جمعیت انصار طب، لاہور نے، اس ضمن میں گراں قدر کردار ادا کرنے والے اصحاب، حکیم محمد حسن قرشی (پرنسپل)، مولانا فضل الدین وائس پریسیڈنٹ انجمن حمایت اسلام اور خانصاحب شیخ عبدالعزیز کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا تھا ”خدا کا شکر ہے کہ طبیہ کلاسز اسلامیہ کالج لاہور کو طبیہ کالج بنانے کے متعلق جو مساعی عرصہ دراز سے جمعیت انصار طب اور مجلس مذاکرۂ طبیہ کر رہی تھیں، وہ بروئے کار آئیں اور بالآخر 27/جون 1926 کو انجمن حمایت اسلام کی کونسل نے یہ فیصلہ کر دیا کہ طبیہ کلاسز کو کالج بنایا جائے۔ سردست اکتوبر 1926 سے شفاخانہ جاری کر دیا جائے اور تعلیم دو گھنٹہ کے بجائے تین گھنٹہ کر دی جائے اور اسے 1927 سے ڈے کالج (Day College) بنا دیا جائے۔ 4

دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن حمایت اسلام نے طبیہ کالج کو 1939 میں

ڈے کالج بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔[5] اس لئے کہ محمد حسن قرشی نہیں چاہتے تھے کہ اس کی شبینہ کالج کی حیثیت ختم ہو، ان کے خیال سے اس صورت میں داخلہ کی تعداد کم ہوجانے کا خدشہ تھا۔[6]

1938 کے اعلان داخلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کالج کا کورس تین اور چار سال پر مشتمل تھا اور یہاں بیرونی طلبہ کے لئے ہوسٹل کا انتظام تھا۔[7]

1940 کے اعلان داخلہ میں کہا گیا تھا کہ کالج کا اسٹاف اطباء اور ڈاکٹر صاحبان پر مشتمل ہے، حکیم حاذق کی کلاس میں داخلہ کے لئے میٹرک کا سرٹیفکٹ رکھنے والے طلبہ داخلہ کے اہل ہیں، جن طلبہ کے پاس سرٹیفیکٹ نہیں ہوگا ان کا داخلہ امتحان لیا جائے گا۔ یہ اعلان نامہ شیخ اکرام الٰہی آنریری سکریٹری طبیہ کالج کمیٹی، لاہور کی طرف سے جاری ہوا تھا۔[8]

جب طبیہ کلاسز کو ترقی دے کر کالج کا درجہ دیا گیا تو انجمن حمایت اسلام نے کالج سے ملحق ایک شفاخانہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ منصوبہ کے مطابق خیراتی یونانی شفاخانہ، لاہور کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں ہفتہ اور منگل کے دن صبح 9 بجے سے 11 بجے تک حکیم محمد حسن قرشی (پرنسپل کالج) بیٹھتے تھے، جمعہ کو شفاخانہ بند رہتا تھا، بقیہ دنوں میں حکیم جلیل احمد انصاری (پروفیسر معالجات) بیٹھا کرتے تھے۔ غریب اور مفلس مریضوں کو شفاخانہ کی طرف سے دوائیں مفت دی جاتی تھیں۔[9] شفاخانہ کی ایک روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ فروری 1940 میں 1170 مریضوں کا مفت علاج کیا گیا تھا۔[10]

پنجاب کے تناظر میں اس کالج کی بڑی اہمیت تھی۔ اسی لئے یہ پنجاب کی طبی تحریک اور صحافت کی دلچسپیوں کا بے حد اہم موضوع تھا۔ اکثر اس کے مسائل کو لے کر پنجاب کی طبی برادری دست وگریباں رہتی تھی۔ رسالہ حامی الصحت اور حکیم نیر واسطی کی جماعت، حکیم محمد حسن قرشی اور اس کالج کے مویدین میں سے تھی تو رسالہ الحکیم اور پنجاب کی دوسری طبی جماعتیں قرشی اور کالج کے تئیں منفی رجحان رکھنے کے باعث طرح طرح کے پروپیگنڈے کرتی رہتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے طبی رسائل وجرائد میں اس کالج سے متعلق دو جداگانہ خیالات نظر آتے ہیں۔ اطباء کے اس اختلاف کی وجہ سے پنجاب میں طبی کاز کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس لئے مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے رسالہ حامی الصحت اور رسالہ الحکیم کے درمیان مصالحت بھی کروائی تھی۔ 1938 میں جب

ڈاکٹر سید دلاور حسین شاہ کالج کی منتظمہ کمیٹی کے آنریری سکریٹری منتخب ہوئے تو ان کے، حکیم محمد حسن قرشی پرنسپل کالج سے اختلافات اتنے بڑھ گئے کہ پنجاب کی طبی برادری موافقت اور مخالفت کے دو خیموں میں بٹ گئی۔ قرشی کا مطالبہ تھا کہ کالج کا سکریٹری کوئی طبیب ہونا چاہئے اور شاہ کا الزام تھا کہ قرشی کی وجہ سے کالج کی رفتار ترقی رکی ہوئی ہے۔ مخالفت اور موافقت کے ان واقعات سے پنجاب کے طبیبوں کی طبیہ کالج سے غیر معمولی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ پاکستان میں آج بھی یہ کالج یونانی طب کی اشاعت میں مصروف ہے۔ اس وقت اس کا شمار وہاں کی اہم طبی درسگاہوں میں ہے۔

حوالہ جات

1۔ الحکیم، جلد 23، شمارہ 8، جون 1938، ص 42

2۔ الطبیب، لاہور، جلد 5، شمارہ 11، نومبر 1938، ص 43

3۔ حامی الصحت، لاہور، جلد 5، شمارہ 8، جون 1926، ص 6

4۔ الطبیب، لاہور، جلد 5، شمارہ 10، اگست 1926، ص 8

5۔ الطبیب، لاہور، جلد 6، شمارہ 3، مارچ 1939، ص 40

6۔ الطبیب، لاہور، جلد 6، شمارہ 5، مئی 1939، ص 49

7۔ الطبیب، لاہور، جلد 5، شمارہ 6، جون 1938، ص 47

8۔ الطبیب، لاہور، جلد 7، شمارہ 9، ستمبر 1940، ص 40

9۔ رسالہ شمس الاطباء، لاہور، جلد 7، شمارہ 4، اپریل 1940، ص 41

10۔ الطبیب، لاہور، جلد 7، شمارہ 4، اپریل 1940، ص 40

طبیہ کالج حسین آگاہی۔ ملتان

یہ کالج 1916 میں قائم ہوا تھا۔ طبیہ کالج، لاہور سے اس کا باضابطہ الحاق تھا۔ یہاں کے فارغین کو حکیم حاذق اور زبدۃ الحکماء کی سند دی جاتی تھی۔ ان سند یافتگان کو ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں میں سرکاری طبیب کی حیثیت سے ملازمت کے حقوق حاصل تھے۔ یہاں دی جانے والی تعلیم میں اس بات کی کوشش ہوتی تھی کہ طب قدیم وجدید کے نظریات میں تطبیق کے امکانی پہلوؤں کو واضح کیا جائے۔ یہاں طلبہ کی عملی مشق کے لئے میوزیم، لیبوریٹری، دارالتکلیس، دارالعقاقیر، مرقاۃ العقاقیر اور دارالتعصیر کا نظم تھا۔ بیرونی طلبہ کے لئے درالاقامہ قائم تھا، جس میں طلبہ کے لئے قیام وطعام کی سہولت مہیا تھی۔ اس کالج میں سبھی مذاہب کے طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔1

کالج کے تحت علمی مباحثوں کے لئے بزم مذاکرہ قائم تھی۔ اپنے زمانہ میں خادم حسین اس بزم کے سکریٹری تھے۔ ایک روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ 1940 میں زبدۃ الحکماء حکیم عبدالحفیظ فارانی اس کالج کے وائس پرنسپل تھے۔2

حوالہ جات

1۔ مشیر الاطباء، لاہور، جلد 18، شمارہ 8، مئی 1940، ص 48

2۔ مشیر الاطباء، لاہور، جلد 18، شمارہ 11، اگست 1940، ص 32

رائل طبیہ کالج۔ملتان

رائل طبیہ کالج، ملتان 1922 میں قائم ہوا تھا۔ملتان کے ڈپٹی کمشنر اس کے سرپرست تھے۔طبیہ کالج لاہور سے اس کا الحاق تھا۔اسی کے نصاب کے مطابق یہاں تعلیم ہوتی تھی۔مڈل اور انٹرنس سرٹیفکیٹ داخلہ کی اہلیت تھی۔طبیہ کالج، لاہور کی طرح رائل طبیہ کالج۔ملتان کے فارغین کو حکیم حاذق اور زبدۃ الحکماء کی سند دی جاتی تھی۔اس کالج میں طلبہ کی رہائش کے لئے بورڈنگ کا بھی نظم تھا۔یہاں غریب اور مستحق طلبہ کی فیس معاف تھی یا انہیں خاص رعایت دی جاتی تھی۔طلبہ کی عملی تعلیم کے لئے شفاخانہ اور میوزیم کا انتظام تھا۔اس کے سند یافتگان کو میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے زیر انتظام چلنے والے شفاخانوں میں ملازمت کا اہل سمجھا جاتا تھا۔اس کالج کا 1936 کا داخلہ اشتہار راقم کی نظر سے گزرا ہے۔ [1]

حوالہ

1۔ الحکیم، جلد 21، شمارہ 7، مئی 1936، ص 40

ایسٹرن اینڈ ویسٹرن میڈیکل کالج۔ لاہور

یہ کالج 1926 میں لاہور میں قائم ہوا تھا۔ یہاں یونانی طب، ہومیو پیتھک اور بایو کیمک کی تعلیم کا انتظام تھا۔ زبدۃ الحکماء حکیم ڈاکٹر احمد علی خاں اس کالج کے مہتمم تھے۔ [1]

حوالہ

1۔ الحکیم، جلد 11، شمارہ 10، اگست 1926، ص 7

دارالعلوم طبیہ پنجاب۔ لاہور

دارالعلوم طبیہ پنجاب کا قیام انجمن طبیہ پنجاب کی کوششوں کا مرہون منت ہے۔ یہی انجمن دارالعلوم کے کاموں کی نگراں تھی۔ اس کا نظم ونسق ایک مجلس کے سپرد تھا جو ''مجلس دارالعلوم'' کے نام سے موسوم تھی۔ اس کے اختیارات اور فرائض کا تعین انجمن طبیہ، پنجاب کرتی تھی۔ [1]

1927 سے دارالعلوم طبیہ میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر ایم عبدالحمید ایم بی ایس لاہور اس کے پہلے پرنسپل تھے۔ یہاں عملی تعلیم کا خاص اہتمام تھا۔ خون، بلغم، بول و براز وغیرہ کے قدیم و جدید طریقۂ امتحان سے تشخیصِ امراض کا انتظام تھا۔ مفردات کی شناخت اور کاشت کی تعلیم کے لئے پروفیسر جی ایم ملک ایڈیٹر رسالہ ''زراعت'' مامور تھے۔ حفظان صحت، افعال الاعضاء اور جراحت کی تعلیم کے لئے ڈاکٹروں کا انتظام تھا۔ یہاں دنداں سازی کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ [2]

قیام کے وقت دارالعلوم میں مدت تعلیم تین برس تھی۔ شام پانچ سے آٹھ بجے تک تعلیم کے اوقات تھے۔ ذریعۂ تعلیم کے لحاظ سے یہاں دو درجات تھے لیکن آغاز کے وقت اردو ہی ذریعۂ تعلیم تھی۔ طبی مضامین کے علاوہ تشریح، منافع الاعضاء، طبی کیمسٹری، حفظِ صحت، سمیات، دواؤں کی شناخت اور طریق تیاری وغیرہ نصاب تعلیم کا حصہ تھے۔ اس زمانہ کے اکثر کالجوں کی طرح دارالعلوم کے امتحان میں بھی پرائیویٹ طلبہ کو شرکت کی اجازت تھی۔ [3]

1928 میں پہلے تعلیمی سال کے اختتام پر دارالعلوم کے منعقدامتحان میں حکیم فرید احمد

عباسی طبیہ کالج دہلی، حکیم ھادی رضا خاں سکریٹری منبع الطب طبیہ کالج لکھنؤ، حکیم ابوتراب محمد عبدالحق مہتمم ومدرس مدرسہ طبیہ امرتسر، حکیم حشمت اللہ پرنسپل بھوپندر طبیہ کالج پٹیالہ، ڈاکٹر سمپورن سنگھ پروفیسر بھوپندر طبیہ کالج پٹیالہ ممتحن تھے۔ 4

بانیان کالج کے پیش نظر تعلیم کے جامع مقاصد تھے۔ یہاں طلبہ کے لئے قدیم وجدید دونوں مضامین کی متوازی تعلیم کے انتظام سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ کی اصلاحی تحریک کے اثرات یہاں بہت گہرے تھے۔ اس درسگاہ میں معقول تعلیم کے ساتھ طلبہ کی صلاحیتوں کو پرکھنے کا بغایت اہتمام تھا۔

دارالعلوم طبیہ کے تعلیمی سفر کا آغاز احمدیہ مسلم ہائی اسکول سے ہوا تھا، جسے احمدیہ انجمن اشاعت اسلام نے دیا تھا۔ 5

یہاں فارغین کو نجم الاطباء اور سراج الاطباء کی سند دی جاتی تھی۔ 6

حوالہ جات

1۔ الحکیم، جلد 13، شمارہ 7، مئی 1928، ص 3-4

2۔ الحکیم، جلد 13، شمارہ 1، نومبر 1927، ص 5-6

3۔ الحکیم، جلد 13، شمارہ 7، مئی 1928، ص 3-4

4۔ الحکیم، جلد 13، شمارہ 10، اگست 1928، ص 3-4

5۔ الحکیم، جلد 12، شمارہ 9، جولائی 1927، ص 5

6۔ تذکرۂ حضرت الحاج مولانا حکیم محمد عمر دیوبندی، مؤلفہ حکیم نفیس الرحمان تھانوی، ہمدم پریس مالیگاؤں، 2008، ص 31

حبیبیہ طبیہ کالج۔ڈھاکہ

حبیبیہ طبیہ کالج کا قیام 1930 میں شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن کے ہاتھوں ہوا تھا۔ بنگلہ دیش میں یونانی طب کے فروغ میں شفاء الملک کا نہایت اہم کردار ہے۔انہیں بنگلہ دیش میں وہی مرتبہ حاصل تھا جو ہندوستان میں حکیم اجمل خاں کا تھا۔شفاء الملک حکیم حبیب الرحمان نے کانپور سے درسیات کی تکمیل کی۔ابتدائی صرف ونحو کے اسباق مولانا اشرف علی تھانوی سے اور اکثر درسیات محمد اسحاق ہردوانی سے پڑھی۔مولانا احمد حسن کانپوری اور مولانا عبدالوہاب بہاری سے معقولات کی تعلیم حاصل کی۔مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے حدیث کی تحصیل کی۔اس زمانہ میں یہ سارے علما کانپور کے مدرسہ میں استاذ تھے۔ان اساتذہ سے کسب فیض کے بعد مزید تعلیم کے لئے وہ آگرہ گئے۔وہاں عربی زبان وادب، اسلامیات اور علوم عقلیہ وغیرہ میں اعلیٰ واقفیت بہم پہنچائی۔ 1899 میں آگرہ میں حکیم آغا حسن سے طب کی کچھ کتابیں پڑھیں۔پھر اس فن کی باقاعدہ تعلیم مدرسہ طبیہ دہلی سے حاصل کی۔یہاں انہیں حکیم عبدالمجید خاں سے استفادہ کا موقع ملا۔ 1904 میں تعلیم مکمل کر کے وہ ڈھاکہ آئے اور مطب ومعالجہ کا سلسلہ شروع کیا، بہت جلد عظمت وشہرت کے مالک بن گئے۔وہ نواب بہادر سر سلیم اللہ آف ڈھاکہ کے طبیب خاص تھے۔اس کے علاوہ نواب صاحب کے سیاسی مشیر بھی تھے۔[1]

1922-23 میں بنگال حکومت نے کلکتہ اور ڈھاکہ میں یونانی طب کے سلسلہ میں کرنل

حسان سہروردی کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی۔ اس میں شفاء الملک حکیم حبیب الرحمان بطور ممبر شامل تھے۔ کمیٹی نے ڈھاکہ اور کلکتہ میں دو یونانی کالج قائم کرنے کی سفارش کی تھی۔ مگر حکومت نے ان سفارشات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ حکومت کی اس سرد مہری پر حکیم حبیب الرحمان نے ذاتی وسائل سے ڈھاکہ میں طبیہ کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور کرایہ کی ایک عمارت لے کر 1930 میں حبیبیہ طبیہ کالج کی بنیاد ڈالی۔ [2] شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن، حبیبیہ طبیہ کالج ڈھاکہ کے بانی پرنسپل اور مہتمم تھے۔ اس کالج کی وجہ سے بنگال میں 1939 میں یونانی فیکلٹی بنائی گئی۔ اس کالج کے قیام سے مشرقی ہندوستان میں یونانی طب کو نئی زندگی ملی۔ [3] حبیبیہ طبیہ کالج میں یونانی طب کے ساتھ جدید مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔ طبی مضامین عربی میں اور فنون جدیدہ، اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ یہاں کے اساتذہ میں حکیم اور ڈاکٹر دونوں تھے۔ [4] یہاں کے نصاب پر طبیہ کالج، دہلی کے اثرات غالب نظر آتے ہیں۔ شفاء الملک خود بھی یہاں کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ اس لئے ان کے قائم کردہ ادارہ میں یہاں کے اثرات کا ہونا فطری ہے۔

1990 تک اس کالج میں صرف ڈپلومہ سطح کی تعلیم ہوتی رہی۔ مقامی اطباء کی کوششوں کے باوجود ڈگری کورس شروع نہیں ہو پا رہا تھا۔ جب حکیم عبدالرزاق (سابق ڈائرکٹر، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی) بنگلہ دیش میں WHO کے آنریری کنسلٹنٹ مقرر ہوئے تو انھوں نے اس سلسلہ میں وزیر صحت، بنگلہ دیش کے سکریٹری سے بات کی اور اس اہم ضرورت کی طرف توجہ دلائی۔ ان کی کوشش کا خاطر خواہ اثر ہوا اور 1981 میں بنگلہ دیش حکومت نے Development of Ayurveda and Unani Medicine کا بل پاس کر کے گریجویشن سطح کی تعلیم کا مسئلہ حل کیا اور 1990 سے اس کالج میں یونانی میڈیسن کے ڈگری کورس میں داخلے شروع ہوئے۔ [5]

مشرقی ہندوستان اور موجودہ بنگلہ دیش میں یونانی طب کے احیاء کے حوالہ سے اس کالج کی مساعی نہایت قابل قدر ہیں۔ آج بھی یہ کالج بنگلہ دیش میں یونانی طب کی اشاعت میں مصروف ہے اور اس کا شمار وہاں کے اہم طبی اداروں میں ہے۔

حوالہ جات

1۔ یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد، مؤلفہ حکیم فخر عالم، زیر اشاعت

2۔ ہندوستان کے مشہور اطباء، مرتبہ حکیم حافظ سید حبیب الرحمٰن، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، اشاعت 1988، ص176

3۔ آئینہ تاریخ طب، مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، اشاعت 2001، ص390

4۔ الطبیب، لاہور، جلد8، شمارہ 11، دسمبر 1941، ص42

5۔ مجاہد طب۔ حکیم محمد عبدالرزاق، مرتبین ام الفضل اور سید غلام مہدی، مطبوعہ ریکمو پریس، دہلی، 2010، ص73-72

درسگاہ تعلیم الطب۔ لاہور

پنجاب میں طبی تعلیم کی اشاعت کے حوالہ سے جن اداروں کا ذکر ملتا ہے، ان میں ایک نام درسگاہ تعلیم الطب بھی ہے۔ ستمبر 1937 میں حکیم مولوی عزیز الاسلام صدیقی نے اس کی بنیاد ڈالی تھی، وہی اس کے مہتمم تھے۔ یہاں عربی اور اردو زبان میں طب کی تعلیم ہوتی تھی۔ مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر سبھی کے لئے اس کے دروازے کھلے تھے۔ اس زمانہ میں جب کہ تعلیمی ادارے معاش کا منفعت بخش ذریعہ بن گئے تھے، یہاں طلبہ سے کوئی فیس لئے بغیر مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ اس درسگاہ کا ایک بڑا امتیاز تھا۔[1]

حوالہ

1۔ الطبیب، لاہور، جلد 5، شمارہ 7، جولائی 1938، ص 44

سندھ ویدک اینڈ یونانی طبی کالج۔ سندھ

یہ کالج 2/جنوری 1938 کو ٹنڈہ محمد خاں، سندھ میں قائم ہوا تھا۔ سید غلام مرتضی شاہ اس کالج کے آنریری سکریٹری تھے۔ اس کے افتتاحی جلسہ میں سندھ کے مشہور حکماء اور اراکین کالج کے علاوہ معزز زمینداروں نے بھی شرکت کی تھی۔ [1]

حوالہ

1۔ الحکیم، جلد 23، شمارہ 4، فروری 1938، ص 42

یونانی طبیہ کالج ۔ سیالکوٹ

اس کالج کے بانی اور مہتمم حکیم ڈاکٹر سید محمد اکبر علی صادق زیدی تھے۔ ان کا سلسلہ نسب سلطان الاولیاء سید محمد گیسو دراز گلبرگہ شریف، حیدر آباد دکن سے ملتا ہے۔ ان کے بزرگ عہد مغلیہ میں حیدر آباد دکن سے موضع الہڑ ضلع سیالکوٹ پنجاب آئے تھے۔ انھوں نے طب کی تعلیم طبیہ کالج دہلی سے حاصل کی تھی۔ ان کے بڑے بھائی حکیم سید محمد مظفر علی رسالہ معین الصحت کے مدیر تھے۔ ان کا شمار دلی کے ممتاز طبیبوں میں تھا۔[1]

یونانی طبیہ کالج سیالکوٹ کا ایک اشتہار راقم کی نظر سے گزرا۔ اس میں تحریر ہے کہ "اس وقت یونانی طبیہ کالج سیالکوٹ میں داخلہ جاری ہے۔ اس درسگاہ کی زمام نظامت استاذ الاطباء ڈاکٹر سید محمد اکبر علی صادق زیدی ایکس پرنسپل چھاچھی طبیہ کالج متعلقہ بھوپندر کالج پٹیالہ وسابق ایڈیٹر رسالہ شمس الاطباء جیسی تجربہ کار شخصیت کے ہاتھ میں ہے۔ تعلیمی اسٹاف فاضل اور مستند اطباء پر مشتمل ہے۔ عملی تعلیم کے لئے شفاخانہ بھی قائم ہے"۔[2]

یہ اشتہار جون 1938 میں شائع ہوا تھا۔

حوالہ جات

1۔ رموز حکمت، مرتبہ حکیم محمد عبدالرحیم جمیل، اقبال اسٹیم پریس، گجرات، 1937، ص 41

2۔ الطبیب، لاہور، جلد 5، شمارہ 6، جون 1938، ص 47

شعبۂ طب، اسلامیہ کالج۔ پشاور

ہندوستان کے مختلف حصوں میں کسی نہ کسی صورت میں طبی تعلیم کا سلسلہ رائج تھا، لیکن بدقسمتی سے صوبۂ سرحد میں اب تک کوئی انتظام نہیں تھا۔ 1939 میں سرحد کی حکومت نے اسلامیہ کالج، پشاور میں طبی شعبہ کے قیام کی اسکیم منظور کی۔ حکومت کی دعوت پر علامہ سید سلیمان ندوی (ناظم دارالمصنفین۔اعظم گڑھ) اور حکیم خواجہ رضوان احمد نے پشاور جا کر طبی تعلیم کی مجوزہ اسکیم کا خاکہ مرتب کیا۔ اس موقع پر سر اکبر حیدری صدر اعظم سرکار نظام کے ہاتھوں عثمانیہ بورڈنگ ہاؤس کا افتتاح عمل میں آیا تھا۔ اس کی تعمیر کے لئے نظام سرکار نے ڈیڑھ لاکھ کا عطیہ دیا تھا۔ سید سلیمان ندوی، معارف مئی 1940 کے شذرات میں اس سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں، اسلامیہ کالج، پشاور شہر سے چار میل کے فاصلہ پر واقعہ تھا۔ تجویز ہوئی کہ کالج کی ماتحتی میں ایک ایسا شعبہ کھولا جائے جس میں پڑھے لکھے نوجوانوں کو مختصر عربی، دینیات اور طب کی تعلیم دی جائے، جو گاؤں میں پھیل کر علاج و معالجہ کے ذریعہ کسب معاش کریں اور مسلمانوں کی مذہبی خدمت کریں۔ 1، 2

حوالہ جات

1۔ الطبیب، لاہور، جلد 7، شمارہ 9، ستمبر 1940، ص 48

2۔ شذرات سلیمانی، حصہ سوم از سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، 1998، ص 235-234

ویدک اینڈ یونانی طبی کالج۔ٹنڈہ محمد خاں، سندھ

آیورویدک اور یونانی طب کی تعلیم کے لئے ٹنڈہ محمد خاں، سندھ میں حکیم سید غلام مرتضٰی شاہ نے ایک طبی درسگاہ قائم کی تھی۔ وہی اس کے آنرری سکریٹری تھے۔ 1

حکیم سید غلام مرتضٰی شاہ کا خاندانی سلسلہ مغلیہ عہد کے مشہور طبیب ابوالفتح گیلانی سے ملتا ہے۔ شاہ صاحب رجب 1319 / 1901 میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے طبیہ کالج، دہلی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ فراغت کے بعد اپنے وطن ٹنڈہ محمد خاں، سندھ آ کر دواخانہ کرمانی کے نام سے مطب جاری کیا تھا۔ 2

حوالہ جات

1۔ الطبیب، لاہور، جلد 7، شمارہ 1، 2، جنوری۔فروری 1940، ص 142

2۔ رموز حکمت مولفہ حکیم محمد عبدالرحیم جمیل، اقبال اسٹیم پریس گجرات، 1937، ص 555

گورنمنٹ طبی کالج۔ سلہٹ

گورنمنٹ طبی کالج سلہٹ کا قیام انجمن اطباء بنگال و آسام کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ شفاء الملک حکیم حبیب الرحمان اس انجمن کے بانی صدر اور حکیم خورشید الاسلام جنرل سکریٹری تھے۔ انجمن کے مطالبہ پر سر سعد اللہ کی وزارت کے زمانہ میں 1945 میں یہ طبی کالج قائم ہوا۔ حکیم بشیر الحق چودھری اس کے پہلے پرنسپل تھے۔ انھوں نے 27/اکتوبر 1945 سے 2/اکتوبر 1947 تک عبوری پرنسپل کے بطور فرائض انجام دیئے۔ [1]

3/اکتوبر 1947 کو حکیم خواجہ رضوان احمد نے مستقل پرنسپل کی حیثیت سے چارج سنبھالا اور تقریباً 20 برس پرنسپل رہ کر 30/جولائی 1967 کو سبکدوش ہوئے۔ ان کے بعد 31/جولائی 1967 سے 28/اکتوبر 1978 تک حکیم بشیر الحق چودھری پرنسپل رہے۔ 29/اکتوبر 1978 کو حکیم ابو طیب کو عبوری طور پر پرنسپل شپ کا چارج عطا ہوا۔ 1996 میں جب حکیم سید ظل الرحمان صاحب ادارۂ عالمی صحت کے مشیر کی حیثیت سے بنگلہ دیش گئے تھے، اس وقت بھی حکیم ابو طیب عبوری حیثیت میں ہی پرنسپل تھے۔ اس سے کالج کے حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے حکیم صاحب سفرنامۂ بنگلہ دیش میں لکھتے ہیں ''50 برس گزرنے کے باوجود یہ کالج اسی ابتدائی منزل پر کھڑا ہوا ہے اور اس نے ترقی کی کوئی راہ طے نہیں کی ہے۔ دہلی طبیہ کالج کے طرز پر اس میں چار سالہ نصاب جاری کیا گیا تھا، وہی چار سالہ نصاب آج تک جاری

ہے اور اسے ڈگری کالج کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا ہے۔"[2]

یہ کالج آج بھی بنگلہ دیش میں قائم ہے، باوجودیکہ اس کے حالات بہت اچھے نہیں ہیں پھر بھی اس کے، اس کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ معمولی ذریعہ کے طور پر ہی سہی یہ تقریباً سات دہائیوں سے بنگلہ دیش میں طب کی تعلیم کا وسیلہ بنا ہوا ہے۔

حوالہ جات

1۔ آئینہ تاریخ طب، مؤلفہ حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، 2001ص 391

2۔ سفرنامۂ بنگلہ دیش، حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی علی گڑھ، 2006ص 113، 114، 116

Hindostān Kī Tibbī Darsgāhayn

By

Hakīm Fakhre Alam

ISBN: 978-93-83549-70-2

2016 : 600 Copies

Price: Rs. 350/=

Under the Aegis:
All India Unani Tibbi Conference
Hamdard Manzil, Lal Kuan, Delhi-110006

Publisher:
Educational Book House
Muslim University Market, Aligarh-202001

Printed at:
Muslim Educational Press
Bani Israilan, Aligarh-202001

Address of Author:

Hakīm Fakhre Alam

D-II Floor, Samreen Apartment
Shah Basheer Clony, Hadi Nagar
Doharra, Aligarh-202002 (U.P.)
Mobile No. 09411653041/08744025981
E-Mail: fakhrealamx7598@gmail.com

Hindostān

Kī

Tibbī Darsgāhayn

Hakīm Fakhre Alam

All India Unani Tibbi Conference
Hamdard Manzil, Lal Kuan, Delhi-110006
2017

Hindostān Kī Tibbī Darsgāhayn

Hakīm Fakhre Alam

ISBN 978-93-83549-70-2

9 789383 549702 >

All India Unani Tibbi Conference
Hamdard Manzil, Lal Kuan, Delhi-110006
2017